سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) نمبر ۲۳۳

سراج الدولہ

ایسا چراغ تھا جو کبھی گُل نہ ہو سکا

(مومن)

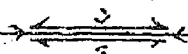
از جناب محمد عمر صاحب مرحوم (نور الٰہی)

شائع کردہ
انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی
قیمت
۱۹۴۲ء



مرحوم صاحبزادہ محمد عمر مولف کتاب ہذا

فہرستِ مضامین



اس کتاب کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابیں زیر نظر رہیں۔ جا بجا
صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جہاں نہیں دیا گیا وہاں سیر اور موزنم وار ہے۔

1- LORD CLIVE BY MALLESAN

2- MACAULLEY'S ESSAYS ON CLIVE

3- RISE OF CHRISTIAN POWER IN INDIA BY DR. BASU

4- FULLFILMENT OF BRITISH RULE IN -INDIA BY GARRET

5- THE TRIBUNE LAHORE DATED 19 TH SEPTEMBER 1929

6- HISTORY OF INDIA BY MARSHMAN

7- THE EMPIRE OF NAWABS BY HUTCHINSON

8- ECHOES FROM OLD CALCUTTA BY BUSTEND

9- BEGUMS OF BENGAL BY CHATTERJEE

10- EARLY RECORDS OF BRITISH INDIA BY WHELER

11- BENGAL PAST AND PRESENT BY LITTLE

12- OLD FORT WILLIAM IN BENGAL BY WILLS

13- MUSNAD OF MURSHIDABAD BY MAZUMDAR

14- HAMILTAN'S NATESAN INDIA

15- CAMBRIDGE HISTORY OF INDIA V. 5

16- COURI'S ADDRESS TO THE STUDENTS OF GLAS-GOW UNIVERSITY

17- THE OTHER SIDE OF THE MEDAL BY THOMPSON

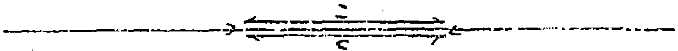
18- SEPOYS WAR BY KARR

19 سیرالمتاخرین فارسی و ترجمہ انگریزی مع حواشی مترجم لوٹاماتس۔

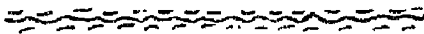
تاریخ جدولیہ مصنفہ خادم علی ۱۸۳۰ء ۔

20 حدیقۃ الاقالیم مصنفہ مرتضیٰ حسین ۔

21 خلاصۃ التواریخ مصنفہ کلیان سنگھ



تصویرات



باسم

فدائے وطن

جتندر ناتھ داس مرحوم

جن کا

"نہ مجھے نیاز حاصل ہوا، نہ میں کبھی ان کے دیدار سے مشرف ہوا۔"

چراغ لحد کیا سمجھ کر بجھایا!

نہ سمجھے کہ یہ نام روشن کسی کا

(نقوی)

PENANCE FOR OUR FOREFATHERS TREACHERY

CALCUTTA 16TH SEPTEMSER

THE FOLLOWING MESSAGE OF MR. BANKIM BEHARI DAS WAS READ AT THE CREMATION GROUND WHEN THE EARTHLY REMAINS OF JATINDAR NATH DAS WERE BEING PLACED ON THE PYRE :-

"AS A PENANCE FOR THE TREACHEY OF WHICH OUR FOREFATHERS BOTH HINDUS AND MULIMS WERE GUILTY WHEN THEY CHEATED NAWAB SIRAJUDDAULAH WHOSE SALT THEY HAD EATEN AND HANDED OVER BENGAL, NAY THE WHOLE OF INDIA TO THE FOREIGNERS I SUBMIT MY DEARLY BELOVED SON AT YOUR FEET. MAY INDIA WAKE UP AS A RESULT OF HIS SACRED SELF IMMOLATION FREE PRESS.

THE TRIBUNE LAHORE, DATED 19TH SEPTEMBER, 1929

سراج الدولہ

تمہید

فنِ تاریخ

ہندستان کی گو ہزاروں تاریخیں مختلف زبانوں میں لکھی گئیں لیکن یہ مسلمہ ہے کہ وہ کتاب ہنوز جلوہ گر نہیں ہوئی جسے ہندستان کی معتبر تاریخ کہہ سکیں جو کچھ اس میں تحریر ہے اس کی صحت پر ایمان لازم آ سکے اور یہ کہنے کی ذرا بھی گنجائش نہ ہو کہ مصنف نے اس میں "ملا بھی لیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لیے" سے کام نہیں لیا۔ جو کتاب میدانِ ادب میں آتی ہے، اس کا ادعا یہی ہوتا ہے کہ اس کی تدوین میں تحقیق کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا لیکن بالاستیعاب نظر ڈالیں تو اکثر مصنف کی ساری دیانت داری طشت از بام ہو جاتی ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ یا تو مصنف کا سرمایۂ معلومات محدود ہے اور یا اس نے جان بوجھ کر رائی کا پہاڑ یا پہاڑ کی رائی بنا دی ہے۔ مغربی مورخ کیا پرانے کیا نئے نہایت وثوق سے شاہ جہاں کو اکبر کا باپ۔ اور جہانگیر کو تیمور کا برادر زادہ لکھنے سے دریغ نہیں کرتے۔ گڑے مُردوں کو چھوڑیے۔ کرنل مالسن کو لیجیے جو سراج الدولہ کو نواب علی وردی خاں کا بیٹا بتاتے ہیں[1] اور لارڈ میکالے جیسے فاضل اجل

[1] LORD CLIVE BY MALLESON P. 78

کی ستم ظریفی پر نظر ڈالیے۔ جو لفظ سراج الدولہ کو خطاب کی بجائے نام سمجھتے ہیں۔ اور "علی نگر" کا ترجمہ (FORT OF GOD) یعنی اللہ کا قلعہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہندستان کے متعلق اہلِ انگلستان کی معلومات کا یہ عالم ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ بکسر کی جنگ میں کون فتح یاب ہوا۔ پٹنہ میں قتلِ عام کس نے کیا، "ہلکر ہندو تھا یا مسلمان"[۱]۔ نگران باتوں کو سہو و خطا کہ کر ٹال بھی دیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن وہ جسارت ناقابلِ برداشت ہے۔ جب کوئی ادیب انشا پردازی کی رَو میں دیانتِ مورخانہ کو جذبۂ حبِ وطن، مصالحِ ملکی، یا ذاتی مفاد پر قربان کر دیتا ہے اور اس بددیانتی کو دروغ مصلحت آمیز تصور کرکے جائز بنالیتا ہے۔ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بناکر دکھانا اپنے و فن کا کمال خیال کرتا ہے۔ واقعات کو اپنی اغراض کے سانچے میں ڈھال کر کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ بعض ایسے بھی ہیں کہ جو سنتے ہیں اسے سچ سمجھ کر اور دروغ برگردنِ راوی کی پناہ لے کر درج کر دیتے ہیں اور اس طرح بازاری گپ تاریخ کی منزلت اختیار کرلیتی ہے۔ بسا اوقات مصنف کو مذہب کی پاس داری مجبور کرتی ہے کہ وہ بے سروپا باتوں کو قلم کے زور سے قابلِ اعتبار بنائے۔ اس لیے کسی تاریخ کے مطالعے سے قبل مورخ کے رجحان کا جائزہ لینا لازم ہے۔

زمانے کی رفتار کے ساتھ مورخ کے قلم کی روش بھی بدل جاتی ضرور ہے۔ پرانا طرزِ بیان فرسودہ ہوگیا۔ اب اسلوبِ نو کی مانگ ہے۔ شاہی شان و شوکت سرمایہ داری کی ذیل میں آکر بے مایہ ہو جاتی ہے۔

---

[۱] MACAULLEY.S ESSAYS ON CHINE P.45.

اور گوش شنوا صرف انسان کی داستانِ حیات سُننا چاہتا ہے۔ آج کل کی آنکھیں وہ بادشاہ نہیں دیکھنا چاہتیں۔ جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی یا جسے تپش میں خوفِ خدا نہ رہا۔ اسی طرح ناقدانِ تاریخ کی نگاہ میں انشا پردازی اور لفظی شکوہ کی کوئی وقعت نہیں۔ وہ محض اس بات کے شائق ہیں کہ مورّخ انھیں سادے اور غیر مبہم الفاظ میں یہ بتانے کی قدرت رکھتا ہو کہ وہ کیا بتانا چاہتا ہے اور جو وہ کہتا ہے اُس کی صداقت کی کیا سند ہے۔

کسی دورِ زندگی کی لاکھوں تاریخیں لکھی گئی ہوں مگر ہر نیا دورِ حیات نئی تاریخ چاہتا ہے۔ جو کسی عہد کے واقعات کو جدید زاویۂ نگاہ سے دکھائے۔ کیوں کہ ارتقائے تہذیب کی ہر منزل پر زاویے بدلتے ہیں۔ جو کل مستحسن تھا آج ناواجب ہے اور جو آج قابلِ فخر ہے وہ کل باعثِ تذلیل ہو سکتا ہے۔ اس لیے جدید رجحانات کی ترجمانی مقتضی ہے کہ تاریخ نویسی کا سلسلہ جاری رہے اور اس کے ساتھ ہی تاریخ جدید انکشافات سے بہرہ ور ہو۔ کسی عہد کی صرف پُرانی تاریخوں پر قناعت کرنا تکمیلِ معلومات کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ تجزیۂ تاریخ کے بارے میں چند نقادوں کے نظریے ملاحظہ ہوں [۵۱] لازم ہے کہ وقتاً فوقتاً تاریخ از سرِ نو لکھی جائے۔ صرف اس لیے نہیں کہ جدید انکشافات سے واقعاتِ متذکرہ میں ترمیم و تنسیخ کریں۔ بلکہ اس سے یہ مدعا ہے کہ جدید طرز سے واقعات کے پُرانے نظریات کا موازنہ

---

[۵۱] REFFERRED IN THE RISE CHRISTIAN POWER IN INDIA PAGES , TO 29.

ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانے کی ترقی ایسے زاویے پیدا کر دیتی
ہے جن سے ماضی کا جائزہ بالکل نئے انداز میں ہو سکتا ہے (گوئٹے)"
(GOETHE)

"اس وقت تک تاریخ اور سیاست میں بداخلاقی کا شعبدہ رہا ہے۔ اس کا بس یہی کام ہے کہ معزز واعظ غارت گری اور خوں ریزی کی مدح سرائی کریں۔ وقت کے شہنشاہ کو اطاعت کی شکستگی سکھاتے ہیں۔ جن افعال کا ارتکاب عوام میں ہو تو پھانسی اور وہی افعال دربار میں اگر واقع ہوں تو موجب شان و شوکت خیال کیے جاتے ہیں۔" ایم ہروے
(M. HERVE)۔

"تاریخ صرف ایسا علم نہیں جو تجربے سے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ اس مقصد کے حصول کی سعی ہے کہ واقعات کے تفصیلات کے انبار کو ایک خوب صورت تصویر کی طرح سجا کر پیش کرے۔ اصطلاحات اور تعریفات کے بھرمار تاثرات کو زائل کرتی ہے۔" مرز (MERZ)۔

"میں نے یہ سنا ہے کہ ریاضی میں اعداد و شمار پر، حکمت میں تجربے پر، قانون اور مذہب میں احکام مصدرہ پر اور تاریخ میں شہادت پر بھروسہ کرنا چاہیے۔" لیبنز (LEIBNIZ)۔

"بے بنیاد باتوں کو تاریخ میں اس لیے جگہ مل جاتی ہے کہ مورخ کسی کا زیر بار احسان ہوتا ہے اور اسے خوش کرنے کے لیے شکریہ کے طور پر جھوٹ بول جاتا ہے یا اس سے اسے کسی ذاتی فائدے کی امید ہوتی ہے یا اپنی فطرت اور طبیعت سے مجبور ہوتا ہے یا لاعلمی کے باعث سہو ہو جاتا ہے۔" البیرونی۔

"ماضی کی تاریخ اس زمانے کی سیاسیات کی آئینہ بردار ہے کہ

آج کل کی تاریخ محض سیاسیاتِ حاضرہ کی تخلیق ہے۔" فری مین۔

(FREEMAN)

"گزشتہ بیس سال میں جو معاندانہ جذبات دُنیا میں اُبھرے ہیں۔ اُنھوں نے تاریخی صداقت کو سامراجی مصلحت اندیشی پر قربان کر دیا ہے۔[1] ماحصل یہ ہے کہ ہر ایک کتاب جس میں تاریخی واقعات درج ہوں، صرف تاریخ کہلانے کے باعث قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ جب تک کہ تذکرے کی تائید ناقابلِ تردید شہادت یا دلیل سے نہ ہوتی ہو۔ اور ناظرین پر واضح کرنا ہوگا کہ کسی کی مدح و قدح کی عِلّتِ غائی کیا ہے۔ صرف کسی کے کہنے سے زید بدمعاش اور بکر صالح تسلیم نہ ہوگا۔ مورّخ کو بتانا پڑے گا کہ زید نے کیا بدمعاشی کی اور بکر نے کیا کارِ ثواب کیا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ روایت کی صحت کا یقین دلانا ہوگا۔ ممکن نہیں کہ اس معیار کے مطابق آپ کو مغرب کی کسی زبان میں ہندستان کی کوئی تاریخ ملے جس پر آپ بلا رد و کد اعتبار کر سکیں۔ پراچین زمانے کو جانے دیجیے۔ آپ کو متوسط زمانہ یا عہدِ حاضر کی کوئی تاریخ نہ ملے گی جو کسی خاص غرض کے پیشِ نظر نہ لکھی گئی ہو۔ برطانیہ کے عِلم پرور بلکہ علم بخش مُلک میں اور ہندستان میں ایک بھی ایسا شخص پیدا نہ ہُوا جو ہندستان کی معیاری تاریخ لکھتا۔ بے شک انگلستان میں بڑے پائے کے مورّخ پیدا ہوئے۔ مگر انھوں نے بھی

---

[1] RISE FULFILMENT OF BRITISH RULE IN INDIA BY THOMPSON GARNET, P. 104, EDITIN 1935.

آزاد فضا میں بیٹھ کر بے لاگ تاریخ ہند مرتب نہ کی۔ سچ تو یہ ہے ان حضرات سے یہ توقع ہی فضول ہے۔ بھلا وہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ ہندستان میں ان سے کوئی بہتر حکمراں ہوا تھا۔ انھوں نے جو لکھا اپنے وطن کی مصلحت کو مدِنظر رکھ کر لکھا۔ اور جس ہندستانی نے کوئی تاریخ لکھی تو ہمیشہ اپنا منھ گورنمنٹ ہاؤس کی طرف رکھا۔ ان بے چاروں کو یہ معلوم نہ تھا کہ انگریز اتنے نخفے نادان نہیں جو ان کی چاپ لوسی کا شکار ہو جائیں گے۔ اس لیے ایک دو کو چھوڑ کر نہ کسی کو خطاب ملا نہ جاگیر عطا ہوئی۔ بہ ظاہر وہ ایسی تصنیفات پر اظہارِ خوش نودی کرتے ہیں۔ مگر باطن میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ جو آج چند پیسوں کے لیے اپنے بزرگوں کی ہڈیاں فروخت کرتے ہیں۔ کل کسی اور نے ان کی مٹھی گرم کر دی تو ہمیں بھی صلواتیں سنائیں گے۔ ایسے ابن الوقت مصنفوں کے نام وہ اس فہرست میں درج کر لیتے ہیں جن کی بسم اللہ میر جعفر سے ہوتی ہے۔ سرفروشی کی تمنا کے لیے سر درکار ہے۔ تاریخ نویسی دل گردہ مانگتی ہے۔ واقعات پر جو نقاب ڈالے گئے ہیں انھیں چاک کر کے حقیقت کو منصۂ شہود پر لانا اور نتائج سے بے پروا ہو جانا جو یہ نہیں کر سکتے انھیں کیا حکیم نے بتایا ہے کہ تاریخ ضرور لکھیں۔ گو اس تحریر کی بہ دولت ان کا نامۂ اعمال سیاہ ہو جائے۔ جب ادبا کے لیے ادبیات کے دیگر ابواب کھلے ہیں تو وہ ان میں طبع آزمائی کر سکتے ہیں۔ یہ مسلّمہ ہے کہ اہلِ مغرب کی نگاہ میں سیاسیات اور تاریخ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ انگلستان کے نامور عالم سر جے۔ اے۔ سیلے (PROF: SIR J.A.SELLY) فرماتے ہیں :—

"سیاسیات اور تاریخ ایک ہی مطالعے کے دو پہلو ہیں"۔ اکثر انگریزوں نے جو بھی تاریخیں لکھیں، اس میں انھوں نے اپنے وطن کے اغراض سیاسیات کو کبھی فراموش نہ کیا اور کسی نتیجے پر پہنچنے میں ہمیشہ اپنے ملک کی ضروریات کو ملحوظ رکھا۔ ان حالات کی موجودگی میں کسی ہندستانی مورّخ کے لیے کس قدر جاں گسل ہے کہ وہ صداقت کو کذب کے چنگل سے نکال سکے۔ اس سے بھی زیادہ یہ مصیبت ہے کہ اکثر مواد انگریز مصنّفوں یا انگریز کے کاسہ لیسوں کے ذریعے ملتا ہے۔ جسے ترتیب دینے میں انھوں نے اپنے وطن کے مفاد کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھا۔ تاریخ کی اس حالت سے ہمیں سراج الدولہ کی زندگی کے صحیح حالات معلوم کرنے ہیں۔ اس اندھیرے میں اس طوفان میں ساحل پر پہنچنا معلوم۔ بیسیوں ایسی تاریخیں ہیں جن میں سراج الدولہ کے حالات بکھرے ہوئے ہیں اور ان میں ایک بھی نہیں الّا ماشاءاللہ جس میں سراج الدولہ کے خلاف معاندانہ روش اختیار نہ کی ہو کہ اس زمانے کی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ سرکار کمپنی کے پیش رو حکمرانوں کو نااہل اور بدوضع ظاہر نہ کیا جائے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب سلطنتِ مغلیہ کا انحطاط شروع ہو گیا تھا اور سرکار کمپنی کی رتی چمک رہی تھی۔ سراج الدولہ کے حالات جن تواریخ میں پائے جاتے ہیں خود ان میں اس قدر تضاد اور تباین ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔ پھر ان پر جو حاشیہ آرائی ہوئی ہے اس نے حقیقت کو ظلمات کے حوالے کر دیا ہے۔ ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر (SIR WILLIAM HUNTER) نے فروری ۱۸۹۷ء کے ٹائمز میں لکھا:

"انگریزوں کی حکومت کے آغاز سے آج تک کی تاریخ مرتب کرنا تب ہی ممکن ہے کہ لاتعداد کاغذوں کے پلندوں کا جائزہ لیا جائے۔ یہ کام ایسا نہیں جسے کوئی تنِ واحد سرانجام دے سکے یا کوئی تنہا ان اخراجات کو برداشت کر سکے۔"

ڈاکٹر باسو اپنی تاریخ کے دیباچے میں ایسا ہی کہتے ہیں کہ:

"انگریزی عہدِ حکومت ایک بھی ایسا شخص پیدا نہ کر سکا جس میں ہندستان کی تاریخ مدوّن کرنے کی اہلیت ہوتی۔"

یہ بحث تشنہ رہی جاتی ہے۔ لیکن مجبوری ہے کہ اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اسے کنایہ ہی سمجھ لیجیے اور اسی سے اندازہ لگائیے کہ سراج الدولہ کی سوانح حیات دریافت کرنا کس قدر کٹھن کام ہے۔ سرکار کمپنی اس کی دشمن، جعفر اس کے خون کا پیاسا، جگت سیٹھ اس کے درپے آزار تو سراج الدولہ کو جس قدر بھی روسیاہ دکھایا جائے، کم ہے۔

سنگِ بنیاد | سراج الدولہ کے زمانے کے حالات جن وسائل سے حاضر ہوتے ہیں ان کا سنگِ بنیاد غلام حسین کی سیر المتاخرین، سر آرمی کی تاریخ ہند، ولیم کے ریکارڈ وغیرہ ہیں اور ان کی کیفیت انھیں باور کرنے کے مانع ہے۔

غلام حسین خاں طباطبائی نے ۱۷۸۰ء میں یعنی سراج الدولہ کی شہادت کے ۲۳ سال بعد اپنی تاریخ مکمل کی۔ یہ وہ وقت تھا کہ سرکار کمپنی معراجِ کمال کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس تاریخ میں طباطبائی

نے اپنے خاندان کے حالات اور مساعی بھی درج کردیے ہیں ۔ یہ کتاب واقعات مابین ۱۱۱۸ھ و ۱۱۹۵ھ پر محیط ہے۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ ایک فرانسیسی نوٹامانس نے کیا۔ اس کتاب کی جو توقیر انگریزی حلقوں میں ہوئی اس کی مثال نہیں مل سکتی ۔ وارن ہیسٹنگز انگلستان چلا گیا تھا مگر اس کے نام سے منسوب ہوئی ۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم سے کم ترجمہ تو اس کی سرپرستی میں ہوا اور غالباً کتاب بھی انگریزوں کے زیر اثر مکمل ہوئی ۔کیوں کہ اس کتاب کے مکمل ہونے پر بڑی مسرت کا اظہار کیا گیا۔ اور انگریز اسے جلد از جلد انگریزی میں منتقل کرنے کے لیے بے قرار ہوگیا۔ اور یہ کام ایم ریمانڈ فرانسیسی کے سپرد ہوا جس نے مسلمان ہوکر اپنا نام حاجی مصطفیٰ رکھا تھا۔ ۱۷۸۹ء میں اس نے یہ ترجمہ نوٹامانس کے نام سے ختم کیا ۔جو تین ضخیم جلدوں میں سما سکا۔ یہ ترجمہ انگلستان بھیجا گیا۔ مگر جس جہاز میں یہ جا رہا تھا وہ غرق ہوگیا اور اس ایڈیشن کی چند جلدیں کلکتہ میں رہ گئیں ۔ اس کے بعد کرنل جان برگز کی نگرانی میں طباعت شروع ہوئی اور ۱۸۳۲ء میں جان مرے نے لندن میں پہلی جلد شائع کی۔ مگر باقی جلدوں کی اشاعت کی نوبت نہ آئی ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر بال فور نے بھی ایک ترجمہ تیار کیا مگر یہ نہیں معلوم اس کا کیا حشر ہوا ۔ موجودہ انگریزی ایڈیشن ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا اور پان سو رُپے فی جلد کے حساب سے فروخت ہوا۔ بلکہ بہت سے حضرات نے پیشگی قیمت ادا کی ۔جس میں گورنر جنرل، گورنر، کئی راجے مہاراجے شامل تھے اور مسلمانوں میں سے صرف سید امیر علی نے حصہ لیا۔ اس کتاب کی شان کا اعتراف جیمس مل

(JAMES MILL) نے اپنی کتاب "تاریخ برطانوی ہند" میں۔ کے۔جی کین (K.G. KANE) نے "سلطنت مغلیہ کے زوال" میں۔ میجر چارلس سٹوارٹ (CHARLES STEWART) نے "تاریخ بنگالہ" میں۔ سر الیٹ (SIR ELLIOT) نے "ہندستان کی تاریخ ہندستانی مورخوں کی زبانی" میں۔ اور رائے بہادر بنکم چندر چیٹرجی نے "چندر شینکر" میں کیا ہے۔ ان مورخوں میں کوئی مسلمان شامل نہیں۔ نہ رائے بہادر صاحب کے علاوہ کسی ہندو نے قصیدہ کہا۔ انگریزوں میں اس کتاب کو کیوں ایسا قبول عام حاصل ہوا۔ اس کی وجہ صریح ہے کہ یہ کتاب ان کے ڈھب اور ان کی مصلحت کی روشنی میں لکھی گئی تھی۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ طباطبائی نے کیوں لکھی ؟ اس کا جواب خود اسی کتاب کے مطالعے سے مل جاتا ہے کہ طباطبائی کی ہمیشہ انگریزوں سے ساز باز رہی۔ وہ ان کے جاسوس کے فرائض ادا کرتا رہا اور آخر کار کمپنی کا باضابطہ ملازم ہو گیا۔ ہیبت جنگ سراج الدولہ، حاجی احمد سب نے طباطبائی بلکہ اس کے ساتھیوں پر کبھی کوئی احسان نہ کیا اور ہمیشہ ان کی سازشوں سے بچے رہے۔ سراج الدولہ نے اس کے ساتھیوں کو مرشد آباد سے نکال دیا۔ میر جعفر اور میران نے بھی انھیں منھ نہ لگایا۔ طباطبائی، شوکت جنگ نواب پورنیہ کا اتالیق تھا۔ جو سراج الدولہ کے خلاف سازش کر کے بدنام ہوا۔ اس کے چچا مہدی نثار نے سراج الدولہ کو علی وردی خاں کے خلاف بغاوت آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ ایسے شخص سے سراج الدولہ کی روح کس طرح کلمۂ خیر کی امید رکھ سکتی ہے۔ اور اگر ڈاکٹر باسو اسے "وطن فروش" کہتے ہیں تو بجا کہتے ہیں۔ اور اگر ہم اس پیتہ شاہد علی کی شہادت کو من وعن درست سمجھے

ہیں تامل کریں تو کیوں گنہ کار ہوں -

اورمی (ORMY) مصنف تاریخ ہند، طباطبائی کا ہم عصر تھا۔ اور اس نے کمپنی کی ملازمت کے دوران میں کتاب لکھی - یہ شخص مدراس سے باہر نہ گیا اور اسے کبھی بنگال جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ ایسے شخص سے یہ توقع ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ کمپنی کی مرضی کے خلاف زبان کھول سکے۔ اور کمپنی کے مفاد کو نقصان پہنچائے۔ کمپنی کا مفاد اسی میں تھا کہ سراج الدولہ کو سیاہ کار ظاہر کیا جائے تاکہ ان کی حرکات حق بجانب ثابت ہوں -

۱۷۸۵ء میں موزم دار نے ایک کتاب "مسندِ مرشد آباد" کے نام سے لکھی جس میں جملہ نوابانِ مرشد آباد کے حالات درج ہیں۔ یہ کتاب صریحاً مسندِ مرشد آباد کی سرپرستی میں لکھی گئی ہے۔ جس پر ابھی تک میر جعفر کی اولاد قابض ہے۔ آپ سے سراج الدولہ انصاف کی کیا امید رکھ سکتا ہے -

اس زمانے کے ایک اور شاہدِ حال ڈاکٹر ہال ویل (HAL WELL) کی کہانی محض طبع زاد ہے۔ ڈاکٹر باسو کہتے ہیں کہ "خود اس کے ہم وطن اسے دروغ گو تسلیم کرتے ہیں"

ان کے علاوہ ایک اور ذریعۂ معلومات تھا۔ مگر وہ بھی کمپنی کے احتساب سے معذور ہے۔ یہ کمپنی کے سرکاری کاغذات کا مجموعہ ہے۔ جسے ٹالی ویلر (TALLOY WHELER) نے مرتب کیا۔ ان اوراق میں وہی باتیں ہیں جس سے کمپنی کے ہر فعل کی حمایت کی گئی ہے۔ ڈاکٹر باسو[۱] اسے ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں اور گرانٹ ڈف[۲] (GRANT DAFF)

---

۱ ملاحظہ ہو "ڈاکٹر باسو" جلد اوّل دیباچہ۔ ۲ ایضاً

کہتے ہیں: "اس میں بہت سے ایسے افعال کو قابلِ تحسین قرار دیا ہے جس کو کوئی عقل مند دیکھنا گوارا نہیں کرسکتا۔ جیمس مل (JAMES MILL) کہتا ہے کہ "کمپنی کے ڈائرکٹروں نے از بس دُوراندیشی سے کام لے کر ان باتوں کو مخفی رکھا ہے جس کا اظہار ان کے مفاد کے خلاف تھا۔" اس تحریر سے اعلائے کلمہ حق میں کیا مدد مل سکتی ہے۔

باقی رہے نجی خطوط، جو اس زمانے میں کمپنی کے ملازموں نے اپنے عزیزوں کو انگلستان بھیجے، یہ بھی قابلِ اعتبار نہیں۔ ان کے بارے میں پرنسپل کواڑ کہتے ہیں: "یہ نجی کے خطوط اور روزنامچے کسی شخص کے کردار پر روشنی نہیں ڈالتے۔ کیوں کہ اس خط و کتابت میں یہ لوگ تصنع اور غلو سے پرہیز نہیں کرتے۔"[۱]

باعثِ تصنیف

اگلے زمانے کی بات ہے کہ بڑے بوڑھے جب کوئی کتاب لکھتے تو اس کی وجہ تصنیف بڑی دھوم دھام سے بیان کرتے تھے۔ ان کے لیے تصنیف و تالیف و زکا الہ کار نہ تھے۔ اس لیے یہ معقول بات تھی کہ بتایا جاتا انھوں نے کیوں اپنا لہو پانی ایک کیا۔ اب وہ صورت نہ رہی اس لیے یہ عذر بھی لازم نہ رہا۔ مگر مجھے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اپنی جوابدہی کروں کہ میں نے ڈرامے کے سبزہ زار سے نکل کر تاریخ کے خارستان میں کس طرح جا سر نکالا ؎

ہم بھولے ہوئے راہ ہیں اے کعبہ نشینو!
جاتے تھے کہیں اور نکل آئے کہیں اور
(جلیل)

[۱] PRINCIPEL COVRD'S ADDRESS TO TB STUDEUTS OF GLASGOW LUIVESSITY. 20 MARCH 1880

ستمبر ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے کہ بھگت سنگھ اور اس کے چند رفقا کسی قتل کے سلسلے میں پنجاب میں گرفتار ہو کر لاہور حوالات میں داخل ہوئے۔ ان میں جتندر ناتھ داس ایک بنگالی نوجوان بھی تھا۔ اس کا حوالات کے اہل کاروں سے کچھ بگاڑ ہو گیا اور اس نے قبل از سماعتِ مقدمہ بہ طور احتجاج بھوک ہڑتال کر دی اور بھوک کے مارے مر گیا۔ اس کی لاش اس کے رشتے داروں کے حوالے کر دی گئی۔ وہ اسے کلکتے لے گئے جہاں اسے سپردِ آتش کیا گیا۔ انھی دنوں میں مجھے دفتر اخبار 'رنبیر' جموں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں 'ٹریبیون' کا ایک پرچہ نظر سے گزرا۔ اس میں مندرجہ ذیل تار شائع ہوا تھا[۵۱] جو انگریزی میں سرورق کے قریب درج ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:۔ "اپنے بزرگوں کی غداری کا کفارہ"۔

۱۹۔ کلکتہ۔ جب جتندر ناتھ داس کی لاش چتا پر رکھی گئی تو اس کے والد بینکم بہاری کی طرف سے مندرجہ ذیل پیغام پڑھا گیا:۔

"اس غداری کے کفارے کے طور پر جس کا ہمارے ہندو مسلمان بزرگوں نے اس وقت ارتکاب کیا جب انھوں نے سراج الدولہ کو دھوکا دیا۔ جس کے وہ نمک خوار تھے اور نہ صرف بنگالہ بلکہ سارا ہندستان غیروں کے حوالے کر دیا۔ اپنا عزیز ترین فرزند حضور کے قدموں میں ڈالتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اس مقدس خودکشی کے طفیل

---

۵۱ THE TRIBUNE LAHORE, DATED 19 SEPTEMBER 1929.

ہندستان بیدار ہو جائے"۔ فری پریس۔

اس تار کو پڑھ کر میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ میری معلومات کے مطابق سراج الدولہ (خاکم بہ دہن) ایک قابلِ نفرت بدمعاش تھا۔ مگر اس کے برعکس یہ تار ظاہر کرتا تھا کہ وہ قابلِ احترام شخصیت کا مالک ہے۔ طبیعت میں کچھ ہیجان سا پیدا ہو گیا اور سوا اس کے مجھے کوئی راستہ دکھائی نہ دیا کہ سراج الدولہ کی زندگی کا مطالعہ کروں۔ جب میں نے جھانک کر دیکھا تو اس قصر کو جسے سیاہ خانہ کہتے تھے نور سے معمور پایا۔ اس پر مجھے خیال آیا کہ اپنے مطالعے کے تاثرات کو دو ایک جز کے رسالے کی شکل میں شائع کر دوں۔ میں نے اپنے مرحوم رفیق کار منشی نور الٰہی سے ذکر کیا تو انھیں یہ تجویز چنداں پسند نہ آئی اور کہنے لگے کہ "میاں رسالے وغیرہ کے چکر میں نہ رہنا، جھگڑوں کا چھتہ ہے یہ کام۔ اسے شروع کیا تو ڈراما ختم سمجھیے"۔ مگر میرے دل میں خیال جم گیا اور میں نے اس "خبط" کو قریباً سولہ سترہ سال کے عرصے میں بتدریج پروان چڑھایا۔

امام اقبال رحمۃ اللہ علیہ

میں نے سراج الدولہ کا ذکر حضرت امام سے حضور کیا۔ اس تذکرے کی تہ میں مدعا یہ تھا کہ ممکن ہے سراج الدولہ پر کوئی نظم ہو جائے۔ آپ نے فرمایا کہ: "سراج الدولہ کو ابھی ہندستان نے نہیں پہچانا۔ نہیں تو مرشد آباد دوسرا اجمیر بن جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ سراج الدولہ کے آخری سانس کے ساتھ ہندستان کی آزادی کا چراغ گل ہو گیا"۔ اس پر مولوی احمد الدین مرحوم جناب کے بے تکلف دوست تھے، کہنے لگے "اس سراج اور چراغ کے تلازمے نے تناسبِ لفظی کو سنوار دیا"۔ ڈاکٹر صاحب بہت ہنسے

اور گویا ہوئے: "مجھے تو اس کا خیال تک نہ تھا۔ مگر آپ "منوّر" کا لفظ استعمال کرکے سیدھے لکھنؤ پہنچ گئے۔" پھر امانت لکھنوی کا یہ شعر سُنایا ؎

کیا ہر نخلِ غم تازہ یہ ٹھنڈی سانس بھر بھر کر
بڑی محنت سے ہم نے یہ شجر جاڑے میں پالا ہر

..... آہ وہ دن!

حضرت نے اگرچہ سراج الدولہ کے متعلق براہِ راست کچھ نہیں کہا۔ مگر میر جعفر کو جو طوقِ لعنت پہنایا ہر اس سے یہی ظاہر ہوتا ہر کہ وہ سراج الدولہ کو کس احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جا بہ جا میر جعفر پر لعنت کی ہر۔ یہ شعر ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں ننگِ وطن

اس کے علاوہ "الاماں از روحِ جعفر الاماں + الاماں از جعفرانِ این زماں" لکھ کر لفظِ جعفر کو غدار کا مترادف بنا دیا اور ایسا بنایا کہ ضرب المثل ہوگیا۔ ایک مقام پر یہ بتاتے ہوئے کہ ہندستان کی تقدیر میں اس وقت تک غلامی لکھی ہر جب تک غدّار یعنی جعفر پیدا ہوتے رہیں گے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

کہ شبِ ہندوستان آید بہ روز!
مُرد جعفر، زندہ روحِ او ہنوز!

اس نظم میں یہ تنبیہ ہر کہ زمانۂ حال کے جعفر کی منافقت سے بچے رہنا جو مسلمانوں کے کپڑے پہن کر مسلمانوں کو دھوکا دیتا ہر ؎

جعفر اندر ہر بدن ملت کش است
این مسلمانے کہن ملت کش است

صادق غدار دکن کی نسبت حضرت اقبال کی توجہ جعفر غدار بنگالہ کی طرف زیادہ رہی۔ ان کے خیال کے مطابق ایشیا کا سب سے بڑا غدار میر جعفر ہے اور رہتی دُنیا تک وہی غداری کا نمایندہ رہے گا۔ کس لیے میر جعفر اس خطاب کا سزاوار ہوا؟ مفصل عرض کیا جائے گا۔

تدوین

اس کتاب کو میں نے اس طرح ترتیب دیا ہے کہ بنگالے کے ابتدائی حالات بیان کیے ہیں۔ سلطنتِ مغلیہ کے انحطاط کے اسباب بیان کیے ہیں۔ پھر مغربی کمپنیوں کی مساعی پر نظر ڈالی ہے۔ —— بنگالے کے صوبے داروں کے حالات قلم بند کر کے علی وردی خاں اور سراج الدولہ کے دورِ حکومت کی تاریخ لکھی ہے۔ پھر وہ عبرت ناک واقعات درج کیے ہیں جو سراج الدولہ کی شہادت کے بعد ظہور میں آئے —— جی تو چاہتا تھا کہ میر قاسم کی طرف بھی توجہ کروں۔ مگر اختصار نے مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ میں نے ایک ضمیمہ چسپاں کیا ہے جس میں وہ متعلقات داخل کیے ہیں جو متن کے ساتھ درج کرتا تو تسلسلِ بیان میں خلل پڑ جاتا۔

میں نے یہ طریق کیوں اختیار کیا۔ اس کے بارے میں گزارش ہے کہ سراج الدولہ کے کردار اور جہاں بانی کو سمجھنے کے لیے اس زمانے کا ماحول پیشِ نظر رکھنا ناگزیر تھا جو اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ اس وقت سلطنتِ مغلیہ کی جو حالتِ زار تھی اسے ہو بہو اُجاگر کیا جاتا۔ جب تک یہ سامنے نہ ہو کہ مغربی کمپنیوں کی مساعی کس قدر خوف ناک صورت

اختیار کر چکی تھیں، سراج الدولہ کی حکمتِ عملی روشن ہی نہیں ہوتی۔ سراج الدولہ کی چھوٹی سی عمر کا بہت سا حصّہ اپنے نانا علی وردی خاں کے سایۂ عاطفت میں بسر ہوا۔ جس میں وہ حکمرانی کا بھی ذمّہ دار رہا۔ اس لیے علی وردی خاں کے حالات سے کس طرح اعتراض کرتا۔ خاص کر جب اس کی تربیت و پرورش بھی اسی زمانے میں ہوئی۔ علی وردی خاں کو صوبے داری کس طرح حاصل ہوئی۔ بتانے میں یہ تقاضا گلوگیر ہوا کہ اس کے پیش رو صوبے داروں کو بھی ذرا روشناس کیا جائے۔

اب رہا میرا طرزِ نگارش۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ سب سے اوّل میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ اوراق جامع نہیں۔ اس میں اضافے کی گنجایش ہے۔ جتنا مجھ سے بن آیا کر دیا باقی کمی کوئی اور صاحب پوری کر دیں گے۔ یہ تو آپ پر روشن ہو چکا ہے کہ میں یہ تذکرہ اس غرض سے لکھ رہا ہوں کہ سراج الدولہ پر جو الزام لگائے جاتے ہیں انھیں رفع کروں۔ اس لیے میں غیر جانب داری کا ادّعا نہیں کر سکتا مگر اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میرے قلم سے ایک لفظ نہ نکلے گا جو مستند نہ ہو اور کوئی دعوا نہ ہوگا جس کی دلیل نہ ہو۔ میں ہر ایک واقعے کی نسبت جملہ مورخوں کے بیانات پیش کر دوں گا۔ جس نتیجے پر پہنچ سکا وہ بھی آپ کے سامنے پیش کر کے دعوت دوں گا کہ آپ اپنی رائے خود قائم کریں۔ بات یہ ہے کہ ؎

روشن ہے اس طرح دلِ سوزاں میں داغ ایک
اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک (میرؔ)

محمد عمر (نورالٰہی) جموں ۱۲ر ستمبر ۱۹۴۵ء

باب اوّل

سلطنتِ مغلیہ

رحلتِ اورنگ زیب عالمگیرؒ

اورنگ زیب دکن سے شاہجہاں آباد کو واپس جا رہا تھا کہ عوارضِ جسمانی نے غلبہ پایا اور اس نے احمد نگر میں قیام کیا۔ زندگی کی امید نہ رہی اور چند روز بعد رحلت کی۔ اس کے دمِ واپسیں کے ساتھ سلطنتِ مغلیہ کا انحطاط شروع ہوا۔ اس زوال کے اسباب پر مورخوں نے بڑی موشگافی کی ہے۔ لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وراثتِ تاج و تخت کا خاندانِ مغلیہ میں کوئی رواج یا قانون نہ تھا جس کے رُو سے ایک بادشاہ کی وفات پر دوسرا بِلا فتنہ و فساد کے تخت نشین ہو سکے۔ اس لیے کسی بادشاہ کے فوت ہونے پر وارثوں میں لازماً خانہ جنگی ہوتی تھی۔ جس کی لاٹھی مضبوط ثابت ہوتی وہی اس بھینس کو ہانک لے جاتا۔

اورنگ زیب کو تاج اپنے سر پر رکھنے کے لیے اپنے تین بھائیوں کے سر تن سے جدا کرنا پڑے۔ اورنگ زیب نے کبھی اس خون سے سُرخ رُو ہونے کی کوشش نہ کی۔ جب اورنگ زیب نے شہزادہ اکبر کو اپنے باپ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے پر

سرزنش کی تو اس نے یہ جواب دیا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ باپ کی سنت پر عمل کر رہا ہوں۔ اورنگ زیب سے کوئی جواب بن نہ آیا۔ اس کے حامی صرف یہ کہتے ہیں کہ خانوادہ تیموریہ میں قدیم سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اس لیے جو کچھ ہوا روا ہے کہ خود اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں نے ایسا ہی کیا ہے تو صرف اورنگ زیب کو کیوں ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے۔ مگر ایک غلطی دوسری غلطی سے جائز نہیں ہو سکتی۔ شاہ جہاں اور جہاں گیر کے نامۂ اعمال کی سیاہی اورنگ زیب کے دامن سے دھبے کو دُور نہیں کر سکتی۔ اورنگ زیب اپنے بزرگوں سے زیادہ دُور اندیش تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس سے زیادہ توقع تھی کہ وہ اس مرض کا علاج کر کے دنیا سے جائے گا۔ بہر حال اخلاقی پہلو کچھ بھی ہو مگر اس سے وہ سیاسی نتائج رونما ہوئے کہ سلطنت کسی کے سنبھالے نہ سنبھل سکی اور وراثت کے جھگڑے اس کا خاتمہ کر کے ختم ہوئے۔

اورنگ زیب کے آخری وقت احمد نگر میں اس کے پاس اعظم شاہ اور کام بخش دو بیٹے تھے۔ اورنگ زیب نے کام بخش کو بیجاپور کا صوبے دار مقرر کر کے روانہ کر دیا تاکہ وہ وراثت کے مخمصوں سے آزاد ہو جائے۔ اس کے بعد اعظم شاہ کو مالوہ بھیج دیا تاکہ اس کی وفات پر وہ تخت پر قبضہ نہ کر سکے۔ اعظم شاہ نے ابھی دو چار ہی منزلیں طے کی تھیں کہ خبر آئی کہ اورنگ زیب کی طبیعت غیر ہے۔ اعظم شاہ یلغار مارتا اُلٹے پاؤں واپس ہوا۔ جب اعظم شاہ پہنچا تو اورنگ زیب کی روح پرواز کر چکی تھی۔ مرحوم بادشاہ کا تابوت اورنگ آباد روانہ کیا۔ چند قدم تک کندھا دیا اور دوسرے دن جو عید الضحیٰ کا دن تھا احمد نگر میں تخت پر جلوس کیا۔

اس وقت اورنگ زیب کا بڑا بیٹا معظم شاہ کابل میں تھا۔ اس کے ہمراہ دو چھوٹے بیٹے خجستہ اختر اور رفیع القدر تھے۔ بڑا محمد معزالدین ملتان میں صوبے دار تھا اور منجھلا یعنی شہزادہ عظیم الشان بنگالے کا صوبے دار تھا۔ یہ شہزادہ معظم کا بہترین فرزند اور اورنگ زیب کا منظورِ نظر تھا۔ اورنگ زیب کی خواہش تھی کہ ہندستان کا تاج معظم کو، ممالک دکن اعظم کو اور بیجاپور کا علاقہ کام بخش کو ملے اور وہ اس تقسیم پر قناعت کریں۔ مگر حرصِ دُنیا نے اسے پورا نہ ہونے دیا[۱]۔

عالم گیر کی بیماری کی خبر سُنی تو معظم کابل سے اور عظیم الشان بنگالے سے اکبرآباد کو روانہ ہوئے۔ راستے میں اورنگ زیب کی وفات کی خبر سُنی تو معظم نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور اعظم کو دعوت دی کہ وہ دکن پر قناعت کرے۔ مگر اس نے جواب دیا کہ دو بادشاہ ایک سرزمین میں نہیں سما سکتے۔ معظم نے اب بہادر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۴ سال کی تھی۔ معظم لاہور پہنچا تو معزالدین بھی ملتان سے فوج لے کر آ ملا اور دونوں اکبرآباد کو روانہ ہوئے۔ ادھر عظیم الشان اکبرآباد پہنچنے کے لیے دن رات ایک کر رہا تھا۔ اسے راستے میں بنگالے کا خراج ایک کروڑ اور چند لاکھ رُپے جاتا ملا۔ اس نے اس پر قبضہ کیا اور اسے لا کر باپ کے قدموں میں ڈال دیا۔ اکبرآباد پہنچ کر مختار خاں صوبے دار اکبرآباد کو قید کیا اور خزانے اور اسبابِ سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ مگر اکبرآباد کے قلعے دار نے قلعہ حوالے نہ کیا۔ اسی عرصے میں معظم بھی پہنچ گیا اور

---

[۱] اس باب کے لیے ملاحظہ ہو سیر المتاخرین جلد دوم و تاریخِ ہند مارش مین صفحات ۷۵، ۳۷۶۔ فارسی و انگریزی ۱ تا ۲۹۴۔

عظیم الشان اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔

میدانِ جاجو میں معظم و اعظم کی جنگ

اعظم شاہ بھی بڑے لاؤ لشکر سے اکبر آباد کو روانہ ہوا۔ اسد خاں اور ذوالفقار خاں گوالیار میں تھے کہ اعظم شاہ نے میدانِ جاجو میں (متصل اکبر آباد) ڈیرا ڈالا۔ دونوں فوجوں میں بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ جس میں اعظم کے دو بیٹے بیدار بخت و عالی جاہ مارے گئے۔ خود اعظم شاہ کے گولی لگی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ معظم کے ایک سپاہی رستم خاں نے اس کا سر کاٹ لیا اور اس کی گود میں جو بچہ عالی تبار تھا اُسے زندہ معظم کے پاس لے گیا جسے معظم نے اپنی آغوشِ شفقت میں لے کر پرورش کیا۔

محمد معظم بہادر شاہ نے تخت نشین ہو کر اسد خاں کے وزیر اور ذوالفقار خاں کے سپہ سالار کو شرف باریابی بخشا اور جلیل عہدوں پر ممتاز کیا۔ پھر حیدر آباد میں کام بخش کو جا لیا۔ جنگ ہوئی اور اورنگ زیب کا دوسرا بیٹا بھی مارا گیا۔ اس کی اولاد کے ساتھ بہادر شاہ نے اچھا سلوک کیا۔ یوں بھی اس کی فیاضی کا یہ حال تھا کہ جو جس نے مانگا دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ کاروں میں نااہلوں کی کثرت اور خطاب متبذل ہو گئے۔

دماغ اور مذہب

خاندانِ مغلیہ فرقۂ اہلِ سنت وجماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ بہادر شاہ نے فرقہ شیعہ کے طریق کو رائج کرنا چاہا اور حکم دیا کہ جمعے کی نماز کے خطبے میں کلمۂ علی ولی اللہ و وصی رسول اللہ مستزاد کیا جائے۔ علماے لاہور نے ہنگامہ بپا کر دیا۔ خجستہ اختر اور عظیم الشان نے بہت کوشش کی مگر بہادر شاہ باز نہ آیا۔ اور بہادر شاہ نے عظیم الشان کو حکم دیا کہ وہ خطیب کو ہمراہ لے کر جائے اور خطیب

اس کے حسب منشا خطبہ پڑھے۔ جب خطیب نے نیا خطبہ پڑھنا شروع کیا تو لوگوں نے اسے ممبر ہی پر قتل کر ڈالا۔ بہت سے مباحثے اور مناظرے ہوئے۔ آخر بہادر شاہ جبر سے کام لینے پر اُتر آیا اور بہت سے حنفی علما کو قتل یا قید کیا۔ انھی ایام میں اُس نے یہ عجیب حکم دیا کہ شاہی کیمپ اور شہر لاہور میں جس قدر کتّے ہوں سب ہلاک کیے جائیں۔ پہلے شک تھا اب سب کو یقین ہو گیا کہ بہادر شاہ کے دماغ میں خلل آگیا ہے۔ ہندستان میں شیعہ سُنّی کا سوال پیدا کرنے کا سہرا بہادر شاہ کے سر ہے۔ جس نے سلطنت کی تباہی میں بڑی مدد دی۔

بہادر شاہ کی وفات

بہادر شاہ اچانک بیمار ہو گیا۔ بہت علاج معالجہ ہوا مگر کارگر نہ ہوا۔ آخر تین چار یوم کی علالت کے بعد ۷۲ سال کی عمر میں فوت ہو گیا اور بہادر شاہ کا دوسرا بیٹا عظیم الشان جو سب بھائیوں پر فضیلت رکھتا تھا تخت نشین ہوا۔ مگر بھائیوں نے مقابلہ کیا جسے عظیم الشان اپنے امرا کی مرضی کے خلاف ٹالتا رہا اور اس عرصے میں دشمنوں کی طاقت بڑھتی چلی گئی۔ آخر عظیم الشان کو شکست ہوئی اور امین الدولہ نے مشورہ دیا کہ وہ مرشد آباد کو نکل جائے اور وہاں فوج منظم کر کے حملہ کرے۔ مگر عظیم الشان نے میدان سے بھاگنا گوارا نہ کیا۔ اسی گفتگو کے دوران میں ایک گولا عظیم الشان کے ہاتھی کے لگا۔ ہاتھی میدان سے بھاگا اور راوی میں جا پڑا۔ مہاوت ہاتھی سے گر گیا اور جلال خاں جو خواصی میں بیٹھا تھا ہاتھی سے اُتر کر بھاگ گیا۔ چند اشخاص ہاتھی کے پیچھے بھاگے مگر وہ نکل گیا۔ امین الدولہ اور بہت سے آدمی دیکھ رہے تھے کہ ہاتھی نے دریا میں غوطہ لگایا

اور پھر نہ اُبھرا اور کچھ پتا نہ لگا کہ عظیم الشان کا کیا حشر ہوا۔ ابن الدولہ قید ہو گیا اور فرخ سیر کے زمانے تک قید رہا۔

بھائیوں میں تنازعہ

جب جنگ ختم ہو گئی تو جہاں دار شاہ نے تقسیم سلطنت و خزانے کا تنازعہ کھڑا کیا۔ جھگڑا اس بات سے شروع ہوا کہ ستر چھکڑے اشرفیوں کے اور ایک سو روپوں کے خجستہ اختر کے ہاتھ لگ گئے اور اس نے حصہ رسدی کا مطالبہ کیا۔ اس پر جنگ کی نوبت پہنچی۔ بیس دن لڑائی جاری رہی۔ معزالدین جہاں دار شاہ زنانہ روپ بدل کے میدان سے بھاگ گیا تھا مگر ذوالفقار خاں نے لڑائی جاری رکھی۔ خجستہ اختر مارا گیا اور شکست فتح میں بدل گئی۔ اب معزالدین نے جہاں دار شاہ کے لقب سے حکومت یا یوں کہیے کہ اپنی طوائف لال کنور سے بے غل و غش عیش و عشرت شروع کی اور رات دن دور شراب اور رقص و سرود میں مصروف رہنے لگا۔ جب صبح ہوئی تو آخری بھائی رفیع القدر نے اپنا خواجہ سرا جہاں دار شاہ کو مبارک باد دینے بھیجا۔ جہاں دار کے خواجہ سراؤں نے کہا کہ احمق دیکھتا نہیں کہ عظیم الشان اور معزالدین پر کیا گزری۔ تمھارے شہزادے کو اس سلطنت سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ یہ سن کر رفیع القدر نے علم بغاوت بلند کیا۔ معزالدین اس وقت مخمور تھا۔ اسے سر پیر کا کوئی ہوش نہ تھا۔ ذوالفقار کے حکم سے خواجہ سراؤں نے اسے اٹھا کر ہاتھی کے ہودے میں ڈال دیا۔ رفیع القدر کمال جواں مردی سے لڑا مگر مارا گیا۔ اس جنگ میں بڑے بڑے سپہ سالار کام آئے جن کے بدل سلطنت کو نصیب نہ ہوئے۔ سب کچھ ہوا مگر جہاں دار کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا ہوا۔ اس کے بعد وہ بڑی

شان سے دہلی میں وارد ہوا۔

جہاں دار شاہ کی خوں آشامی اور ابتذال ۱۷۱۳ء

جہاں دار شاہ نے دہلی پہنچ کر پہلا کام یہ کیا کہ عظیم الشان کے بیٹے سلطان کریم الدین کو جلاد کے حوالے کیا اور عالی تبار پسر اعظم شاہ اور محمد یحییٰ و محمد فیروز مند پسرانِ کام بخش کو قید خانے میں بھیجا۔ لال کنور طوائف کو امتیاز محل بیگم کا خطاب دیا۔ لال کنور کے بھائی خوش حال کو پنج ہزاری بنایا اور اکبر آباد کا فوج دار مقرر کیا۔ ذوالفقار خاں نے اس سند کا اجرا روک لیا اور کہا کہ جب تک حق التحریر کے طور پر چند ہزار طنبور اور ڈھول نہ دے گا حکم جاری نہ ہوگا۔ خوش حال نے اپنی بہن کی وساطت سے جہاں دار کے پاس شکایت کی۔ بادشاہ نے ذوالفقار خاں سے کہا کہ یہ طنبوروں کا مذاق تھا ختم کیجیے۔ اس نے عرض کی کہ یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔ صوبے داریاں اور سلطنت کی مہموں کو سرانجام دینا پرانے خاندانوں کا کام ہے۔ جب صوبے داریاں گویوں کو ملنے لگیں تو یہ خانہ زاد کیا کریں گے۔ ان کے لیے بھی کچھ ذریعۂ معاش ہونا چاہیے۔ میں نے یہ ساز اسی لیے مانگے تھے تاکہ ان خانہ زادوں میں تقسیم کیے جائیں کہ گا بجا کر پیٹ بھر سکیں۔ معزالدین شرمندہ ہو کر چپ ہو گیا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ ستماۃ زہرہ ایک کاچھن لال کنور کی دوگانہ تھی وہ ہاتھی پر سوار ہو کر قلعے میں لال کنور سے ملنے جایا کرتی تھی اور اس کے ملازم راستے میں لوگوں کو بہت تنگ کرتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے کا ایک بہت بڑا سپہ سالار چین قلیچ خاں (آصف جاہ نظام الملک) جو زمانے کی ناہمواری سے برداشتہ خاطر ہو کر خانہ نشین

ہو چکا تھا، کسی جگہ جا رہا تھا کہ زہرا کی سواری سے مٹھ بھیڑ ہو گئی اور اس کی اردل نے خان کے ملازموں کو خوب زدوکوب کیا اور خان کی بھی توہین کی۔ خان جو اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے ذوالفقار کے محل پر نہ گیا تھا۔ اس کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو گیا اور اسے جا کر سارا ماجرا سنایا۔ ذوالفقار خاں نے دل جوئی اور استمالت سے کام لے کر خان کی تشفی کی اور بادشاہ کو پیغام بھیجا کہ خانہ زادوں کی آبرو واحد ہے اور جو سلوک چین قلیچ خاں بہادر سے ہوا اس میں اس کی عزت بھی شامل ہے۔ اُدھر کاچھن لال کنور کے پاس پہنچی تو اس نے رونا پیٹنا شروع کیا آسمان سر پر اٹھا لیا۔ لال کنور نے بادشاہ کو مشتعل کیا۔ قریب تھا کہ بادشاہ کوئی منتقمانہ حکم صادر کرے کہ ذوالفقار خاں کا پیغام پہنچ گیا، غرض ان باتوں سے اُمرا کا دل کھٹا ہو گیا اور انھیں امورِ سلطنت میں کوئی دل چسپی نہ رہی۔

فرخ سیر کا خروج ۱۷۱۳ء جب اورنگ زیب کی وفات کی خبر سُن کر عظیم الشان اکبرآباد کو روانہ ہوا تو اپنے بیٹے فرخ سیر اور حرم کو اکبر نگر (راج محل) میں چھوڑ گیا۔ اب جہاں دار شاہ کی نگاہ اس شہزادے پر پڑی اور جعفر خاں مرشد قلی دیوانِ بنگالہ کے نام حکم جاری ہوا کہ فرخ سیر کو حراست میں لے کر دہلی روانہ کیا جائے۔ مرشد قلی نے بپاس عنایات عظیم الشان فرخ سیر کو خفیہ طور پر مطلع کیا کہ اور بتایا کہ وہ جدھر سینگ سمائے نکل جائے کیوں کہ اس سے زیادہ امداد دینا میری طاقت سے باہر ہے۔ فرخ سیر راج محل سے نکل کر عظیم آباد جا پہنچا جہاں میر حسین علی خاں ناظم تھا۔ فرخ سیر نے حسین علی سے

استمداد کی اور اپنی بے کسی اور بے یاری ظاہر کی۔ حسین علی خاں نے انکار کیا۔ آخر فرخ سیر کی بیگمیں حسین علی خاں کے محل پر گئیں۔ بہت منت سماجت درد انگیز باتیں ہوئیں مگر حسین علی خاں کو یہ بار اٹھانے کی ہمّت نہ پڑی۔ اتنے میں فرخ سیر کی بچّی ملکہ زمانی پردے سے نکل کر حسین علی خاں کے زانو پر آ بیٹھی اور کہنے لگی کہ "آپ سیّد ہیں، خاندانِ نبوت سے تعلّق رکھتے ہیں۔ عظیم الشان کی اولاد کا بھی آپ پر کچھ حق ہے۔ اگر آپ نے ابّا جان کی دست گیری کی تو شایانِ سیادت ہوگا۔ نہیں تو جو کچھ ہونا ہے، ہو جائے گا۔ لیکن یہ دیکھیے کہ دنیا آپ کو کیا کہے گی"۔ اس پر اندر باہر کہرام مچ گیا۔ فرخ سیر نے جھٹ شاہی لباس پہن لیا اور خود اپنے ہاتھ سے تلوار حسین علی خاں کی کمر سے باندھی۔ حسین علی خاں نے کہا کہ میرے پاس صرف سر ہے جو حاضر ہے۔ فوراً فوج جمع کیجیے اور تخت پر جلوس فرمائیے اور دشمن کو تیاری کا موقع نہ دیجیے۔ منجّم رمّال اور مشائخ جمع ہوئے اور انھوں نے فرخ سیر کو بشارتِ سلطنت دی۔ حسین علی خاں نے اپنے بھائی عبداللہ خاں ناظمِ الٰہ آباد کو خط کے ذریعے جملہ حالات سے اطلاع دی۔ عبداللہ کو اس خبر نے بہت متحیّر کیا اور حسین علی خاں کو اس مہم سے منع کیا۔ مگر حسین علی خاں نے عمل نہ کیا اور فرخ سیر کی معاونت پر کمر بستہ رہا۔ آخر عبداللہ خاں بھی رضامند ہو گیا۔

جلوس فرخ سیر

حسین علی خاں نے فرخ سیر کو تخت نشین کر کے مہاجنوں کو تمسک دے کر قرضہ لیا اور عبداللہ خاں نے بنگالے سے جو رُپیہ دہلی جا رہا تھا اُس پر قبضہ کر لیا۔ حسین علی خاں اور فرخ سیر الٰہ آباد کو روانہ ہوئے۔ سیّد عبدالغفار خاں گردیزی دہلی

سے بھیجا گیا کہ عبداللہ خاں کو نظامتِ الہ آباد سے برطرف کرکے قلعے پر قبضہ کرلے۔ مگر اس کی فوج کو شکست ہوئی اور مشہور ہوا کہ گردیزی جنگ میں مارا گیا اور تمام فوج نے روٗ بہ فرار اختیار کیا۔

جب معزالدین جہاں دار شاہ کو فرخ سیر کے الہ آباد پہنچنے کی خبر ملی تو اس نے اپنے بیٹے اعزالدین اور خواجہ احسن خاں کوکل تاش کو ہفت ہزاری منصب اور خان دوراں کا خطاب دے کر فرخ سیر کے مقابلے پر مامور کیا اور غازی الدین چین قلیچ خاں کو اس کے بعد روانہ کیا۔ اعزالدین کھجوا پہنچا تو اسے خبر ملی کہ حسین علی خاں اور عبداللہ خاں کی فوجیں مل گئی ہیں۔ یہ سن کر وہ بد دل ہوگیا اور وہیں قیام کرکے مدافعت کا بندوبست کرنے لگا۔ عبداللہ خاں کی فوج نے حملہ کیا تو اعزالدین اور خان دوران گھبرا گئے اور آدھی رات کے وقت جان بچا کر بھاگ گئے۔ راستے میں چین قلیچ خاں ملا۔ اس نے انھیں بہت لعن طعن کی اور وہ مزید احکام کا انتظار کرنے لگے۔

اس شکست کی خبر دارالخلافہ میں پہنچی تو جہاں دار شاہ نے ذوالفقار خاں کوکل تاش خاں، اعظم خاں اور محمد امین خاں جیسے سرداران ایران و توران کے ساتھ اکبرآباد کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا۔ ۸۷ ہزار سوار، بے شمار پیادے اور جہاں آشوب توپ خانے کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستے میں سربلند خاں، فرخ سیر سے ٹوٹ کر جہاں دار شاہ سے آملا۔ لشکر نے قصبہ سموگر متصل اکبرآباد میں قیام کیا۔ چوں کہ امرا معزالدین جہاں دار شاہ کی بد اطواری کے باعث اس سے بیزار ہو چکے تھے اس لیے بہت سے امرا فرخ سیر کی خدمت میں جا حاضر

ہوئے ۔ اگرچہ انھیں فرخ سیر کی کامیابی کی اُمید نہ تھی ۔ معزالدین کے قابلِ اعتبار اُمرا بھی آپس میں منافق و معاند تھے ۔ کوکل تاش اور ذوالفقار خاں کو ایک دوسرے کی تجویز ہی پسند نہ آئی اور بادشاہ تھے کہ انھیں سوا لال کنور کے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا ۔ آخر معرکۂ کارِ زار گرم ہوا اور فرخ سیر کی فوج کے کئی نام ور سردار مارے گئے حسین علی خاں سخت مجروح ہوکر بے ہوش ہوگیا ۔ عبداللہ خاں بھی زخمی ہوا اور فوج میں انتشار پھیل گیا ۔ اتنے میں عبداللہ خاں کی خاص فوج نے حملہ کرکے میدان کا رنگ بدل دیا ۔ ان سپاہیوں نے ان ہاتھیوں پر حملہ کیا جن پر بیٹھ کر لال کنور اپنی سہیلیوں کے ساتھ جنگ کا تماشا دیکھ رہی تھی ۔ ہاتھیوں پر تیر برسے تو کھلبلی پڑ گئی ، عورتیں چیخنے چلّانے لگیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج میں بھاگڑ پڑ گئی ۔ کوکل تاش خاں مجروح ہوا ، کئی نامی سردار کھیت رہے ۔ کوکل تاش خاں کے بیٹے اعظم خاں نے معزالدین کو صورتِ حالات سے آگاہ کیا اور وہ لال کنور کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہوکر اکبرآباد کو بھاگ گیا اور ذوالفقار خاں جس کے پائے استقامت میں فرق نہ آیا تھا ، اسے بھی میدان سے ہٹنا پڑا اور اس نے دہلی کا راستہ لیا ۔ جہاں دار شاہ نے رات اکبرآباد میں بسر کی داڑھی مُنڈوائی ، زنانہ بھیس بدلا اور لال کنور کے ساتھ شاہ جہان آباد (دہلی) کو روانہ ہوا ۔ راستے میں آصف الدولہ اسد خاں والد ذوالفقار خاں نے اسے قید کرلیا حسن علی خاں لاشوں میں سے زندہ نکل آیا اور تھوڑے سے علاج معالجے سے تن درست ہوگیا ۔

جنگ کے دوسرے دن فرخ سیر نے دربارِ عام کیا اور عبداللہ خاں

کے توسط سے چین قلیچ خاں، محمد امین خاں، عبدالصمد خاں کورنش بجالائے۔ عبداللہ خاں کو قطب الملک خطاب اور ہفت ہزاری کا منصب اور وزارت کا عہدہ ملا اور دہلی انتظام کے لیے بھیجا گیا۔ حسن علی خاں کو امام الملک خطاب، ہفت ہزاری منصب رُتبۂ عالیہ امیرالامرائی و عہدہ بخشی الملک عطا ہوا۔ ایک ہفتے بعد فرخ سیر بھی عازم شاہ جہاں آباد ہوا۔ آصف الدولہ اسد خاں قید کیا گیا۔ ذوالفقار خاں اور جہاں دار شاہ حسب الحکم فرخ سیر ہلاک کیے گئے۔ ان کی جایداد ضبط ہو گئی اور ان کے عیال و اطفال محتاج ہو گئے۔ اعزالدین پسر معزالدین عالی تبار پسر اعظم شاہ اور اپنے چھوٹے بھائی ہمایوں بخت کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر اندھا کیا۔ راجا بھان چند دیوان ذوالفقار خاں کی زبان کاٹ گئی۔ اس ناحق کشی اور سیاست سے لوگوں میں بیم و ہراس پھیل گیا۔ یہاں تک کہ جو دربار میں جاتا اسے زندہ واپس آنے کی امید نہ ہوتی تھی۔

محسن کشی کی سازش جو تنازعہ فرخ سیر اور قطب الملک سید عبداللہ خاں میں شروع ہوا اور آخر میں طول پکڑ گیا۔ وہی درحقیقت سلطنت کی برہمی، اختلال اور خرابی کا اوّلین باعث ہے۔ انھی جھگڑوں میں فرخ سیر سادات کے ہاتھ سے مارا گیا اور پھر سادات کا بھی خاتمہ ہوا۔ جہاں دار شاہ کا پوتا روشن اختر محمد شاہ کے لقب سے تخت و تاج کا وارث ہوا۔

محمد شاہ کے عہد میں ان ایام میں محمد حسین نمود و انمود کے فرقے نے بہت عروج حاصل کیا۔ محمد امین خاں نے اسے مٹانے کی کوشش کی مگر خود ہی مٹ گیا۔ اس زمانے میں نمود و انمود

کا خلیفہ شاہ غفار بڑے زور پر تھا اور احمد شاہ کے زمانے تک اس کا رنگ جمارہا۔ اس فرقے کے متعلق ہم نے ایک ضمیمہ (متعلقات ۱۶) کتاب کے آخر میں شامل کردیا ہے۔

محمد شاہ کے عہد میں فخر الدولہ صوبہ عظیم آباد کا انتظام نہ کرسکا نقابل تر امیر سلطنت کو میسر نہ آیا تو یہ صوبہ بھی صوبے دار بنگالہ شجاع الدولہ، شجاع الدین، محمد خاں کے سپرد ہوا۔ انھی ایام میں "مرے کو مارے شاہ مدار" کی مثل کو ثابت کرنے کے لیے نادر شاہ کابل و لاہور پر حملہ آور ہوا۔ پھر دہلی پہنچ کر اسے خوب لوٹا اور قتلِ عام کرایا۔ سندھ، کابل اور چند محال پنجاب کے شاملِ سلطنت ایران ہوئے۔ نادر شاہ کے جانے کے بعد جب آصف جاہ نظام الملک دکن چلا گیا اور اعتماد الدولہ قمر الدین بھی دست کش ہوگیا تو دربار میں کوئی قابل امیر نہ رہا۔ جو باقی ساقی برائے نام امیر تھے انھوں نے سلطنت کو خود غرضی پر نثار کردیا۔

بنگالے میں

دہلی دربار کی یہ حالت تھی۔ جب شجاع الدولہ صوبے دار بنگالہ نے رحلت کی اور مہابت جنگ علی وردی خاں نے شجاع کے بیٹے علاؤ الدولہ سرفراز خاں سے بنگالے کی حکومت چھین لی۔ اس خلفشار میں کسی صوبے دار کو مرکز سے کسی امداد کی توقع نہ ہوسکتی تھی۔ اس وقت جب دکن اور اودھ سلطنت سے الگ ہوکر خود مختار ہوگئے، گجرات پر مرہٹے چھاگئے۔ بنگالہ ہی ایک صوبہ تھا جو مُردے کے ساتھ وفادار رہا۔

انحطاطِ سلطنت کے اسباب

اورنگ زیب کی حکمرانی اکبر کے خواب

کی تعبیر ثابت ہوئی اور اکھنڈ ہندستان قائم ہوگیا۔ سارے ملک پر مغلیہ پرچم لہرانے لگا۔ مگر تجربے نے بتایا کہ ایک برّاعظم کے برابر ملک پر ایک مرکز سے حکومت کرنا ٹیڑھی کھیر ہو اس لیے مرہٹوں نے اس اکھنڈ ہندستان میں شگاف پیدا کرنے کو اپنا مقصدِ حیات بنایا۔ گو ان کی مساعی کوئی سلطنت پیدا نہ کر سکیں مگر انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندستان میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے یہ لازم ہو کہ اس میں کئی حکومتیں قائم ہوں۔ اکھنڈ سلطنت کی آواز نے خود اورنگ زیب جیسے فرماں روا کی زندگی اجیرن کر دی۔ سارا ملک تو اس کے قبضے میں آ گیا مگر چین کبھی نصیب نہ ہوا۔ اِدھر دولت کی کثرت ہوتی تو آرام طلبی، عیش پرستی آخری حد تک پہنچ گئی۔ لارڈ مکالے اپنے (ESSAYS P. 63) میں لکھتے ہیں:-

"اورنگ زیب کی وفات کو ۴۰ (چالیس) سال نہ گزرے ہوں گے کہ اس کے جانشینوں کی حکومت برائے نام رہ گئی۔ یہ حکمراں عیش و عشرت کے گہوارے میں آنکھیں بند کرکے پڑے رہتے تھے اور انھیں کوئی خبر نہ ہوتی تھی کہ ہندستان میں کیا ہو رہا ہو۔ بھنگ، افیون، شراب، طوائف، نقال، بذلہ سنج اور کنیزیں ان کی زندگی کے جاذب تھے۔"

سلطنت مغلیہ کی بقا کا انحصار تلوار پر تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی شاید اس تلوار کی روح بھی پرواز کر گئی۔ خاندانِ مغلیہ کی طاقت کے سلب ہونے کے بہت سے اسباب ہیں۔ سب سے بڑا باعث وراثت کے تعین کا فقدان تھا۔ کسی بادشاہ کے مرنے پر اس

سے سب فرزند تخت کے دعوے دار بن جاتے تھے۔ اس طرح بادشاہ کی وفات پر اس کے بیٹوں میں خوں ریز خانہ جنگی ہوتی تھی۔ جس میں لاکھوں سپاہی مارے جاتے اور سیکڑوں امرا کام آتے۔ یہ ایک قسم کی خودکشی تھی جو مغل بادشاہوں نے کی۔ داناؤں نے بھی اور نادانوں نے بھی۔ اس سے مغلوں کی فوجی طاقت تباہ ہوگئی اور امرا کے نہ رہنے سے منتظم اور سپاہ دار جماعت مفقود ہوگئی۔ اکھنڈ ہندستان اور عیش و عشرت نے جلتی آگ پر تیل ڈالا۔ جب بادشاہوں نے "اب تو آرام سے گزرتی ہے" پر قناعت کرلی تو عاقبت ان کے افعال و کردار کی آئینہ دار بن گئی۔ لیکن ان بے چاروں کے قصور کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ جب ہم وراثت کے مسئلے کو زیرِ نظر رکھتے ہیں تخت پر بیٹھتے ہی جب انھیں خانہ جنگی سے سابقہ پڑے اور ان کی قابلیت، ان کی شرافت، ان کی شجاعت اس میں صرف ہو جائے تو ان سے یہ کس طرح توقع ہو سکتی ہے کہ وہ سلطنت کا بار سہار سکیں۔ ان کی بادشاہی کا مدار اوروں کی نظرِ کرم پر نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اگر یہ وراثت کا تنازعہ نہ ہوتا تو غالباً مغلوں کی سلطنت مدتِ مدید تک برسرِ اقتدار رہتی۔

دوسرے اورنگ زیب کے انتقال کے چند سال بعد ہی دو غلے مغل بادشاہوں نے تیغ زنی چھوڑ کر عیش پرستی اختیار کرلی۔ قلعہ دہلی میں اورنگ زیب اور اس کے جانشینوں کی تلواریں موجود ہیں۔ انھیں دیکھ کر ان کی قوتِ بازو کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اورنگ زیب کی تلوار ایک بھاری بھرکم حربہ ہے جس کے نقش و نگار فقط لفظِ "اللہ" تک محدود ہیں۔ اس کے مقابلے میں اس کے جانشینوں کی تلواریں ہلکی پھلکی۔ دھان پان

گنگا جمنی، مرصع کاری کے شاہ کار بس چوتھی کی دلھن جس سے ایک چڑیا بھی ذبح نہ ہو سکے نہ گھاٹ نہ کاٹ، چھڑی نہ پکڑی تلوار اٹھالی ۔ یہ تلواریں میدان داری کے لیے نہیں بلکہ کھلونے کے طور پر یا زیب و زینت کے لیے تیار کی جاتی تھیں ۔ اصلی تلواریں سکھوں اور مرہٹوں کے قبضے میں تھیں جس سے وہ ہندستانی آبادی کو برباد کرتے تھے ۔ البتہ اصل جوہر کی تلوار اب تک بنگالے میں پائی جاتی تھی جسے جعفر نے سراج الدولہ کے ساتھ دفن کر دیا ۔

یہ کہنا اور خاموش ہو جانا کہ اورنگ زیب کے جانشین نا اہل ثابت ہوئے اس لیے سلطنت کا انحطاط ہوا محض سہل انگاری ہے ۔ ان کو اپنی قابلیت کے اظہار کا موقع ہی کب ملا جو اس کے اظہار سے قاصر رہے ۔ خانہ جنگی ان کا فرض تھا اور اسے انھوں نے بہر نوع پورا کیا ۔ ورنہ جو خاندان عظیم الشان جیسے شہزادے پیدا کر سکتا تھا اس سے یقیناً اکبر اور اورنگ زیب کے ثانی پیدا کرنا بعید نہ تھا ۔ جب تیموریہ خانوادہ کے شہزادے خانہ جنگی کی بدولت پیدائشی قیدی بن جاتے تھے تو ان قیدیوں کو کس طرح معلوم ہو سکتا تھا کہ جہاں بانی کا تقاضا کیا تھا ۔ نتیجہ یہ کہ جس وقت سراج الدولہ نے ہندستان کی باگ موڑنی چاہی اس وقت سلطنت مغلیہ کی حیات کا چراغ ٹمٹما نہیں رہا تھا بلکہ گُل ہو چکا تھا ۔ اس زمانے کی بادشاہی فقرہ تھی گداگری تھی ۔ کسی نے بادشاہ بنا دیا تو بن گئے، کسی نے تاج سر سے سر سے اُتارنا چاہا تو سر تسلیم خم کر دیا ؎

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا اب دھنواں کب تک
(شبلی)

سب سے بڑا سبب سلطنت کی تباہی کا امرا اور "امرایت" کا فنا ہونا ہے۔ جب ستون نہ رہے تو چھت کس طرح کھڑی رہ سکتی ہے۔

باب دوم

سرکار کمپنی

ہندستان کے لیے مغلیہ سلطنت کے زوال سے زیادہ خطرناک انگریزوں کا عروج تھا جس نے بہ قول ہچن سن "ہندستان کو غلاموں کی نوآبادی بنادیا[1] اور یہ ملک اپنی تاریخی وراثت سے محروم ہوگیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہمیشہ فرماں روایانِ ہند کو کھٹکتی رہی اور علی وردی خاں پہلا حکمراں تھا جسے اس کمپنی کے عروج میں اپنا زوال نظر آیا۔ وہ خود نہ کر سکا تو اس نے اپنے جانشین سے اس کے استیصال کی توقع رکھی۔[2]

اس کمپنی نے کس طرح جنم لیا۔ ذرا وضاحت چاہتا ہے۔ زمانہ قدیم سے ہندستان کی پیداوار اور مصنوعات کی ایشیا کے دیگر ممالک

---

[1] ZESTER HUTCHINSONS TB EMPIRE OF THE NABABS, P. 141,

[2] MASHMONS HISTORY OF INDIA, P 131,

بلکہ یورپ کی منڈیوں میں بڑی مانگ تھی۔ یہ مال خشکی کے راستے جاتا تھا جس پر بہت وقت اور روپیہ صرف ہوتا تھا۔ بعد ازاں ترکوں اور عربوں نے سمندری راستے سے کام لینا شروع کیا اور ہندستان کے مال کی مرکزی منڈی سکندریہ (مصر) قرار پایا۔ اس سے ہندستان کو بے حد مالی فائدہ پہنچتا تھا۔ سوداگر آتے تھے مال لے کر چلے جاتے تھے نہ یہاں رہتے تھے نہ کوٹھیاں اور قلعے بناتے تھے۔

سب سے پہلے یورپ کے ملک پرتگال میں یہ شوق پیدا ہوا اور پرتگیزوں نے ۱۴۹۸ء میں ہندستان میں تجارت کرنے کا عزم کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان کی تجارت چمک اٹھی اور انھوں نے سورت، بمبئی، گوا، دمن اور دیو پر قبضہ جما لیا۔ پرتگیز بڑے دغا باز ڈاکو ثابت ہوئے جب حاجیوں کے جہازوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا تو بہادر شاہ والیٔ گجرات اور سلطانِ مصر نے ان کے استیصال کی طرف توجہ کی اور مقبوضات سے انھیں بے دخل کر دیا۔ مگر ۱۵۳۶ء میں انھوں نے بہادر شاہ کو فریب سے قتل کر دیا۔ ۱۵۷۰ء میں بیجاپور اور احمد نگر کے بادشاہوں نے ان پر متعدد حملے کیے۔ مگر کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ ایک وقت آیا کہ اکبر کے دربار میں بار ملا اور تجارت کے لیے سہولتیں حاصل ہوئیں۔

۱۵۹۶ء میں ولندیزیوں (اہلِ ہالینڈ) نے بھی پرتگیزوں کی تقلید کی اور ہندستان میں تجارت شروع کی۔ انھوں نے پرتگیزوں کو مار بھگایا اور ساری تجارت پر قبضہ کر لیا تھا مگر بعد میں پرتگیزوں سے مفاہمت ہو گئی۔ ولندیزوں نے صرف تجارت سے سروکار رکھا۔

فرانسیسی ۱۶۷۴ء میں فرانسیسیوں کو بھی ہندستان میں تجارت کرنے

کا خیال آیا اور انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کرکے مارٹن کو اس کا اہتمام سپرد کیا۔ اس نے پانڈی چیری کا قصبہ آباد کیا اور اسے اپنا مستقر بنایا پھر ڈیوما گورنر ہوکر آیا اس نے تجارت سے آگے قدم بڑھایا۔ فرانسیسی کوٹھیاں جا بجا کھل گئیں جنھیں انھوں نے اچھے خاصے قلعے بنا دیا۔ ہندستانیوں کو اپنی فوج میں داخل کرنا شروع کیا اور انھی کے ہاتھ سے ہندستان کو غلام بنانے کی بنیاد رکھی۔ ڈیوما کا اثر و رسوخ ایسا بڑھ گیا کہ اس کی آنکھیں ہندستان میں فرانسیسی سلطنت قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگیں۔ ممکن ہو کہ اس کی تعبیر اس کے حسب منشا نکلتی مگر فرانسیسیوں کے پاؤں نہ جمے۔

انگریزوں نے بھی ملکہ الزبتھ کے زمانے میں اس طرف توجہ کی اور بڑی جد و جہد کے بعد کام جاری کیا۔ انگلستان میں بھی برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہو گئی۔ ۱۶۰۸ء میں اس کمپنی کا نمایندہ جہاں گیر کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور سورت میں تجارتی کوٹھی بنانے کی اجازت لی۔ مگر پرتگیزوں نے اس حکم کو منسوخ کرا لیا۔ اس کے بعد ۱۶۱۴ء میں انگریزوں نے سوہلے کے مقام پر پرتگیزوں کو شکست دے کر ان کے اقتدار کو مٹا دیا۔ پھر سر ٹامس رو انگلستان کا سفیر بن کر آیا۔ اجمیر میں اسے دربار شاہی میں بار ملا اور جہاں گیر سے سورت میں کوٹھی کھولنے کی اجازت حاصل ہوئی۔ جہاں گیر نے اسے یہ نصیحت کی کہ صرف تجارت سے سروکار رکھنا اور کسی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا۔ جب شاہ چارلس دوم انگلستان میں بحال ہوا تو وہاں کی جنگ جو جماعتیں منفق ہو گئیں اور ملک کی وسعت و بہبودی کا خیال دل میں سمایا۔ اس کی شادی پرتگال کی ایک شہزادی کیتھرائن آف برگانزا سے ہوئی اور بمبئی کا بندر اسے جہیز میں

ملا۔ انگریز سوُرت سے بمبئی چلے آئے اور قلعہ بندی شروع کردی۔ یہ قلعہ بندی نہ صِرف اس لیے کی جاتی تھی کہ ان سے ہندستانیوں کو مرعوب کرکے ان کو مال دیا اور لیا جاتا۔ بلکہ اس سے یہ غرض تھی کہ آبادی کو دیگر مغربی قوموں کی دست بُرد سے اور مقامی حاکموں کی لوُٹ مار سے بحری ڈاکووں کے حملے سے اور آوارہ گرد سپاہیوں کی غارت گری سے محفوظ رکھا جائے۔ مگر یہ قلعہ بندی اپنی حکومت قائم کرنے کا پیش خیمہ بھی تھی ایسی ہی قلعہ بندی وہ مدراس میں بھی کرچکے تھے۔

ان مغربی اقوام کے قزاقوں نے بحرِ ہند میں طوفان بپا کردیا۔ اُدھر انگلستان میں کمپنی کے مخالف سوداگروں نے اُدھم مچا رکھا تھا جو کمپنی کے اجارے کی تنسیخ کے پیچھے پڑے تھے۔ احتجاج کرنے والوں میں انگریز مزدوُروں اور کاری گروں نے بھی حصّہ لینا شروع کیا اور انھوں نے یہ عذر پیش کیا کہ انگلستان سے جو سونا اور مال ہندستانی مال کے لیے دیا جاتا ہے اس سے انگلستان کی مالی حالت کم زور ہوتی جاتی ہے اور ہندستانی سوُتی کپڑے اور ریشم نے انگلستان کی صنعت کو برباد کردیا ہے، کاری گر تباہ ہوگئے ہیں اور مزدوُر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ آخر یہ قانون نافذ ہوا کہ ہندستانی، ایرانی اور چینی ریشمی کپڑا اور چھینٹ کا پہننا ممنوع ہے۔ اٹھارویں صدی میں ہندستانی مصنوعات انگلستان اس لیے روانہ ہوتی تھیں کہ وہ برِّاعظم میں فروخت کی جائیں مگر انھیں انگریزی منڈی میں جانے کی اجازت نہ رہی۔

اس جھگڑے کے شروع ہونے پر کمپنی کی قیادت سر جوسیا چائلڈ نے سنبھالی جو بیس سال تک کمپنی کا گورنر رہا۔ اس شخص نے بادشاہ

اہلِ دربار پارلیمنٹ کے ممبروں تک کو رشوت پہنچائی اور کمپنی کی اجارہ داری ہندستان میں قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔ بدمعاش تو تھا ہی مگر بلا کا ہوشیار۔ اس نے بھانپ لیا کہ ہندستان کی درماندگی سے فائدہ اٹھانے کا وقت قریب ہے۔ سنہ ۱۶۶۷ء میں اس نے کہا کہ ہندستان میں آنے والے انقلاب کے پیشِ نظر ہمیں ہندستان میں حکومت کرنے کا سازوسامان پیدا کرنا چاہیے۔ لیکن اس نے مغلیہ تباہ حالی کا غلط اندازہ لگایا اور اسے جلد اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ جب سنہ ۱۶۸۶ء میں اس نے کمپنی کو اورنگ زیب پر حملہ کرنے پر اُکسایا۔ سلطنت مغلیہ سے لڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگالے کی نوآبادیاں برباد ہوگئیں۔ اُدھر دوسرے فریق نے رشوت ستانی کے ذریعے ایک اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا اجارہ حاصل کرلیا۔ نئی کمپنی نے اورنگ زیب کے حضور ایک وفد بھیجا مگر اورنگ زیب ان کے مکرو فریب میں نہ آیا۔ تین سال کی تباہ کن رسّاکشی کے بعد دونوں کمپنیاں مل گئیں۔

اب وہ وقت آیا جب کمپنی نے بنگالے میں دخل دینا شروع کیا۔ کیوں کہ ڈھاکے کی نفیس بافت اور پٹنہ کے قلمی شورہ کو دیکھ کر ان کے منھ میں پانی بھر آیا۔ انھوں نے پپلی اور بالاسوَر میں نوآبادیاں قائم کیں اور آخرکار سنہ ۱۶۵۱ء میں ایک بہت بڑی کوٹھی ہُگلی میں کھولی۔ سلطنت مغلیہ کے صوبے داروں نے ہمیشہ یورپی تاجروں کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھا اور ان کا ہندستان میں آنا بُرا سمجھا۔ وہ ہمیشہ ان سے برسرِ پرخاش رہے یہاں تک کہ ولندیزوں سے صوبے دار بنگالہ تین سال تک مسلسل نبرد آزما رہا۔ آخر انھیں بیرام پور میں رہنے کی اجازت ملی سنہ ۱۶۸۲ء میں

بنگالے میں کمپنی کے معاملات کا کرتا دھرتا ایک شخص مسمی جاب کارنک تھا۔ یہ منچلا شخص تھا جو مغربی یا ہندستانی اخلاقیات کی ذرا پروانہ کرتا تھا۔ سب افسروں کے لعن طعن سے بے نیاز ہوکر اس نے ایک ہندو عورت کو گھر میں ڈال رکھا تھا۔ جسے وہ ستی کی چتا سے اٹھا کر لایا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ایک نوکر تھا بڑا بدلگام اور جوشیلا جو ہر کسی کی پگڑی اچھال دیتا تھا اور لوگ اس سے بہت تنگ آ گئے تھے۔ مالک اور نوکر کی سیاہ کاریاں ہر کسی کی زبان پر تھیں۔ بہ ایں ہمہ وہ کمپنی کا بہت فائدے مند آلۂ کار تھا۔ جب سرجوسیا چائلد نے اورنگ زیب کے عہد میں لڑائی شروع کی تو کارنک نے چٹنا نوٹی (موجودہ کلکتہ) کا رُخ کیا وہاں بھی ٹھیرنا نہ ملا۔ تو جزیرۂ ہنگلی میں جا سر نکالا۔ وہاں اس کی جماعت مغل سپاہیوں اور وحشی جنگلی درندوں سے اپنی جان بچاتی رہی۔ یہ جنگ ۱۶۹۰ء تک جاری رہی۔ اورنگ زیب نے انگریزی نوآبادیوں کا بنگالے میں نام تک نہ رہنے دیا اور انگریزوں نے کئی مغلیہ جہازوں کو غرق کر دیا۔ آخر عاجز ہوکر معافی مانگی۔ اورنگ زیب کے مراحم ساہانہ سے باغی تک جو مغلوب ہو جاتے محروم نہ رہتے تھے۔ انگریزوں کو معافی اور دوبارہ تجارت کی اجازت مل گئی۔

کچھ عرصے کے بعد کارنک نے کلکتے میں ایک آبادی بنائی اور تین سال بعد صوبے دار بنگالہ نے انگریزوں کی باتوں میں آکر پرلے درجے کی حماقت سے کام لیا کہ انگریزوں کو کلکتے کی قلعہ بندی کی اجازت دے دی اور ۱۶۹۹ء میں اس قلعے کو فورٹ ولیم کے نام سے موسوم کیا گیا۔

بحری ڈاکو

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب فوت ہوا، سلطنت خانہ جنگی کی مشق اور مغربی کمپنیاں اپنے علاقے وسیع کرنے لگیں۔

بحرِ ہند میں ان دنوں مغربی ڈاکوؤں کا دور دورہ ہوگیا۔ ان کا ایک بڑا مرکز جزیرۂ مدغاسکر کی قلعہ بندی میں مصروف تھا، جہاں سے نکل کر وہ مغلیہ اور انگریزی جہازوں کو لوٹتے تھے۔ مدغاسکر میں ان کی شان شاہانہ تھی۔ کسی ایک نے بادشاہی کا اعلان کیا تھا اور مہذب اقوام کی طرح آپس میں لڑا بھی کرتے تھے۔ انگلینڈ، ٹیلر، اور می، سٹیچ ان کے سردار تھے اور جان پلانٹین ان سرداروں کا سردار تھا۔ اس کا محل قلعہ بند اور عالی شان تھا جس میں وہ شاہانہ طریق پر رہتا تھا۔ ہزار ہا نوکر اور کنیزیں جمع کر رکھی تھیں۔ انگریز جن افسروں کو ان کے مقابلے میں بھیجتے تھے وہ اکثر خود قزاقوں کے حلقے میں چلے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک کپتان کڈ تھا جو ان کی روک تھام کے لیے کمپنی کے ایک جہاز میں بھیجا گیا۔ اس نے نہ صرف مغلوں، فرانسیسیوں اور پرتگیزوں کے جہازوں پر ڈاکہ ڈالا بلکہ کمپنی کا بھی ایک جہاز لوٹ لیا۔ آخر انگلستان سے ایک جہاز بحری سپاہیوں کو لے کر پہنچا جس کا کپتان ماہتیو تھا۔ یہ شخص بڑا بے ایمان اور بے وقوف تھا۔ جب تک کمپنی میں رہا سب اس سے بیزار رہے۔ آخر ماہتیو بحری ڈاکوؤں کے قلعے سینٹ میری کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی آمد کی خبر سن کر قزاقوں نے قلعہ خالی کر دیا اور بھاگ گئے۔ وہاں کئی شکستہ جہاز، توپیں، جواہرات اور کھانے پینے کا سامان ملا۔ ماہتیو نے قزاقوں سے صلح کر لی اور ان کی تجارت میں شامل ہوگیا۔

ان قزاقوں نے مرہٹوں سے بھی ساز باز کر لی اور کانجی انگورا سے اتحاد پیدا کیا۔ یہ مرہٹہ ایک بحری قزاق خاندان کا سردار تھا جن کا گوا سے بمبئی تک ساحل پر تسلط تھا اور یہ پرتگیزی، انگریزی اور مغلیہ

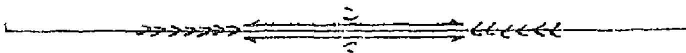
جہازوں کو لوٹا کرتا تھا۔ ۱۷۵۶ء میں اس کی قوت کا خاتمہ ہوا۔[۵۱]

تبصرہ | کمپنی میں بڑے عیب نکالے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ملازموں میں شرفا شامل نہ تھے بلکہ ایسے آوارہ منش لوگ تھے جنھیں یورپ نے اپنے حلقۂ تمدن سے خارج کیا۔ ان کی تعلیم معمولی تھی وہ دغا باز تھے، چالاک تھے، ایسی عیاری کرتے تھے کہ دوسرا سمجھ نہ سکتا تھا۔ یہ سب کچھ دُرست بلکہ اس سے بھی زیادہ معائب کا امکان تسلیم۔ لیکن اسی زمانے میں جو کچھ ہندستان میں ہو رہا تھا اسے آپ کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیا ہمارے بزرگوں کے افعال احمقانہ نہ تھے۔ لاریب وہ خودکشی کرنا چاہتے تھے کمپنی نے اس ہلاکت میں ان کا ہاتھ بٹایا، ریشہ دوانیاں کیں مگر اہلِ ہند ان کا سدِّباب نہ کر سکے۔ خمیازہ کون اٹھائے گا؟ کمپنی نے سازشیں کیں اور غدار پیدا کیے مگر یہ کون تھے؟ کمپنی نے بہتر نظامِ حکومت کا سبز باغ دکھایا۔ اہلِ ہند نے باہمی کُشت و خون، قزاقانہ دست بُرد، قانون شکنی اور لا آئینی جواب میں پیش کی، اپنی اہلیت کا آپ جنازہ نکالا۔ پھر شکایت کیا اگر سرکار کمپنی کام یاب نہ ہوتی تو فرانسیسی یا ولندیزی اس نا بالغ ملّت کی وراثت سنبھال لیتے۔ فرانسیسیوں اور انگریزوں نے سپتے میز پر کھول دیے اور دکن میں اُن کی مساعی نے اعلان کر دیا کہ وہ تاجر سے تاجور بننے کے مدعی ہیں۔ تھا کسی میں حوصلہ۔ دماغ اور ذہانت؟ جو ان کی پیش قدمی کو روک سکتا۔ سرزمینِ بنگالہ سے جو پیر صفت نوجوان اٹھا اور اس نے مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے سینہ تان دیا۔ یادش بخیر ہمارے بزرگوں نے جن کی وطن دوستی میں ہندو مسلمان مساوی حق دار تھے۔ اس کے سینے کو اپنے ہاتھ سے چھیدا

۵۱ THE EMPIRE OF HE NABABS, P. 55-66.

اور اس کے سر کو اُتار کر خود ہندستان کا سر کمپنی کے قدموں پر ڈال دیا۔ آپ کو اپنے بزرگوں کے کارنامے بر مانتے ہوں گے۔ مگر کبھی آپ نے سوچا کہ آپ کی سیاسی ترقی ابھی تک اپنے بزرگوں کی تقلید سے گرداں نہیں ہوئی اور آپ اسی مقام پر براجمان ہیں جہاں ہمارے بزرگ مجرا دیکھا کرتے تھے۔ آپ کی تعلیم، آپ کی ثروت، مُلک کا امن و امان، وسائلِ کسبِ زر کی فراوانی آپ کی ذہنیت میں کوئی انقلاب پیدا نہ کر سکے۔ دُنیا کِدھر سے کِدھر نکل گئی مگر ہماری رجعت پسندی کا قطب مینار وہیں سر بہ زانو ہے جہاں جعفر، دلب رام، امی چند، سروپ چند، مہتاب رائے ہمیں چھوڑ گئے تھے۔ ان حالات میں سوراج مل بھی گیا تو سوا خانہ جنگی پیدا کرنے کے کس کام کا ہوگا؟ اگر ہندو مسلمان تعلقات سراج الدولہ عہد کی سطح پر نہیں آ سکتے تو یہ غلاموں کا نہیں نابالغوں کا مُلک ہے۔ اگر انگریز ہم نابالغوں کی دیکھ بھال سے دست کش ہو گئے تو پھر ہمیں کسی اور محافظ یا ولی کی ضرورت ہوگی۔ ہم بکریوں کا ریوڑ ہیں۔ چرواہے کے بغیر ہماری زندگی محال ہے۔ اگر ہماری سیاسیات کا یہی عالم ہے تو کیوں نہ انگریز ہی ہمارا گہوارہ ہلائیں، لوریاں دے کر سُلائیں اگر جاگ اُٹھیں تو ریڈیو سُنیں یا سینما چلے جائیں۔ دیول کانفرنس شملہ کا تازہ المیہ آپ کے سامنے ہے۔

زہے تصوّرِ باطل زہے خیالِ محال



باب سوم

سراج الدولہ کے پیش رو[۱]

(۱۷۰۴ - ۱۷۲۵)

یہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ جب اورنگ زیب نے رحلت کی تو اس سے قبل ہی شہزادہ عظیم الشان نے بنگالے کی صوبے داری مرشد قلی خاں کے سپرد کردی تھی جہاں وہ دیوان تھا۔ جب مرشد قلی خاں نے صوبۂ بنگالہ کا نظم ونسق شروع کیا انھی دنوں میں انگریزوں کی دونوں کمپنیوں میں اتحاد ہوگیا اور انھوں نے اپنی ساری توجہ بنگالے کی طرف منعطف کردی۔

مرشد قلی خاں کے ابتدائی حالات

حاجی صوفی اصفہانی ایک ایرانی سوداگر ہندستان میں تجارت کرتا تھا۔ یہ شخص بڑا بارسوخ، ہردل عزیز اور فیاض تھا۔ کہتے ہیں قیامِ دکن کے دوران میں اسے ایک گداگر برہمن لڑکا ملا جس کا نہ کوئی مونس تھا نہ غم گسار۔ آوارۂ محض تھا۔ حاجی کو اس کی حالت پر رحم آیا اور اسے اپنے جوارِ شفقت میں لے لیا اور بڑے رکھ رکھاؤ سے تعلیم دلائی۔ حاجی نے اس کے مذہب میں کبھی دخل نہ دیا۔ لیکن اس نے اسلامیہ

---

[۱] یہ جملہ واقعات سیر المتاخرین جلد دوم سے ماخوذ ہیں۔ انگریزی اور فارسی دونوں زیر نظر رہیں۔

ماحول میں تربیت پائی۔ اس سے لازم تھا کہ اس کا رجحانِ طبع اسلام کی طرف ہوتا۔ چناں چہ سن بلوغ کو پہنچ کر اسلام قبول کیا اور اس کا اسلامی نام محمد ہادی رکھا گیا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کا ہندو نام کیا تھا۔

حکومت بنگالہ

محمد ہادی ابھی لڑکا ہی تھا کہ اس کے علم و فضل، فہم و فراست کی دھوم مچ گئی۔ پہلے محکمۂ مال میں معقول ملازمت مل گئی پھر کارگزاری اور دیانت داری کی شہرت شہنشاہ عالمگیر کے گوش مبارک تک جا پہنچی اور محمد ہادی کو حیدرآباد دکن میں دیوان کا عہدہ مرحمت ہوا۔ ۱۷۰۱ء میں دیوانِ بنگالہ کے عہدے سے سرفراز ہوا۔ خیر طلب خاں کا خطاب ملا۔ چند ماہ ڈھاکہ میں کام کیا تھا کہ عظیم الشان صوبے دارِ بنگالہ کا منظورِ نظر ہو گیا۔ اُمرا میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور انھوں نے سازش کر کے مقصود آباد جیسے غیر معروف مقام پر پھنکوا دیا۔ عظیم الشان کے بعد اس نے محکمۂ مال کی ہئیت بدل دی، دربار سے خلعت سروپا آئے اور مرشد قلی خاں کا خطاب مستزاد ہوا۔ مقصود آباد کا نام بدل کر مرشد آباد رکھا، ٹکسال کھولی اور مرشد آباد کا سکّہ رواں ہوا عظیم الشان کے دہلی جانے کے تھوڑے عرصے بعد اس کے نام صوبے داری کا فرمان اور خطابات آ گئے اور بنگالے کا نظامِ حکومت بہتر سے بہتر ہوتا چلا گیا۔ خراج جو کئی سال سے ادا نہ ہوا تھا پابندی کے ساتھ روانہ دہلی ہونے لگا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ بنگالے کی فلاح و بہبود کا انحصار جہازوں پر ہے اس لیے اس نے مغل، عرب اور ہندستانی تاجروں کی جہازرانی کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ کلکتے میں انھوں نے جو قلعہ بندی کی ہے وہ مسمار کی جائے۔ شاہ جہاں اور فرخ سیر کی عطا کردہ

مراعات کو بھی اس نے پسِ پُشت ڈال دیا۔ اس کی دوُر بین نگاہوں نے دیکھ لیا کہ یہ قلعہ بندیاں کسی دن رنگ لائیں گی اور سلطنت کے لیے وبالِ جان ثابت ہوں گی۔ یہ ایک حقیقت ہو کہ یہ قلعے بندیاں ہمیشہ دانش مند ہندستانی مدبروں کی آنکھوں میں کھٹکتی رہیں۔ مرشد قلی خاں زیادہ تر انگریزوں کی قلعہ بندیوں سے بیزار تھا۔ پھر اس نے وہی محصول انگریزوں کی تجارت پر لگا دیا جو دوسرے تاجر ادا کرتے تھے۔ ان سے بچنے کا کمپنی کے پاس سوا رشوت ستانی کے کوئی ذریعہ نہ تھا اور مرشد قلی خاں اس سے بالا تھا۔ کلکتے کے انگریزوں نے لاچار ہوکر ایک وفد دہلی روانہ کیا جس میں جان سرمن، ایڈورڈ سیٹفن اور ڈاکٹر ہملٹن شامل تھے۔ یہ وفد بہ عہد فرخ سیر بڑے قیمتی تحائف لے کر روانہ ہوا اور تین ماہ کے عرصے میں ۸ جولائی ۱۷۱۵ء کو دہلی پہنچا اور ۷ جون ۱۷۱۶ء تک وہاں رہا۔ کمپنی کے ملازم رشوت دینے اور لینے میں ماہر تھے۔ انھوں نے بہت سے درباری ملا لیے اور بہت سے ایسے مل گئے جو مُرشد قلی خاں کے اقدام کی اہمیت کے سمجھنے سے قاصر تھے۔ مُرشد قلی خاں کے وکلا نے اس وضاحت سے معاملے پر روشنی ڈالی کہ اہلِ دربار اس کی حکمتِ عملی کے قائل ہو گئے۔ مگر ایک واقعے نے صورتِ حالات بدل دی۔ فرخ سیر کی شادی ایک راج پوُت شہزادی سے قرار پائی تھی مگر بادشاہ مرض بھگندر میں مبتلا ہوگیا جس کے علاج سے درباری حکیم عاجز آگئے اور ڈاکٹر ہملٹن کا علاج کارگر ہوگیا۔ اس خدمت کے صلے میں فرخ سیر نے وفد کی سب معروضات ماننے کے علاوہ کلکتے کے قریب اڑتیس ۳۸ گانو خرید کرنے کی اجازت دی۔ درباریں جو ذی ہوش تھے حیران رہ گئے۔ انھوں نے

بہت سر مارا مگر کسی نے ان کی نہ سُنی۔ ان دیہات کا رقبہ دریا کے دونوں طرف دس میل کے قریب تھا اور اس سے کمپنی کو صوبے کی بحری تجارت پر مکمل تسلّط حاصل ہو جاتا تھا۔ مُرشد قلی خاں نے زمین داروں کو ہدایت کی کہ انگریزوں کو بالشت بھر اراضی نہ دیں۔ انگریز دربار کا جو فرمان لائے وہ زیبائش کے لیے رہ گیا۔

"اکابر ہند کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی جب تک مُرشد قلی خاں کا نام اس میں شامل نہ ہو۔ وہ راجا ٹوڈرمل ثانی کے نام سے بجا طور پر مشہور تھا۔ اس نے جمع بندی اراضی کے کاغذات اس تفصیل سے مکمل کیے کہ ہر ایک حیثیت آئینہ ہو گئی۔ اس نے مالیہ کا تعین از سرِ نو کیا اور جا بجا مالیہ جمع کرنے کے لیے محاصل مقرّر کیے جو بعد میں متمول زمین دار بن گئے اور راجا کہلانے لگے۔ اس نے صوبے کو چکلوں میں تقسیم کیا۔ وہ مذاق کے طور پر کہا کرتا تھا کہ مسلمان افسر چھلنی کی طرح ہوتے ہیں جو کچھ ان میں ڈالو اسی وقت نکل جاتا ہے اور ہندو افسر اسفنج ہوتے ہیں، جب انھیں نچوڑو تو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے محصّل زیادہ تر ہندو ہی مقرر کیے۔

اس کی ایک ہی بیوی تھی جس کا نام نوروزی بانو بیگم تھا۔ اولاد میں صرف ایک لڑکی زینت النسا بیگم تھی جس کی شادی شجاع الدین خاں سے ہوئی اور اسی کو مُرشد قلی خاں نے اپنا جانشین مقرر کیا اور دہلی سے منظوری حاصل کی۔

مُرشد قلی خاں نے نظامِ حکومت میں قابلِ قدر اصلاحات کیں امدیوں کی جماعت کو کم کر دیا، غلّے کا باہر جانا بند کیا، تعلیم عام کرنے کے

لیے صاحبانِ علم و فضل کی سرپرستی کی، چھوٹے چھوٹے ٹیکس جن کا اثر غربا پر پڑتا تھا منسوخ کر دیے۔ اس کا چلن اتنا اچھا تھا کہ منشی اشیا یہاں تک کہ حقے کو منھ نہ لگاتا تھا۔ احکامِ شرعیہ کا احترام کرتا تھا، مزدور و مساکین میں ہر روز کھانا تقسیم کرتا تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں ایک رُپے کے پانچ من چاول ملتے تھے اور ایک رُپیہ ماہوار کمانے والا پلاؤ اور قیمہ کھاتا تھا "۔ (موزم دالہ صفحہ ۲۲)۔

۱۷۲۵ء میں وفات پائی، مُرشد آباد میں دفن ہوا۔

(۲)

مؤتمن الملک شجاع الدولہ نواب شجاع الدین محمد خاں بہادر اسد جنگ

(۱۷۲۵ — ۱۷۳۹)

مُرشد قلی خاں کے سایے میں

یہ ترکستان کے ایک ذی عزت قبیلۂ فشار سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا باپ دکن میں ایک جلیل القدر عہدے پر ممتاز تھا۔ ان کا مسکن برہان پور تھا۔ ابتدائی زمانے ہی میں جب مُرشد قلی خاں بھی برہان پور میں مقیم تھا، مُرشد قلی خاں نے شجاع کو فرزندی یعنی دامادی میں قبول کیا۔ اس کی تعلیم و تربیت خود مُرشد قلی خاں کی نگرانی میں ہوئی اور شجاع کو فرزند نرینہ کی منزلت ملی۔ ابتدا میں مُرشد قلی خاں نے شجاع کو تربیت کے لیے صوبہ اڑیسہ میں صوبے دار مقرر کرایا اور شجاع وہاں جاکر

آباد ہوا۔ اس کا باعث مرشد علی خاں سے اختلاف رائے بھی تھا جو اس قدر بڑھا کہ دونوں کا ایک جگہ رہنا مشکل ہوگیا۔ اس لیے شجاع نے فاصلے پر رہنا مناسب خیال کیا۔ شجاع نرم مزاج اور انصاف پسند واقع ہوا تھا۔ تنازعۂ باہمی کی ایک اور وجہ شجاع کی اپنی بیوی سے اَن بن تھی جس میں اس کی خوش دامن یعنی مرشد قلی کی بیگم بیٹی کی طرف دار ہوگئی۔ بیگم کو زیادہ تر یہ شکایت تھی کہ شجاع طوائفوں اور کنیزوں کی مجلس میں بیٹھا رہتا ہے۔ وہ شجاع سے ناراض ہوگئی اور اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر مرشد آباد چلی آئی۔

علی وردی خاں کے خاندان کی آمد

اسی زمانے میں ایک فشار ترک مسمّی مرزا محمد نمودار ہوا جو شجاع کا قرابت دار بھی تھا۔ یہ شہزادہ اعظم کی ملازمت میں تھا۔ اپنے مالک کی وفات کے بعد عسرت نے دبا لیا۔ بہت عرصے تک بے کار رہا۔ آخر ایک بڑے کنبے کی پرورش سے تنگ آکر شجاع کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ محمد شاہ کے عہدِ حکومت کا واقع ہے۔ شجاع بڑی عزّت سے پیش آیا اور عنایاتِ شاہانہ کی بارش کردی۔ اسے ملازمت میں لیا اور تھوڑے عرصے میں خوش حال کردیا۔ یہ خیر مقدم دیکھ کر اس کا فرزند مرزا محمد علی بھی یہیں اڑیسے چلا آیا۔ آدمی تھا ذہین، مزاج شناس، آداب داں، ملنسار، خوش مزاج۔ اس کے ساتھ بہادر اور فنونِ جنگ سے آگاہ۔ شجاع اس پر فریفتہ ہوگیا۔ چند دنوں میں وہ بڑے بڑے عہدوں تک جا پہنچا۔ جب اس نے اچھی طرح سکّہ جما لیا تو اپنے بھائی حاجی احمد کو بھی بلا لیا اور اس کے ساتھ باقی ماندہ کنبہ بھی شاہ جہاں آباد سے چلا آیا۔ حاجی احمد

لیاقت میں اپنے بھائی کا ہم پلّہ تھا۔ اس کے لیے بھی عہدوں کے دروازے کھُل گئے۔ ان کی خدمات سے شجاعؔ کی حکومت بہت مضبوط ہوگئی۔ مالیات کے محکموں میں اصلاح ہوئی لیکن مرزا محمد علی باپ اور بھائی سے بہت آگے نکل گیا۔ شجاع نے دہلی سے اس کے لیے علی وردی خاں کا خطاب بھی منگوایا جس خطاب سے وہ مشہور ہے۔

اس تمام عرصے میں مرشد قلی خاں شجاع سے ناراض رہا اور اس نے اپنے نواسے (یعنی شجاع ہی کے بیٹے) سرافراز خاں کے لیے نظامتِ بنگالہ کا فرمان حاصل کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس کے لیے اپنے وکلائے دربار کو سخت تاکید کی اور لاکھوں رُپے صرف کرڈالے۔ یہ خبر شجاع کے کانوں تک پہنچی تو اس نے حاجی احمد اور علی وردی خاں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ چند ہوشیار، تجربے کار اور لسّان اُمرا کو فوراً دربار شاہ جہاں آباد میں بھیجا جائے اور انھیں معاملہ طے کرنے کے کلی اختیارات دیے جائیں۔ شہنشاہ، وزیر ملک، ولی عہد بہادر اور خان دوراں کی خدمت میں عرائض کے ذریعے کُل حالات گزارش کیے جائیں۔ یہ درخواستیں بڑی محنت اور تن دہی سے نہایت عاجزانہ لہجے میں لکھی گئیں اور بنگالہ اور اڑیسہ دونوں صوبوں کی نظامت اور دیوانی کی التجا کی گئی۔ وکیل فوراً شاہ جہاں آباد کو روانہ ہوگئے۔ اب انھوں نے چند قابلِ اعتماد سپاہیوں کو برائے نام ملازمت سے معزول کرنے کا اعلان کیا اور در پردہ انھیں یہ ہدایت ہوئی کہ مُرشدآباد میں مُرشد قلی خاں کے محل کے گرد چکّر لگاتے رہیں جو کام کی بات معلوم ہو اس سے اطلاع دیں اور مزید احکام کے منتظر رہیں۔ چوں کہ برسات شروع ہونے کو تھی جس میں کٹک سے مرشدآباد

پہنچنا مشکل ہو جاتا تھا اس لیے بہت سی کشتیاں تیار کی گئیں تاکہ ضرورت ہو تو خود شجاع بہت جلد مرشد آباد پہنچ جائے۔ کٹک اور شاہ جہاں آباد میں خبر رسانی کا ایک خفیہ محکمہ کھولا گیا۔ آخر شجاع کو اطلاع ملی کہ مرشد قلی خاں سخت بیمار اور کوئی دم کا مہمان ہے۔ پس وہ علی وردی خاں اور سب معتبر امرا کے ساتھ کٹک سے مرشد آباد روانہ ہوا۔ کبھی خشکی اور کبھی دریا سے گزرتا اور رات دن سفر کرتا رہا۔ جب یہ کٹک سے چلا تو اس نے اپنے بیٹے محمد تقی خاں کو اپنا نائب مقرر کیا جو کسی اور بیوی کے بطن سے تھا۔

شجاع صوبے دار ہو گیا

شجاع ابھی راستے ہی میں تھا کہ پرچہ لگا کہ مرشد قلی خاں فوت ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی صوبے داری کا فرمان دہلی سے پہنچ گیا۔ شجاع نے اس مقام کا نام مبارک منزل رکھا اور یلغار کرتا مرشد آباد جا پہنچا۔ ذرا دم لیے بغیر وہ چہل ستون میں جلوہ گر ہوا جو محل مرشد قلی خاں نے دربار کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ سب امرا کے سامنے شجاع نے فرمانِ شاہی پیش کیا جو حرف بہ حرف پڑھ کر سنایا گیا۔ اس کے بعد وہ مسند نشین ہوا۔ شادیانے بجنے لگے، امرا نے نذریں پیش کیں اور مبارک باد کی صدا بلند ہوئی۔ اس وقت سرافراز خاں شہر سے دو میل کے فاصلے پر بے خبر پڑا سوتا تھا۔ نقارے کی آواز سن کر اس کی آنکھیں کھلیں۔ اس کے حامی مددگار بھی پہنچ گئے اور انھوں نے اسے صلاح دی کہ شاہی فرمان شجاع کے پاس ہے لوگوں نے اطاعت کر لی ہے، مسند پر قبضہ ہو چکا ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ اطاعت کی جائے۔ سرافراز خاں اپنی اردل کو پیچھے

چھوڑ کر اور دو ایک ملازم ساتھ لے کر مرشد آباد میں حاضر ہوا۔ شجاع کے قدم لیے، نذر پیش کی اور مبارک باد عرض کی۔

شجاع کا طرزِ حکومت

شجاع کا بڑا مشیر علی وردی خاں تھا۔ اس کے علاوہ اس نے حاجی احمد، رائے عالم چند اور جگت سیٹھ فتح چند کا ایک کابینہ بنایا جن کے مشورے سے حکومت کی جاتی تھی۔ یہ سب جہاں دیدہ، مدبر اور لوگوں میں ہر دل عزیز تھے۔ شجاع نے سرافراز خاں کو اپنا دیوانِ بنگالہ اور محمد تقی خاں پسرِ دیگر کو دیوانِ اڑیسہ مقرر کیا۔ سعید احمد فوج دار رنگ پور اور امین الدین خاں فوج دار راج محل مقرر ہوئے۔ جہاں گیر نگر (ڈھاکہ) کی فوج داری اپنے داماد مرشد قلی خاں بہادر رستم جنگ کو عطا کی۔ نوازش محمد خاں کو بخشی فوج مقرر کیا۔ مقدمات خود سماعت کرتا اور فیصلہ اسی وقت سنا دیتا تھا۔ جس میں کسی کی سفارش یا مشورے کو دخل نہ مل سکتا تھا۔ اس نے ان تمام زمین داروں کو رہا کر دیا جنھیں مرشد قلی خاں نے عدم ادائی مالیہ کی علت میں قید کر رکھا تھا۔ یہ باتیں ہیں جنھوں نے بنگالے کو ایسی خوش حالی عطا کی کہ چار دانگ عالم میں اس کی دھوم مچ گئی۔ ایک جملہ معترضہ کی اجازت چاہتا ہوں کہ حاجی احمد کے تین بیٹے تھے جن میں سے دو کی شادی علی وردی خاں کی دو لڑکیوں سے ہوئی تھی یعنی زین الدین کی امینہ بیگم سے اور نوازش محمد کی مہرالنسا بیگم المعروف گھسیٹی بیگم سے۔ اسی زین الدین اور امینہ کا لڑکا سراج الدولہ تھا۔

علی وردی خاں صوبے دار عظیم آباد (پٹنہ)

اسی عرصے میں فرخ الدولہ صوبے دار

عظیم آباد اپنے منصب سے معزول ہوا اور یہ صوبہ بھی شجاع کے سپرد کیا گیا۔ اب زینت النسا بیگم اور شجاع میں مصالحت ہو گئی تھی جس کا باعث سرافراز خاں کی سعادت مندی تھی۔ جب یہ حکم پہنچا تو شجاع نے سرافراز خاں کو صوبے دارِ عظیم آباد مقرر کرنا چاہا مگر بیگم نے بیٹے کی جُدائی برداشت نہ کی۔ شجاع نے دوسرے بیٹے محمد تقی خاں کو منتخب کیا مگر بیگم نے اس پر ناتجربے کاری کا الزام لگایا اور یہ تجویز بھی گر گئی تو قرعۂ فال علی وردی کے نام پڑا اور شجاع نے دہلی سفارش کی کہ علی وردی خاں کو بہادر، مہابت جنگ کا خطاب، پنج ہزاری منصب، پالکی، علم اور نقارہ عطا ہو۔ بیگم نے بھی اس انتخاب کو پسند کیا اور اس کی جانب سے الگ خلعت عطا ہوا۔

سراج الدولہ کی ولادت

صوبے داری عظیم آباد کے ملنے سے چند روز پیشتر ۱۷۱۹ء میں علی وردی خاں کا نواسہ زین الدین احمد خاں امینہ بیگم کے گھر پیدا ہوا۔ بچہ کیا تھا حُسن و جمال کا مجسمہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اپنی تمام صناعی اس پر ختم کر دی ہے۔ علی وردی خاں اس بچے کو دیکھ کر ایسا بشاش ہوا کہ اس پر سرور سا چھا گیا۔ اس نے بچے کو گود میں لیا اور اس کی پرورش اور تربیت اپنے ذمے لی۔ بچے کا نام مرزا محمد اور آیندہ خطاب سراج الدولہ ہوا جو اس کتاب کا موضوع ہے۔

صوبۂ بہار کی حکومت

علی وردی خاں نے عظیم آباد کو خستہ حال میں پایا۔ ہر ایک زمین دار خود سر تھا، خزانہ خالی، فوج نام کو نہیں۔ صوبے دار کے حکم کی کوئی پروا نہ کرتا تھا۔ اس لیے

ناقابلِ مقابلہ فوج جمع کی، زمین داروں کے کان کھینچے، مالیہ جمع کیا اور ایک سال کے عرصے میں وہی نقشہ بنا دیا جو مرشد آباد کا تھا۔ ایک سال کے بعد وہ مُرشد آباد گیا جہاں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ شجاع نے اس کے حُسنِ انتظام کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور خلعت کے ساتھ واپس بھیجا۔

شجاع کی وفات قریباً اسی وقت جب نادر شاہ نے حملہ کیا شجاع نے ۱۷۳۹ء میں وفات پائی اور صوبے کے گھر گھر میں کہرام مچ گیا۔ شجاع بڑی خوبیوں کا حاکم تھا اور بنگالہ اس کی وفات پر جس قدر بھی ماتم کرتا کم تھا۔

شجاع نے قبل از مرگ سرافراز خاں کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا اور اسے نصیحت کی تھی کہ وہ حاجی احمد، رائے عالم چند، جگت سیٹھ فتح چند کے مشورے سے حکومت کرے۔

شجاع گوناگوں محاسن کا مجموعہ تھا مگر اس کے ساتھ عیش پسند اور راحت طلب تھا۔ اس کی حُسن پرست طبیعت طوائفوں کے مجرے اور رقص و سرود کے لیے وقت ڈھونڈتی رہتی تھی۔ اس کا بیرونی طاقتوں کی طرف توجہ کرنا ایک الجھن پیدا کرتا تھا۔ اس لیے وہ ان کی طرف متوجہ نہ ہوا۔

(۳)

موتمن الملک علاء الدولہ نواب سرافراز خاں حیدر جنگ

(۱۷۳۹ - ۱۷۴۰)

شجاع الدولہ کے بعد سرافراز خاں علاء الدولہ کے لقب سے مسند نشین ہوا۔

علی وردی خاں کی سرکشی

علی وردی خاں ابتدا ہی سے سرافراز خاں سے بدظن چلا آتا تھا۔ اس لیے وہ سرافراز خاں اور اس کے احکام کی چنداں پروا نہ کرتا تھا اور یہ خیال اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا کہ سرافراز خاں برطرف کر کے خود مسند نشین ہو جائے۔ اسی ارادے کے پیشِ نظر اس نے سرحد پر فوج جمع کر رکھی تھی۔

کردار

سرافراز خاں ایک متقی پرہیزگار، سختی سے شرع کا پابند ضرور تھا مگر اس میں تدبر اور حکمت علمی مفقود تھی جو حکومت کے لوازمات میں ہے۔ وہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہتا اور امورِ ملکی میں بہت کم دل چسپی لیتا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس نے راے رایاں، عالم چند، جگت سیٹھ، فتح چند اور حاجی احمد کو کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ مگر اس نے امورِ حکومت حاجی لطف اللہ، مردان علی خاں اور میر مرتضیٰ خاں کے سپرد کر دیے۔ ان امرا کو حاجی احمد کی پارٹی سے دلی عناد تھا۔ یہ بھرے دربار میں حاجی احمد، جگت سیٹھ اور راے رایاں پر آوازے کستے اور پھبتیاں کہتے، جسے کوئی برداشت نہ کر سکتا تھا اور سرافراز خاں ان سب باتوں کو سنی اَن سنی کر جاتا تھا۔ بلکہ کئی دفعہ خود بھی حاجی احمد کو دیوث اور دلال کہہ جاتا تھا کیوں کہ حاجی احمد پر یہ تہمت لگائی جاتی تھی کہ وہ مرحوم نواب شجاع کو عورتیں مہیا کیا کرتا تھا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حاجی پارٹی سرافراز خاں کی جان کی دشمن ہو گئی۔ ادھر سرافراز خاں نے کہ وہ میر مرتضیٰ خاں کی پارٹی کے ہاتھوں کھیل رہا تھا، اب یہ غضب کیا کہ حاجی احمد کو دیوان کے عہدے سے برطرف کر کے یہ عہدہ میر مرتضیٰ خاں کو دے دیا۔ حالاں کہ حاجی احمد شجاع کے زمانے سے فرائض نہایت

خوش اسلوبی سے بجالا رہا تھا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ سرافراز خاں نے حاجی احمد کے داماد عطا اللہ خاں کو جو راج محل کا فوج دار تھا معزول کر کے اپنے ایک عزیز حسین محمد خاں کو اس عہدے پر مقرر کیا۔ حاجی احمد ہر بات کی خبر اپنے بھائی علی وردی خاں کو پہنچا دیتا تھا۔ علی وردی نے ریاکاری سے کام لے کر او۔ خیر خواہ کے لباس میں سرافراز خاں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنی فوج کم کرے، خرچ میں بھی کفایت سے کام لے۔ ان سب باتوں کو سرافراز خاں نے قبول کر لیا مگر اس کے ساتھ ہی منوچہر خاں کی اس تجویز پر بھی صاد کر دیا کہ جب زین الدین، احمد خاں اور سید احمد مرشد آباد آئیں تو انھیں گرفتار کر کے قید کر دیا جائے۔ پھر یہی بات حاجی کو بتا دی۔ اس حرکت سے حاجی کی تالیفِ قلب مقصود تھی مگر اس کے بعد جب دربار میں یہ خبر ملی کہ عطا اللہ خاں اپنی بیٹی یعنی حاجی احمد کی نواسی کی شادی زین الدین کے بیٹے مرزا محمد سے کر رہا ہے تو وہ جامے سے باہر ہوگیا اور حکم دیا کہ اس منگنی کو منسوخ کر دیا جائے کیوں کہ وہ خود اپنے بیٹے کی شادی اس لڑکی سے کرنی چاہتا تھا۔ پھر اس نے یہ حکم دیا کہ عظیم آباد کے خزانے کا جائزہ لیا جائے اور پڑتال کی جائے کہ سرکاری روپیہ کس مصرف میں لگایا گیا ہے۔ وہ افواج بھی واپس بلائی گئیں جو شجاع نے علی وردی کے ساتھ عظیم آباد بھیجی تھیں۔

علی وردی خاں نے خیال کیا کہ اب پیمانہ لبریز ہوچکا ہے اور ریاکاری کا وقت نہیں رہا۔ پس دہلی کے ایک امیر موتمن الدولہ اسحاق خاں کو خط لکھا کہ وہ محمد شاہ سے جس کے وہ بہت منھ لگا تھا، تین صوبوں کی صوبے داری کی سند اس کے حق میں جاری کرائے۔ پس دربار میں ایک

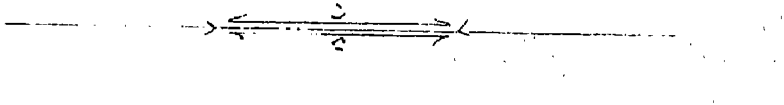
کروڑ ڈیڑھ نذرانہ، سرافراز خاں کا مال و دولت علاوہ سالانہ خراج کے پیش کروں گا۔ نیز سرافراز خاں پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی۔ سرافراز خاں کا ایک جُرم یہ بنایا گیا کہ اس نے اپنے نام پر سِکّہ چلایا تھا۔ خط روانہ کر کے علی وردی خاں نے بوجھپور میں چھاؤنی ڈالی اور دہلی کی سند کا انتظار کرنے لگا۔ نادر کی مراجعت کو دس ماہ اور شجاع کی وفات کو تیرہ مہینے گزر چکے تھے۔ جب متوقّع سند علی وردی خاں کے حسب مرضی موصول ہوئی۔ اب عظیم آباد کو زین الدین احمد کے سپرد کیا اور بوجھپور سے نکل کر تالاب وارث خاں پر ڈیرے ڈالے۔ وہاں سے مُرشد آباد کا رُخ کیا۔ جب قریب پہنچا تو سرافراز خاں کو خبر ملی اس نے حاجی احمد خاں کو مامور کیا کہ وہ جا کر علی وردی خاں کو راہ راست پر لائے اور اسے واپس جانے پر آمادہ کرے۔ اس کے علاوہ سرافراز خاں نے سنت خاں خواجہ سرا اور شجاع قلی خاں صوبے دار ہگلی کو گفت و شنید کے لیے علی وردی کے پاس بھیجا۔ وہاں سے وہ حکیم محمد علی خاں کو ہمراہ لے کر واپس آئے اور عرض کیا کہ علی وردی خاں بالکل مطیع و فرماں بردار رہے گا۔ تائید میں اس کی ایک عرضی پیش کی جس میں لکھا تھا کہ وہ سرافراز خاں کے خاندان کا نمک پروردہ غلام ہے اور کسی قسم کی گستاخی کرنی نہیں چاہتا صرف دو درخواستیں ہیں: اوّل یہ کہ مردان علی خاں، میر مرتضیٰ خاں، حاجی لطف علی خاں اور محمد غوث کو برطرف کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ استدعا پسند خاطر نہ ہو تو سرکار محل کو واپس تشریف لے جائیں اور ان امرا کو میرے ساتھ لڑنے کا حکم دیں۔ اگر وہ فتح یاب ہو گئے تو قصّہ ختم ہو گیا، اگر انھیں شکست ہو تو میرا سر حضور کی قدم بوسی کو حاضر ہے۔

مگر یہ امرا سرافراز خاں کے دل و دماغ پر مسلط تھے۔ ایسی درخواست کس طرح منظور ہو سکتی تھی۔ کچھ دن نامہ و پیام ہوتے رہے مگر علی وردی خاں وہی بات دہراتا رہا جو وہ پہلے لکھ چکا تھا۔ آخر یہ مقام گھریا جنگ ہوئی جس میں صوبے کے بہترین ماہرانِ سپاہ گری نے حصہ لیا اور دادِ شجاعت دی۔ نند لال اور محمد غوث خاں جیسے بہادر جرنیل مارے گئے۔ سرافراز خاں بھی ایک گولی کا شکار ہوا۔ صاحبِ سیر المتاخرین کہتے ہیں کہ اس معرکے میں سرافراز خاں کے ایک ایک آدمی نے بے نظیر وفا شعاری اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ مگر موزمرار کا بیان ہے کہ "اس کے سپاہی خریدے جا چکے تھے اور نواب کے پاس صرف ایک جرنیل پانچو پرتگیزی تھا جو فوج لے کر مقابلے کو نکلا۔ نواب نے کمال بے نیازی سے آغازِ جنگ کے وقت نماز ادا کی، قرآن کی تلاوت کی اور قرآن کو گود میں رکھ کر کمان اٹھائی۔ جنگ کے دوسرے دن اس کے داماد مرشد قلی خاں قلی اور حسین محمد خاں بھی ٹڈی دل لشکر لے کر پہنچے مگر چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں"۔

سرافراز خاں نے ۱۷۴۰ء میں وفات پائی اور مرشد آباد میں دفن ہوا۔

بے گناہ سرافراز خاں کی موت بھی شہادت کے قریب پہنچتی ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ سرافراز خاں اور سراج الدولہ کی حکومت کا عرصہ یکساں ہے تو اس میں قدرت کے انتقام کی جھلک نظر آتی ہے۔ سرافراز خاں کی دین داری اور پرہیزگاری اس درجے کی تھی کہ اگر وہ عرش کا باشندہ ہوتا تو اسے ممتاز درجہ ملتا مگر زمین کے رہنے والوں پر قابو پانے کے لیے پنجۂ فولاد کی ضرورت

ہے۔ وہ اورنگ زیب جیسا درویش تو ضرور تھا مگر اس جیسا صاحبِ شمشیر اور ماہرِ تدبیر نہ تھا اور اس کی زندگی سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ جہاں بانی کے لیے صرف اخلاق کی بلندی کافی نہیں بلکہ بازو میں بل کی بھی ضرورت ہے۔



باب چہارم

نواب شجاع الملک حسام الدولہ محمد علی وردی خاں بہادر مہابت جنگ

(۱۷۴۰ ۔ ۱۷۵۶)

سرافراز خاں کے قتل کا داغ پیشانی پر لے کر محمد علی وردی خاں بڑے بڑے تزک و احتشام سے مرشد آباد میں داخل ہوا۔ خونِ بے گناہ تو اس سے ہوا تھا۔ اس نے اس کا اعتراف اور تلافی کی بھی کوشش کی۔ شہر میں داخل ہو کر وہ سیدھا زینت النسا بیگم والدۂ سرافراز خاں کی ڈیوڑھی پر حاضر ہوا۔ وہ اس طرح مؤدب ہاتھ باندھے کھڑا ہوا گویا بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو۔ آداب کے لیے اتنا جھکا کہ سجدۂ زمیں بوس کی حد تک جا پہنچا اور دردناک آواز میں اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور خواہانِ عفو ہوا اور عرض کیا کہ "قسمت کا لکھا پورا ہوا۔ اس بدقسمت خادم کی رُوسیاہی صفحۂ عالم پر ابداً ثبت ہو گئی لیکن میں اللہ کو حاضر و ناظر سمجھ کر اقرار کرتا ہوں کہ آیندہ اطاعت و فرماں برداری میں کبھی فرق نہ آنے دوں گا۔ اُمید ہو کہ حضور والا اس بدنصیب غلام کی سیاہ کاری کو کچھ عرصے بعد اپنے دل سے دُور فرما دیں گی اور میری خدمات کو پسند فرمائیں گی۔"



شجاع الملک حشمت الدوله نواب
علی وردی خان مهابت جنگ

بیگم نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور علی وردی خاں واپس آکر چہل ستون میں مسند نشین ہوا۔ شادیانے بجے، نذریں پیش ہوئیں۔ مرشد آباد کے رؤسا نے اظہارِ اطاعت کیا مگر یہ صرف دکھاوا تھا اور ان کے دل سرفراز خاں کے ماتم میں محو تھے۔ اس کی نمک حرامی اور بے وفائی پر جو اس نے اپنے خداوند زادہ سے کی، سب اندر ہی اندر لعن طعن کر رہے تھے۔ لیکن جب حالات روشنی میں آئے تو معلوم ہوا کہ علی وردی خاں اتنا گنہ گار نہیں جتنا خیال کیا جاتا ہے اور اس کی حکومت تو آیۂ رحمت ثابت ہوئی۔

تالیفِ قلوب

علی وردی خاں کو حکم رانی کا گراں قدر تجربہ تھا اس لیے اس کے طرزِ حکومت نے جلد لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا اور اس کے سیاہ اعمال کا واحد ورق قصۂ ماضی ہو گیا۔ اس کا اخلاق، شیریں کلامی، کشادہ دلی ایسی چیزیں تھیں کہ انھیں دیکھ کر بیگانے بھی اپنے ہو جاتے ہیں۔ غرض اس نے رعیت کو اپنا فریفتہ بنا لیا مجموعی طور پر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گو سرافراز خاں کا قتل ایک ناقابل فراموش سیاہ کاری تھی لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ سرافراز خاں حکومت کا اہل نہ تھا۔ اگر اس کی حکومت کچھ دن اور رہتی تو نہ وہ رہتا نہ حکومت رہتی۔ مرہٹوں کا ایک مدت سے اس زرخیز اور متمول صوبے پر دانت تھا اس لیے انھوں نے چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ مگر ان ڈاکوؤں کو علی وردی خاں جیسے شخص سے پالا پڑا اور وہ شکست پہ شکست کھاتے رہے اور رعیت کو برائے نام بھی گزند نہ پہنچا۔ مرہٹوں کو رد کرنے میں علی وردی خاں کی کرشمہ کاریاں ایسی ہیں کہ سرافراز خاں سے ان کی توقع نہیں ہو سکتی۔

علی وردی خاں نے ہرسہ مشرقی صوبوں اور سرافراز خاں کی کروڑوں روپے کی جائداد پر قبضہ کر کے انتظام ملک کی طرف توجہ کی۔ انھی ایام میں اسے دہلی سے خطابات، ہفت ہزاری کا منصب اور اس کے تمام رشتے داروں کو بھی بہت بلند اور باوقار خطابات سے نوازا گیا۔ چناں چہ مرزا محمد کو "سراج الدولہ شاہ قلی خاں بہادر کا خطاب اور جہاں گیر نگر (ڈھاکہ) کا امیر بحر مقرر کیا گیا اور اس کے بھائی فضل قلی کو "اکرام الدولہ بادشاہ قلی خاں" کا خطاب عطا ہوا، جسے نوازش محمد خاں نے جو لاولد تھا اپنا بیٹا بنایا تھا جس طرح علی وردی نے میرزا محمد کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ اب حکومت کی مشین نہایت خوش اسلوبی سے چلنے لگی۔

میرزا باقر اور مرشد قلی خاں کی بغاوت

مرشد قلی خاں رستم جنگ تخلص سرشار صوبے دار اڑیسہ کے متعلق کچھ متوحش خبریں آنی شروع ہوئیں۔ علی وردی خاں نے اس پر حملے کے لیے فوج تیار کر دی۔ یہ شجاع الدولہ کا داماد تھا۔ عطایار خاں ایک فہمیدہ امیر نے بیچ میں آکر مصالحت کرائی تھی مگر یہ عہد نامہ ابھی تکمیل کو نہ پہنچا تھا کہ مرشد قلی خاں کے داماد مرزا باقر خاں اصفہانی نے اپنی خوش دامن سے سازش کر کے مرشد قلی خاں کو مجبور کیا کہ وہ سرافراز خاں کے انتقام میں علی وردی خاں پر حملہ آور ہو۔ ان دونوں کی باتوں اور طعن و تشنیع کی تاب نہ لا کر مرشد قلی خاں نے عہد نامے کی تکمیل نہ کی اور علی وردی خاں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ علی وردی خاں نے ۱۲ ہزار کار آزمودہ سپاہیوں کے ساتھ کٹک کی طرف کوچ کیا۔ اُدھر سرافراز خاں کے انتقام کے نام پر نقارے پر چوٹ پڑی۔ مرشد قلی خاں مرزا باقر

اور ان کا سپہ سالار عابد علی خاں بھی کٹک سے نکل کر باسر اور مدنی پور ہوتے ہوئے موضع بھلوار میں علی وردی خاں کا انتظار کرنے لگے ۔ آخر اس مقام پر خوں فشانی شروع ہوئی ۔ عابد علی خاں، مصطفا خاں کے ذریعے معہ اپنی فوج کے علی وردی خاں کے ساتھ مل گیا اور لڑائی سے دست کش ہوگیا۔ مگر مرشد قلی خاں کی فوج نے حوصلہ نہ ہارا۔ یہاں تک کہ مرزا باقر مجروح ہوگیا اور صف بندی میں فرق پڑ گیا۔ مرشد قلی خاں نے مراجعت کی اور باسر بندر میں پناہ لی ۔ ساحل پر اس کے ایک دوست کا جہاز کھڑا تھا، مرشد قلی خاں اور مرزا باقر اس میں سوار ہو گئے اور ایک ہفتے کے اندر مچھلی بندر پہنچ گئے ۔ مگر اس کے عیال اور مال و متاع پیچھے رہ گئے ۔

ان کو حفاظت سے لانے کے لیے باقر خاں کو روانہ کرنا پڑا ۔ خوش قسمتی سے مرشد قلی خاں کے ایک پرانے حلیف راجا رانی پور نے اس کی شکست کی خبر سن کر بہت سی گاڑیاں اور محافظ فوج کٹک بھیجیں۔ کہ مرشد قلی خاں کا سامان جو کچھ وہاں ہو اسے حفاظت سے اٹھا لائیں۔ اس مہم کی قیادت راجا نے اپنے ایک معتبر اہل کار محمد مراد کے سپرد کی اور اس نے مرشد قلی خاں کے عیال، خزانہ اور اثاث البیت کو رنجا پور پہنچا دیا اور مرشد قلی خاں کے حکم کا انتظار کرنے لگا۔ اس علاقے کا حاکم انور الدین خاطر تواضع میں مبالغے کی حد تک پہنچ گیا۔ اسی عرصے میں مرزا باقر آگیا اور سب کو بہ خیریت پاکر خوش ہوا۔ اس نے اپنی خوش دامن کو خسر کے پاس بھیج دیا۔ بعد میں آپ بھی چلا گیا۔ یہ قافلہ اب نواب نظام الملک کی حدود میں داخل ہو گیا۔ ادھر علی وردی خاں نے سارے

اُڑیسہ پر تسلط جما لیا اور کٹک پہنچ کر سعید احمد کو اُڑیسہ کا صوبے دار مقرر کیا اور خود مُرشد آباد واپس چلا گیا۔

سراج الدولہ کی تربیت

مرزا محمد پر علی وردی خاں کی پوری توجہ مبذول رہتی تھی اور وہ اسے ذرا بھی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کی تعلیم کے لیے ہر فن کے ماہر مقرر تھے اور امورِ جہاں بانی اسے علی وردی خاں اور اس کی بیگم نوروزی بانو خود سکھاتے رہتے تھے۔ غرض اندر باہر صبح شام سراج الدولہ دونوں کے زیرِ نظر رہتا تھا۔ پھر بھی اسے ایسا وقت نہ ملا جسے خلوت کہہ سکیں۔ اس پر ان اتہام گروں کی دیدہ دلیری ملاحظہ ہو جو اسے جاہل نا تربیت یافتہ بدمعاش تو ظاہر کرتے ہیں مگر اس کی وجوہ مطلق نہیں بتاتے۔

سرافراز خاں کا کنبہ

مقتول نواب سرافراز خاں کے خاندان کی خدمت نوازش محمد خاں کے سپرد کی۔ نفیسہ بیگم بیوہ سرافراز خاں کو اپنی والدہ تسلیم کیا۔ محل کے جملہ انتظامات نفیسہ بیگم کے حوالے کیے گئے اور وہ سیاہ و سفید کی مالک ہو گئی۔ مگر کیا مجال جو نوازش محمد کبھی نفیسہ بیگم کے کمرے میں گیا ہو یا وہ کبھی نوازش محمد کے سامنے ہوئی ہو۔ مرشد قلی خاں مرحوم کا خاص تعلق بھی اسے دیا گیا۔ نوازش محمد خاں اور علی وردی خاں آداب و احترام میں کوئی فروگذاشت نہ کرتے۔ پردے کے باہر جھک جھک آداب بجا لاتے اور ماجرا نہ لہجے میں بات چیت کرتے اور جب تک وہ بیٹھنے کی اجازت نہ دیتی کھڑے رہتے تھے۔

اتفاق سے جس دن سرافراز خاں فوت ہوا اسی روز اس کی ایک مدخولہ سے لڑکا پیدا ہوا۔ اسے نفیسہ بیگم نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ اس کی

حقیقی بیٹے کی طرح خاطر و داشت ہوتی تھی

کٹک میں بغاوت

علی وردی خاں نے مرشد قلی خاں کے امرا کو اپنے اپنے عہدے پر بحال رکھ کر دل جوئی کی کوشش کی مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ چھپے چھپے سازش کرتے رہے۔ اور مرشد آبادی حکام پر الزام لگا کر بے چینی پیدا کر دی۔ نیا صوبے دار صولت جنگ سعید احمد اس طوفان کو نہ سنبھال سکا اور عوام بگڑ گئے اور عام بغاوت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ یہ حالت اس طرح صورت پذیر ہوئی کہ صولت جنگ نے ان سپاہیوں کے الاؤنس کم کر دیے جو مرشد آباد سے آئے تھے۔ اسے ان سپاہیوں نے قبول نہ کیا اور ملازمت سے علاحدہ کیے گئے۔ کٹک کے سپاہیوں نے یہ کم تنخواہ منظور کر لی اور مرشد آبادی سپاہیوں کی جگہ کٹک کے سپاہیوں نے لے لی۔ ان کے علاوہ مرشد قلی خاں کے امرا نے سعید احمد کی ملازمت قبول نہ کی اور خانہ نشین ہو گئے۔ انھی ایام میں صولت جنگ سعید احمد کا ایک دوست شاہ یحییٰ نامی دکن سے آوارد ہوا اور اسے گمراہ کرنا شروع کیا۔ وہ لوگوں کی خوب صورت عورتوں کو پکڑ کر سعید احمد کے پاس لے جانے لگا۔ شہر میں ہلڑ مچ گیا اور لوگوں کی آہ و بکا آسمان کی خبر لانے لگی۔ لوگ صوبے دار کے خلاف ہو گئے، فوج بھی ان کے ساتھ مل گئی اور صولت جنگ کے ساتھ گنتی کے چند مرشد آبادی رہ گئے۔

میرزا باقر دکن میں سانپ کی طرح لوٹ رہا تھا۔ اپنی حکومت کی واپسی، فتح بنگالہ اور سرافراز خاں کا انتقام اس کے مقاصد حیات بن گئے تھے۔ وہ مرشد قلی کو اکسائے جاتا تھا مگر مرشد قلی خاں ایک تجربے کار

اور دوُر اندیش نواب تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس بار کے اٹھانے کے قابل اور مرزا باقر کی تجویز کو قابلِ عمل خیال نہ کرتا تھا۔ اس پر مرزا باقر نے اکیلے ہی ان مہمات کا بیڑا اٹھایا اور اہلِ کٹک سے خط وکتابت کر کے معقول فوج مرتب کی اور کٹک میں اس کے ممد و معاون پیدا ہونے لگے۔ اس کے نتیجے کے طور پر لوگوں نے بلوہ کر دیا۔ سعید احمد نے اپنے سپہ سالار گوجر خاں کو اس فتنے کے دبانے کا حکم دیا۔ اب برملا یہ مطالبہ ہونے لگا کہ حکومت کی عنان مُرشد قلی خاں یا مرزا باقر کو دی جائے۔ اس شورش کی باگ ڈور راجا راتی پور کے سردار محمد مُراد کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرے دن عوام نے گوجر خاں کو برسرِ بازار قتل کر دیا۔ ان حالات کو دو تین دن نہ گزرے تھے کہ مرزا باقر خود نمودار ہوا۔ سعید احمد کی فوج نے لڑنے سے انکار کر دیا اور قلعے کے دروازے کھول کر باغیوں سے جا ملے۔ مرزا باقر شہر کٹک میں داخل ہوا۔ قلعے پر قبضہ کر کے سعید احمد کو مع بال بچوں کے قید کیا، مسند نشین ہو گیا۔ جب علی وردی خاں کو یہ خبر پہنچی تو وہ تذبذب میں پڑ گیا اور اسے یہ خیال آیا کہ ممکن ہے نظام الملک اس بغاوت کی پُشت پر ہو، اس لیے بڑے غور و خوض کی ضرورت ہوئی۔ سعید احمد کے والد حاجی احمد اور اس کی والدہ کے ساتھ مشورے کیے۔ ان کی صلاح تھی کہ سعید احمد اور اس کے بچوں کی رہائی کے بدلے صوبہ اُڑیسہ مرزا باقر خاں کو دے دیا جائے۔ مگر یہ ایسا مشورہ تھا جس کا کوئی اثر علی وردی خاں پر نہ ہو سکتا تھا نہ ہوا۔ اسے اپنے سپہ سالار مصطفےٰ خاں ہی کی رائے پسند آئی کہ اس جھگڑے کا تصفیہ صرف تلوار کر سکتی ہے۔ اس نے مُرشد آباد نوازش محمد خاں کے حوالے کیا اور

۲۵ ہزار جوانوں کی فوج اور بہترین سپہ سالار ہمراہ لے کر اُڑیسہ کی طرف متوجہ ہوا۔ سپہ سالاروں کی عظمت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مرتبے کے لحاظ سے ان میں میر جعفر کا نواں درجہ تھا۔ سرحد پر پہنچ کر اس نے اعلان کیا کہ جو شخص اس کے برادر زادے کو آزاد کرا کے اس کے کیمپ میں لائے گا اسے ایک لاکھ روپیہ انعام دیا جائے گا۔ یہ پہلی جنگ تھی جس میں مرزا محمد (سراج الدولہ) اشرف النسا بیگم کی نگرانی میں حصہ لیا۔ شدید اور خوں ریز جنگ میں مرزا باقر شکست کھا کر بھاگ گیا۔ سعید احمد اور اس کا کنبہ آزاد ہو کر مرشدآباد روانہ ہوئے اور انتظام کی چول ٹھیک کرنے کے بعد علی وردی خاں شکار کھیلتا ہوا مرشد آباد کو راہی ہوا۔

مرہٹوں کی یورش

مرہٹے تمام ہندستان پر اپنی چوتھ کا حق قائم کیے جاتے تھے۔ جا بجا شکست کھائی مگر اس سے ان کی غارت گری میں کوئی فرق نہ پڑا اور ہندستان کا گوشہ گوشہ ان کے حملوں کی آماج گاہ بن گیا۔ انھیں مُلک گیری کی چنداں خواہش نہ تھی۔ وہ بڑی بڑی فوجیں ساتھ لے کر آتے، لوٹ مار کر کے مُلک کو تباہ کرتے اور پھر چوتھ وصول کر کے واپس چلے جاتے تھے۔ مرہٹوں کی سرگرمیوں کو فرقہ وارانہ اقدام سے منسوب کرنا محض بعد کی پیداوار ہے۔ جس سے مقصود فرقہ وارانہ جذبات اُبھارنا ہے۔ ان کے کئی مسلمان حکومتوں سے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ ان کی فوج میں ہزاروں مسلمان سپاہی اور سیکڑوں مسلمان افسر تھے۔ بلکہ میر حبیب تو مرہٹوں کی فوج میں صرف پیشوا سے دوسرے نمبر پر تھا۔ مرہٹوں کی شوکت تشنہ رہ جاتی اگر وہ بنگال جیسے زرخیز خطے کی طرف توجہ نہ کرتے۔

اچانک علی وردی خاں کے حضور پرچہ لگا کہ راگھوجی بھونسلے نے ۳۰ ہزار سپاہیوں کا جرار لشکر اپنے پردھان پنڈت بھاسکر کے تحت فتح بنگال کے لیے روانہ کیا ہے اور چند دنوں میں وہ پہنچا چاہتے ہیں۔ علی وردی خاں نے کوئی پروانہ کی اور مرہٹوں کا ٹڈی دل لشکر ایکا ایک میدناپور میں نمودار ہوا۔ باخبر حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ مرہٹوں نے یہ حملہ نظام الملک کی انگیخت پر کیا۔ ممکن ہے کہ یہ محض قیاس آرائی ہو مگر اس میں شک نہیں کہ اس کی تحریک سلطنت مغلیہ کے انحطاط سے ہوئی۔ جب یہ خبر ملی اس وقت علی وردی خاں مبارک منزل میں شکار سے دل بہلا رہا تھا۔ جتنی بھی فوج موجود تھی اسے ہمراہ لے کر وہ بردوان کو چل پڑا۔ مقابلہ ہوا تو بھاسکر کو قدر عافیت معلوم ہوئی اور اسے پتا چلا کہ علی وردی خاں سے ٹکر لینا کھیل نہیں۔ بھاسکر پنڈت نے دو لاکھ روپے ادا ہونے پر واپس چلے جانے کی پیش کش کی مگر علی وردی خاں نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا اور بالآخر لڑائی شروع ہوئی۔ اس جنگ میں مشکل یہ آپڑی کہ بنگالی فوج کے افغانوں نے زیادہ تر اس وجہ سے سرکشی کی کہ ان کے ایک نامور سردار روشن خاں کو زین الدین احمد خاں صوبے دار عظیم آباد نے قتل کرا دیا تھا۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ راجا مور بھنج جسے مصطفا خاں اپنی ذمے داری پر دربار میں لایا تھا، میر جعفر کے ذریعے قتل کیا گیا اور مصطفا خاں نے اس پر رنج اور غصے کا اظہار کیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میر حبیب مرہٹوں سے جا ملا اور انھی کا ہو گیا اور مرہٹوں نے اعلان کیا کہ ناظم کی فوج کا جو آدمی ان کے ساتھ آ ملے گا اس کی نہ صرف جان بخشی کی جائے گی بلکہ اس کا عہدہ بحال

رکھا جائے گا۔ جب حالت بد سے بدترین کی حد تک پہنچ گئی تو علی وردی خاں آدھی رات کے وقت عرف مرزا محمد سراج الدولہ کو ساتھ لے کر مصطفا خاں کے خیمے میں جا نکلا۔ وہاں اسے جگایا اور کہا کہ ایک ضروری بات سن لو۔ سپہ سالار یہ دیکھ کر مبہوت سا ہو گیا اور کہا کہ فرمائیے کیا حکم ہے۔ علی وردی خاں نے کہا کہ اگر تمہارا غصہ میری جان لینے سے اتر سکتا ہے تو میں اور میری جان سے عزیز سراج الدولہ حاضر ہیں۔ اٹھو اور ہمیں قتل کر دو۔ اور اگر میری محبت ہنوز تمہارے دل میں ہے تو تلوار اٹھاؤ اور مرہٹوں کے ریوڑ کو نکال باہر کرو۔ سپہ سالار علی وردی خاں کی گفتگو اور شجاعت پر ششدر رہ گیا۔ اس نے شمشیر خاں اور سردار خاں سرداروں کو بلوایا اور علی وردی خاں نے پھر وہی بات کہی اور وہ کچھ کہہ نہ سکے۔ اور بعد میں معاملہ مصطفا خاں کے سپرد کر دیا۔ مصطفا خاں نے کہا کہ میری جان و مال علی وردی خاں اور اس کی اولاد کے قدموں پر ہے۔ اس پر دعائے خیر مانگی گئی اور یہ قصہ ختم ہو گیا۔ دن چڑھا تو گھمسان کا رن پڑا اور افغانوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیے اور مرہٹے پیچھے ہٹنے لگے۔ بنگالی کٹوے میں پہنچے تو ان کی رسد ختم ہو گئی اور تین دن کچھ کھانے کو نہ ملا۔ آخر شکر پاروں کی بوریاں پہنچیں تو بنگالی فوج کو کچھ آذوقہ میسر ہوا۔ ورنہ کیا جرنل کیا سپاہی بھوکوں مر رہے تھے۔ مصطفا خاں نے ایک ولولہ انگیز تقریر سے فوج میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس پر بنگالی فوج نے مرہٹوں پر حملہ کر دیا جو اشنان اور پوجا پاٹ میں مشغول تھے۔ مرہٹے مصطفا خاں کے اس حملے کی تاب نہ لا سکے۔ بہت سے مارے گئے اور باقی پسپا ہوئے۔ بنگالی فوج

کو خوراک کا بے شمار سامان ملا۔ صبح ہوئی تو مرہٹوں نے ایک تیز گام حملہ کیا۔ بنگالی فوج پسپائی کا ارادہ کر رہی تھی کہ ایک عجیب واقعے نے جنگ کا رنگ بدل دیا۔

ایک عجیب واقعہ

میدانِ جنگ میں رواج کے مطابق علی وردی خاں کے ہاتھی کے آگے دو ہاتھی ہوا کرتے تھے جن پہ نقارہ اور علم ہوتا تھا۔ کوچ میں بھی یہ ہاتھی صوبے دار کے جلوس کے آگے چلتے تھے۔ ان کی سونڈوں پر ایک زنجیر بندھی ہوتی تھی جس میں بڑے بڑے گھنگرو ہوتے تھے۔ یہ زنجیر ۲۰ فٹ لمبی اور ۳ من وزن میں ہوتی تھی۔ ان ہاتھیوں نے اجنبیوں کو اِرد گرد دیکھ کر زنجیر اِدھر اُدھر گھمانی شروع کردی اور اس حملے نے دشمن کے کئی سپاہی اور گھوڑے مار دیے۔ مرہٹوں کو کچھ پیچھے ہٹنا پڑا اور علی وردی خاں کو جو مرہٹوں میں گھر گیا تھا کمک پہنچ گئی اور اس کی اور سراج الدولہ کی جان بچ گئی۔ فوج پھر نئے سرے منظم ہو کر حملہ آور ہوئی اور بڑی خوں افشانی کے بعد مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ کٹوے میں پہنچے تو اسے اُجڑا نگر پایا۔ خوراک کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ مرہٹے کچھ ساتھ لے گئے اور جو نہ لے جا سکے اسے جلا دیا۔ علی وردی خاں نے مُرشد آباد سے خوراک کا سامان اور کمک طلب کی۔ یہ اطلاع مرشد آباد پہنچی تو سب نے اطمینان کا سانس لیا اور مسجدوں اور مندروں میں شکرانے ادا کیے گئے۔ مرشد آباد سے سعید احمد خاں بڑا ساز و سامان اور خوراک لے کر پہنچا۔ اِرد گرد کے سوداگروں نے بھی غلّے کے ہزاروں چھکڑے حاضر کر دیے۔

مرہٹوں کی پس پائی

پنڈت بھاسکر نے بنگالی فوج کا یہ عالم دیکھ کر

لوٹ جانے کا ارادہ کیا۔ مگر میر حبیب نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ میر حبیب ایک ایرانی آوارہ گرد اور جاہل مگر منچلا سپاہی تھا۔ جنگ بند کرنا اسے گوارا نہ تھا۔ اس نے یہ مشورہ دیا کہ علی وردی خاں کو کٹوے میں پڑا رہنے دو اور چپکے سے مرشد آباد کو نکل چلو جہاں صرف جگت سیٹھ سے لاکھوں روپے مل جائیں گے اور سارے نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔ اس پر میر حبیب نے فوج لے کر مرشد آباد کا رخ کیا، علی وردی خاں کو خبر ملی تو وہ بھی مرشد آباد کو روانہ ہوا۔ مگر میر حبیب یلغار کرتا علی وردی خاں سے ایک دن پہلے پہنچ گیا۔ جگت سیٹھ کے محل سے ۳ لاکھ روپیہ[1] نقد اور لاکھوں روپے کا سامان اٹھالے گیا اور دارالخلافہ کے اور حصّوں کو بھی تاراج کیا۔ کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اتنے میں علی وردی خاں کے جلد پہنچ جانے کی اطلاع ملی اور میر حبیب مرشد آباد سے بھاگ گیا۔ اس وقت برسات شروع ہو جانے کے باعث بھاسکر نے واپس چلے جانا مناسب خیال کیا۔ میر حبیب بھی پہنچ گیا اور انھوں نے قلعۂ ہگلی کو محصور کر لیا۔ میر حبیب نے قلعے دار کو چالاکی سے گرفتار کر لیا اور ہگلی پر مرہٹوں کا پرچم لہرانے لگا۔ اب مرہٹوں نے ادھر ادھر لوٹ مار شروع کی۔ علی وردی خاں برسات کے باعث پہنچ نہ سکتا تھا اس لیے مرہٹوں کے لیے میدان خالی تھا اور مرہٹوں نے بردوان، میدناپور اور پاسر پر تسلط جما لیا۔ یہاں تک کہ مرشد آباد اور گنگا کے کنارے کچھ علاقے کے علاوہ علی وردی خاں کا کوئی علاقہ محفوظ نہ رہا۔ بہت سے لوگ ڈر کے مارے مرشد آباد سے ہجرت کر گئے اور

---

[1] سیر المتاخرین فارسی جلد دوم صفحہ ۵۱۳ پر ۳ لاکھ درج ہے اور انگریزی ایڈیشن جلد اوّل صفحہ ۳۹۳ میں دو کروڑ لکھا ہے۔

دور دراز شہروں میں جا آباد ہوئے۔ علی وردی خاں ہمہ تن فوج کی تنظیم میں مشغول ہو گیا اور چاروں طرف سے فوج مرشد آباد میں جمع ہونے لگی۔ اس نے شہنشاہ دہلی کو صورت حال سے مطلع کیا اور مدد مانگی۔ بادشاہ نے ابوالمنصور خاں صوبے دار اودھ کو حکم دیا کہ وہ بنگال میں جاکر مدد دے اور ساتھ بالاجی راؤ کو لکھا کہ وہ علی وردی خاں کو بھاسکر پنڈت سے نجات دلائے۔ ابھی یہ کمک منزلوں دور تھی کہ علی وردی خاں کی فوج کیل کانٹے سے درست ہو گئی۔ برسات کی شدت بھی کم ہوئی تو علی وردی خاں مرشد آباد سے مرہٹوں کے استقبال کے لیے روانہ ہوا اور کٹوے کے قریب ایک مقام پر دونوں فوجیں بھاگرتی کے کناروں پر جمع ہوئیں اور اکتیس دن تک گولہ باری ہوتی رہی۔ بڑے گھمسان کی جنگ کے بعد مرہٹوں کے قدم اُکھڑ گئے اور وہ میدان سے بھاگ گئے۔ انھوں نے ہگلی بردوان کے اضلاع خالی کر دیے۔ اس پر بھی علی وردی خاں نے تعاقب جاری رکھا اور بھاسکر کا اپنی حدود میں داخل ہونا مشکل ہو گیا۔ بھاسکر عنانِ سپہ داری میر حبیب کے حوالے کر کے واپس چلا گیا اور میر حبیب نے میدنا پور کا رُخ کیا۔ اس نے ہری پور کے فوج دار شاہ معصوم کو قتل کیا اور یہ علاقہ دبا بیٹھا۔ علی وردی خاں یہ خبر سنتے ہی میدنا پور کی طرف متوجہ ہوا۔ خوں ریز لڑائی ہوئی، جس میں مرہٹوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ انھوں نے بھاگنے کی ٹھہرائی اور پیچھے ہٹتے ہٹتے اُڑیسہ اور دکن کے ڈانڈے تک پہنچ گئے۔ علی وردی خاں نے جھیل چلکا تک تعاقب کیا اور پھر کٹوے چلا آیا، جہاں اس نے شاہ معصوم کی وفاداری اور بہادری کے صلے میں اس کے خاندان کو مالا مال کر دیا۔ مصطفےٰ خاں

کے ایک عزیز کو شاہ معصوم کا عہدہ ملا اور راجا جانکی رام کا بیٹا راجا دلب رام اس کا پیش کار مقرر ہوا۔

صوبے دار اودھ اور بالاجی

منصور الملک خاں راستے ہی میں تھا کہ اسے علی وردی خاں کی کامیابی کی خبر ملی اور وہ واپس چلا گیا۔ اتنے میں خبر آئی کہ بالاجی راؤ شہنشاہ کے حکم کے مطابق آرہا ہے اور مرشد آباد سے پانچ روز کے راستے پر ہے۔ علی وردی خاں نے اسے راستے ہی میں جا لیا تاکہ وہ شہر میں داخل ہو کر نذرانہ نہ طلب کرے۔ اسی عرصے میں علی وردی خاں کی فتح یابی کی خبر دربار میں پہنچی۔ بادشاہ نے اظہار خوشنودی فرمایا۔ حسام الملک کا خطاب، تلوار اور خنجر مرصع، سروپا، جغہ، موتیوں کی مالا، بلکہ اپنا پوشیدنی لباس مرحمت کیا۔ مرشد آباد کے اہل دربار پر بھی انعام اکرام کی بارش ہوئی۔ بادشاہ کا اپنا پوشیدنی لباس عطا کرنا غایت درجے کی عنایت کا مظہر ہوتا تھا۔

بالاجی راؤ خوب جانتا تھا کہ بغیر لوٹ مار کے فوج آرام سے نہ بیٹھے گی۔ وہ داؤد پور سے نکلا اور عظیم آباد کے عقب میں ٹکاری اور گیا پر جا دھم لیا اور منگیر اور بھاگل پور کو لوٹتا کھسوٹتا ہوا بڑھتے گیا۔ بہت سے لوگ بھاگ گئے۔ ایک مشہور سپہ سالار غوث خاں کی بیوہ نے مٹھی بھر رشتے داروں کے ساتھ مرہٹوں کا مقابلہ کرنا چاہا، مگر وہ اس آگ میں کودنے پر رضامند نہ ہوئے تو اس نے فقط عزت و حرمت کے لیے محل کے دروازے بند کیے اور دس بیس وفادار سپاہیوں کے ساتھ مقابلے پر تل گئی۔ بالاجی کو خبر ملی کہ ایک باعزت خاتون دریا کے پار جانے کے وسائل سے محروم ہے اور اپنی آبرو کے لیے اپنے محل

کے کھنڈرات میں دب جانا چاہتی ہو۔ بالاجی بہت خوش ہوا۔ اپنے معتبر کے ہاتھ قیمتی دکنی کپڑے، جن میں کم خواب کے تھان بھی تھے، بھیجے۔ اور ساتھ ہی حکم دیا کہ اس کی جایداد اور ذات سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے۔ اس کی حفاظت کے لیے پہرہ لگا دیا اور تمام ضروریات سے محل کو معمور کر دیا۔ جب مرہٹہ فوج پہاڑیوں میں گھس گئی تو پہرے کے سپاہی آداب بجالاکر رخصت ہوئے۔ بالاجی راؤ مرشد آباد کے قریب بیربھوم میں نمودار ہوا۔ اس واقعے سے بھی عیاں ہو کہ مرہٹوں کے دل مذہبی عناد سے پاک تھے۔

مرہٹوں کا دوسرا حملہ دوسری طرف راگھوجی بھونسلہ نے بھاسکر کی انگیخت پر پھر بنگالے پر حملہ کیا اور مرشد آباد کے قریب ڈیرے ڈالا۔ اس طرح مُلک دو لٹیروں کی زد میں آگیا۔ علی وردی خاں بھاگل پور میں مع اپنی فوج کے بالاجی سے ملا جو نواب کی پیشوائی کو آیا۔ دونوں گلے ملے اور ہاتھ پکڑ کر اپنے خیمے میں لے گیا۔ مسند پر اپنے پہلو میں جگہ دی، تحائف پیش ہوئے، خاطر مدارات شاہانہ انداز میں ہوئی۔ اور علی وردی خاں اپنے کیمپ میں چلا آیا۔ دوسرے دن بالاجی ملاقات باز دید کے لیے علی وردی خاں کے کیمپ میں آیا۔ علی وردی خاں نے کئی میل آگے بڑھ کر استقبال کیا، خیمے میں لاکر اپنے ساتھ مسند پر بٹھایا، عطر گلاب اور پان تقسیم ہوئے، کئی خوان بیش قیمت کپڑوں اور زر و جواہر کے موتیوں کے ہار اور ایک ہاتھی علی وردی خاں نے پیش کیے۔ مُلک میں امن قائم رکھنے اور راگھوجی کی روک تھام کے متعلق تھوڑی سی گفتگو کے بعد دربار برخاست ہوا۔ دوسرے دن علی وردی خاں نے

پیغام بھیجا کہ اب راگھوجی کی مدارات کے لیے کیا عملی قدم اٹھایا جائے۔ بالاجی نے جواب دیا کہ صوبۂ عظیم آباد کی چوتھ کئی سال سے ادا نہیں ہوئی، اس کا انتظام کیا جائے۔ یہ پیغام لے کر مصطفا خاں گیا تھا۔ ادا کا وعدہ کیا گیا اور چند دنوں میں یہ گراں قدر رقم ادا کی گئی جب راگھوجی کو اس اتحاد کی اطلاع ملی تو اس نے خیر اسی میں دیکھی کہ اُلٹے پانوٗ واپس چلا جائے۔ علی وردی خاں نے تعاقب کیا مگر بالاجی نے کہلا بھیجا کہ آپ راگھوجی کی فکر نہ کریں اور مرشد آباد کو لوٹ جائیں، میں اس کے تعاقب میں جا رہا ہوں۔ چناں چہ وہ گیا اور اس نے راگھوجی کو شکست دے کر تتّر بتّر کر دیا۔ بالاجی گو دربار کے حکم سے امداد کے لیے آیا تھا مگر اس نے مُلک کے لوٗٹنے میں کسی تکلّف سے کام نہ لیا۔

مرہٹوں کا تیسرا حملہ بھاسکر کا قتل

گزشتہ حملے کو بہت تھوڑا عرصہ ہوا تھا کہ بھاسکر نے دکن کے ایک تجربے کار سپہ سالار علی قراول کو اپنے ساتھ شامل کر کے بیس ہزار سپاہیوں کے ہمراہ اُڑیسہ پر حملہ کیا۔ علی وردی خاں آئے دن کی جنگ اور فوج کشی سے تنگ آ گیا اس لیے اس نے بجائے تلوار کے حکمتِ عملی سے کام لینے کی ٹھانی اور اس پر راجا جانکی رام اور مصطفا خاں کو شریکِ سازش کیا۔ تجویز یہ ہوئی کہ بھاسکر کو سبز باغ دکھا کر اپنے کیمپ میں مدعو کیا جائے اور پھر سازش کے مطابق وہ قتل ہو۔ ان دونوں نے بھاسکر کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کیے اور اُسے صلح کے لیے کیمپ میں آنے پر آمادہ کیا۔ بھاسکر نے تشفی کے لیے اپنے معتمد علیہ علی قراول کو علی وردی خاں کا رجحان معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ علی وردی خاں

کی چکنی چپڑی باتوں سے عقیدت اور خلوص کے سوا کچھ نہ پایا اور اس نے
یہی رپورٹ بھاسکر کو سنا کردی۔ آخر بڑی شان و شوکت سے بھاسکر علی وردی خاں
کے کیمپ میں آیا جس کے ارد گرد قناتیں لگی تھیں۔ جب وہ وسط میں آیا تو
علی وردی خاں کے اشارے پر چند افغان بھاسکر پر ٹوٹ پڑے اور اس
کے ٹکڑے کر ڈالے۔ جو چند مرہٹے اُن کے ساتھ تھے انھوں نے تلواریں
سونت لیں اور مارے گئے۔ کیمپ سے باہر مصطفٰی خاں نے بھاسکر کی
فوج پر حملہ کیا اور بھاسکر کے بے شمار سپاہی اور چند نامور سردار کام آئے۔
رگھو کائی کوار جو بھاسکر کی فوج کا سردار تھا جس قدر بھی ہو سکا مال و
اسباب اور بچی کھچی فوج لے کر پہاڑیوں میں جا چھپا۔ اس طرح بھاسکر کا
عالی شان لشکر چند گھنٹوں میں ختم ہو گیا۔ دہلی دربار سے اس صلے میں
مصطفٰی خاں کو میر جنگ اور میر جعفر کو "علی خاں" کا خطاب ملا۔ علی وردی خاں
کو شجاع الملک کا خطاب اور شاہی ملبوس عطا ہوا۔

میر جنگ مصطفٰی خاں کی بغاوت

بنگالے کو مرہٹوں سے نجات ملی تو ایک اور خرخشہ پیدا
ہو گیا۔ مصطفٰی خاں کی شجاعت اور لیاقت کا کچھ ذکر پہلے ہو چکا ہے۔
اس سپہ سالار کی لیاقت پر علی وردی خاں کو بہت ناز تھا اور وہ علی وردی
خاں کی عنایات کا مرکز بن گیا تھا۔ اس کی کوئی گزارش یا سفارش مسترد
نہ ہوتی تھی۔ اس نے افغانوں سے مُرشد آباد بھر دیا تھا اور اس طرح
صوبے بھر میں علی وردی خاں کے بعد وہی سب سے بڑا آدمی تھا۔
لازم تھا کہ اس سطوت کے حاصل ہونے پر دماغ میں غرور و تکبّر سما جائے۔
اب اس کے دماغ میں یہ سودا سمائی کہ علی وردی خاں کی مسند پر قبضہ کرے۔

مرہٹوں کی جنگ میں علی وردی خاں نے اسے منانے کے لیے یہ کہہ دیا کہ اسے وہ اس قدر عزیز ہے کہ اسے اپنے داماد سے عظیم آباد کی صوبے داری لے کر اسے دینے میں دریغ نہیں۔ یہ مبالغہ صرف کہنے اور زیب کلام کے لیے تھا۔ مصطفا خاں نے اسے اب اپنا حق اور مطالبہ بنالیا۔ علی وردی خاں نے اس کے غصے کو فرو کرنے کے لیے عطایات کی بھرمار کردی اور چند مہینے اسی طرح گزر گئے مگر مصطفا خاں کسی بات پر رضامند نہ ہوا۔ اور عظیم آباد کی صوبے داری کی رٹ لگائے گیا۔ آخر اس نے دربار میں حاضر ہونا چھوڑ دیا۔ یوسف علی خاں اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ :

"بہ ظاہر تو علی وردی خاں مصطفا خاں سے صلح کی گفت و شنید کر رہا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ مصطفا خاں کی بیخ کنی کے درپے تھا۔" آخر کچھ ایسے قرائن پیدا ہو گئے جن سے مصطفا خاں کو یقین ہو گیا کہ علی وردی خاں اس کے درپے آزار ہے۔ علی وردی خاں نے نوازش محمد خاں کو اس کے پاس بھیجا۔ مرشد آباد میں نوازش محمد خاں کی زبان سے نکلا ہوا لفظ پتھر کی لکیر سمجھا جاتا تھا، مگر مصطفا خاں نے اس کی کوئی بات نہ مانی اور عظیم آباد کا مطالبہ کیے گیا۔ اس خانہ جنگی کے آثار دیکھ کر مرشد آباد میں ہراسانی پھیل گئی۔ بہ ایں ہمہ علی وردی خاں کا دل نہ مانتا تھا کہ ایسا جواں مرد سپاہی اس کے ہاتھ سے نکل جائے جس کی خدمات عالیہ کسی حالت میں نظرانداز نہ ہو سکتی تھیں۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ مصطفا خاں سے میدان داری میں سبقت لے جانا آسان کام نہیں۔ ایک دفعہ پہلے کی طرح علی وردی خاں سراج الدولہ کو ساتھ لے کر اس کے پاس خود جانے لگا مگر امرا اس کے پاؤں سے لپٹ گئے اور اسے

خطرے میں نہ پڑنے دیا۔ اس عرصے میں مصطفا خاں کے تین کمان دار رحیم خاں، شمشیر خاں اور سردار خاں اس سے ٹوٹ کر نواب سے آملے اور مصطفا خاں نے مُرشد آباد میں شورش پیدا کرنے کے خیال کو ترک کر کے بہ راہ راست عظیم آباد پر حملہ کرنا مناسب سمجھا۔ اب اس نے اپنا وکیل دربار میں بھیجا اور اپنی بقایا کا تقاضا کیا۔ اس کا مطالبہ ۷ لاکھ رُپے تھا، اور علی وردی خاں نے بلا حیل حجّت یہ گراں قدر رقم اسے ادا کر دی اور مصطفا خاں پندرہ ہاتھی چودہ ہزار سپاہی اور بے شمار مال و متاع کے ساتھ مُرشد آباد سے باہر نکل گیا۔ اس نے جاتی دفعہ محل اور اس سے ملحقہ بیرکوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا۔ مصطفا خاں نے راج محل میں چھاؤنی ڈالی اور جنگ کا اعلان کیا اور اس کا برادر زادہ عبدالرسول خاں صوبے دار اُڑیسہ بھی اس سے آ ملا۔ علی وردی خاں کے لیے یہ معمہ ناقابلِ حل ہو گیا کہ وہ مصطفا خاں کو ہاتھ سے گنوائے یا عظیم آباد اس کے حوالے کرے۔ اس صورت میں جب عظیم آباد اور اُڑیسہ قبضے میں نہ ہو نوابی بنگالے کی کیا حیثیت رہ جاتی۔ اور خود علی وردی خاں کی صوبے داری مصطفا خاں کے رحم و کرم کی محتاج ہو جاتی۔ جسے کوئی حاکم برداشت نہیں کر سکتا۔ عبدالرسول خاں کی جگہ راجا دلبھ رام صوبے دار اُڑیسہ مقرر ہوا۔ اس بغاوت اور عظیم آباد پر حملے کی اطلاع زین الدین احمد خاں صوبے دار عظیم آباد کو بہ مقام ترہت ملی اور مصطفا خاں کے عظیم الشان ساز و سامان اور فوج کی کثرت کا بھی علم ہوا اور وہ رات دن سفر کر کے عظیم آباد پہنچ کر فوج بھرتی کرنے لگا اور مقابلے کی تیاری میں محو ہو گیا اور چند دنوں میں اس کے جھنڈے

تلے مقابلے کا دم بھرنے والی فوج جمع ہوگئی۔ عظیم آباد کی حلقہ بندی بھی مکمل ہوگئی، اردگرد کے زمین دار بھی حاضر ہوگئے۔ باوصف کامل تیاری کے اس نے حاجی عالم کشمیری، مولوی تاج الدین اور آغا عظیم بیگ کو صلح کا پیغام دے کر مصطفا خاں کے پاس بھیجا۔ مگر اس نے عظیم آباد حاصل کرنے کے علاوہ اور کوئی شرط قبول نہ کی اور وفد ناکام واپس آیا۔ مصطفا خاں نے عبدالرسول کو منگھیر کے قلعے کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا اور اس طرح اس جنگ کا آغاز ہوا۔ منگھیر کے قلعے کی شہرت تو بہت تھی مگر عمارت کے صرف کھنڈرات باقی تھے۔ قلعے پر آناً فاناً قبضہ ہوگیا مگر عبدالرسول خاں کے سر پر ایک سِل گری اور وہ مارا گیا۔ مصطفا خاں عظیم آباد کے محاذ پر پہنچ گیا۔ پانچ دن تک بڑی زبردست لڑائی جاری رہی۔ جس میں کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ فتح کس کے ہاتھ رہے گی۔ دوسرے دن مصطفا خاں نے مراجعت کی اور پہاڑیوں میں پناہ لی۔ اس طرح مصطفا خاں کی بغاوت کا ایک باب ختم ہوا۔ صبح کو صوبے دار نے اپنے امرا کے ساتھ نمازِ شکرانہ ادا کی۔ غربا میں غلّہ تقسیم کیا گیا اور دوسرے حملے کا انتظار ہونے لگا۔ اتنے میں مصطفا خاں پھر نمودار ہوا اور شدید گولہ باری شروع کی۔ ہیبت ناک معرکہ آرائی ہو رہی تھی کہ مصطفا خاں کو گولی لگی اور وہ بے ہوش ہو کر ہودے میں گر پڑا۔ یہ دیکھ کر اس کے بیٹے مرتضا خاں نے واپسی کا حکم دے دیا اور انھوں نے سوتی پور کے تالاب پر جا کر قیام کیا۔ تعاقب جاری رہا اور مصطفا خاں کی فوج کو علی پور تک پہنچا دیا گیا۔ یہاں خبر ملی کہ علی وردی خاں عظیم آباد پہنچ گیا ہو لیکن مرہٹوں کے حملے کے باعث زیادہ دیر نہیں ٹھیر سکا کیوں کہ مصطفا خاں نے انھیں

حملے کی دعوت دی تھی اور وہ اپنے مستقر سے چل پڑے تھے۔ نواب زین الدین احمد خاں نے فوج کو وہیں چھوڑا اور آپ عظیم آباد روانہ ہو گیا اور وہاں جا کر علی وردی خاں اور سراج الدولہ سے ملاقات کی اور دونوں مع سراج الدولہ دشمن کے تعاقب میں مصروف ہوئے۔ اس سے فارغ ہو کر علی وردی خاں اور سراج الدولہ مرشد آباد کو چلے گئے تاکہ مرہٹوں کی روک تھام کریں۔

دو ایک ماہ تنظیم فوج میں صرف کر کے پھر مصطفا خاں نے میدان کا رُخ کیا اور صوبے دار بھی پہنچ گیا۔ قیامت خیز جنگ ہو رہی تھی کہ مصطفا خاں کے سینے پر گولی لگی اور وہ ہلاک ہو گیا، جس سے جنگ کا نقشہ بدل گیا اور افغانوں کو جو فتح کے قریب پہنچ گئے تھے شکست ہوئی۔ مصطفا خاں کا سر کاٹ کر دہلی روانہ ہوا اور اس کی لاش عظیم آباد میں دفن ہوئی۔ مرتضا خاں پہاڑیوں میں چلا گیا۔ اس کا ماموں یحییٰ خاں گرفتار ہوا مگر اسے زادِ راہ دے کر رخصت کیا گیا۔ علی وردی خاں کو فتح نامہ پہنچا تو اس نے امیروں کو خلعت اور تحائف بھیجے، جن کے استقبال کے لیے یہ امرا شہر سے باہر گئے۔ جب یہ چیزیں پہنچیں تو سب والیٔ بنگالہ کی طرف جھک کر مجرا بجا لائے اور بڑی شان و شوکت سے شہر کو واپس آئے۔ علی وردی خاں کو فتح حاصل ہوئی مگر سلطنت کا ایک زبردست ستون گر گیا۔

علی وردی خاں نے عظیم آباد ہی سے منعم خاں کو سفارت کا خلعت دے کر راگھوجی بھونسلہ کے پاس بھیجا تھا کہ اسے حملہ کرنے سے باز رکھے۔ لیکن راگھوجی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ علی وردی خاں میں مقابلے کی تاب نہیں رہی۔ اس لیے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس نے

منعم خاں کو یہ جواب دیا کہ لڑائی کو رد کرنے کی صرف ایک صورت ہو کہ تین کروڑ روپیہ بہ طور نعل بندی ادا کیا جائے۔ علی وردی خاں کو تو تیاری کے لیے مہلت درکار تھی اس نے نامہ و پیام میں تین مہینے لگا دیے۔ اس کے بعد اس نے راگھو جی کو ایک پیسہ بھی دینے سے انکار کر دیا۔ طبلِ جنگ پہ چوٹ پڑی اور علی وردی خاں نے علم بلند کیا۔ اس وقت راجا دلب رام اڑیسہ کا صوبے دار تھا۔ لیکن یہ راجا حکم رانی کے قابل نہ تھا۔ پوجا پاٹ کے انہماک، برہمنوں اور سنیاسیوں کی مجلس میں اس کے رات دن گزر جاتے تھے۔ یہ سنیاسی دراصل راگھو جی کے جاسوس تھے جو راجا کی ہر ایک بات اسے پہنچا دیتے تھے۔ راگھو جی نے مصطفا خاں[1] مرحوم کی دعوت کو اس خوشی سے قبول کیا گویا وہ پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔ آخر چودہ ہزار سپاہی لے کر چلا اور اڑیسہ کے ڈانڈے پر جا ٹھیرا۔ لیکن راجا دلب رام کو خبر نہ ہوئی کہ سرحد پر کیا ہو رہا ہو۔ دلب رام خوابِ غفلت میں تو ہمیشہ سرشار رہتا تھا لیکن وہ اس وقت طبعی نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میر عبدالعزیز کمان دار نے اس کے محل کے دروازے پر جا کر شور مچایا۔ راجا گھبرایا ہوا محل سے نکلا۔ دھوتی کمر میں سر اور پانو سے ننگا پالکی میں سوار ہوا اور بارہ بھاٹی کو بھاگ جانا چاہا۔ میر عبدالعزیز کمان دار نے اس کا حوصلہ بندھایا اور بھاگ جانے سے باز رکھا۔ دلب رام کو کپڑے پہنا کر گھوڑے پر سوار کیا اور ساری فوج اس کے گرد جمع ہوئی تو اسے کچھ اطمینان ہوا۔ مگر جب راگھو جی نے قلعے کا محاصرہ کر لیا تو راجا کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ سنیاسیوں نے اسے مشورہ دیا کہ [illegible] سے کیا فائدہ، کچھ دے دلا کر صلح کر لیجیے۔ عبدالعزیز

نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ ایسا کرو گے تو علی وردی خاں کو کیا
مُنہ دکھاؤ گے۔ راجا اس وقت تو رُک گیا مگر پھر سنیاسی غالب آ گئے
اور سنیاسیوں کے کہنے پر راگھوجی کی ملاقات کو اس کے کیمپ میں گیا۔
عبدالعزیز کمان دار کے سوا اس کے تمام کمان دار اس کے ہمراہ تھے۔ جب
ملاقات ہو چکی اور دلب رام نے واپسی کا ارادہ کیا تو راگھوجی نے کہا کہ
اتنی جلدی کیا ہے۔ میں اس قدر دھوپ میں کبھی واپس نہ جانے دوں گا۔
کھانا کھا کر الگ خیمے میں آرام فرمایئے اور دن ڈھلے چلے جایئے گا۔
دلب رام مان گیا۔ چناں چہ دلب رام اور سب کمان دار الگ الگ
خیموں میں چلے گئے۔ ہتھیار اُتارے، کھانا کھایا اور سو گئے۔ جب
بیدار ہوئے تو معلوم ہوا کہ سب کے سب مرہٹوں کی قید میں ہیں۔ یہ
خبر پاکر میر عبدالعزیز نے مقابلے کا ارادہ کیا مگر دلب رام نے حکم بھیجا
کہ ہتھیار ڈال دو۔ علی وردی خاں خاموش بیٹھا تھا اور مناسب وقت
کا منتظر تھا۔ عبدالعزیز نے معقول شرائط پر قلعہ مرہٹوں کے حوالے کیا۔
اور آپ مرشد آباد چلا گیا۔ دلب رام ایک سال تک مرہٹوں کی قید
میں رہا۔ آخر اس کے باپ راجا جانکی رام نے تین لاکھ رُپے دے کر آزاد
کرا لیا اور یہ رقم علی وردی خاں نے راجا کو دے دی۔

کٹک پر حملہ کرکے راگھوجی نے بھر بھوم میں اپنا مرکز بنایا۔ جہاں
مرتضیٰ خاں اور اس کی فوج بھی مرہٹوں کے جھنڈے تلے آ گئی۔ اس
وقت مرہٹوں کی فوج کی تعداد بیس ہزار سواروں سے زیادہ تھی۔
علی وردی خاں بھی بارہ ہزار سواروں کے ساتھ عظیم آباد پہنچ گیا۔
علی وردی خاں نے سراج الدولہ کو ہمراہ لے کر بانکے پور کی طرف

اٹالا روانہ کیا اور موہت پور میں قیام کیا مگر کوئی مرہٹہ نظر نہ آیا۔ فوج بہت بلند مرتبہ سپہ سالاروں کی کمان میں بڑھی چلی جاتی تھی لیکن مرہٹوں کا کہیں نام و نشان نہ ملتا تھا۔ آخر مرہٹوں کا کیمپ آگیا اور بنگالی فوج نے اچانک حملہ کردیا جس کے لیے مرہٹے تیار نہ تھے۔ انھوں نے جلد اپنے آپ کو سنبھال لیا اور لڑائی شروع ہوگئی۔ مگر اس لڑائی کو ختم کیے بغیر راگھوجی مرشدآباد کی طرف چلا گیا۔ علی وردی خاں نے اس کا تعاقب کیا اور بھاگل پور جا لیا۔ راگھوجی نے یہاں سے بھی کوچ کیا اور آخر کٹوا کے نزدیک رانی تالاب کے مقام پر فیصلہ کن جنگ شروع ہوئی۔ راگھوجی کو انجام اچھا نظر نہ آیا اور پہاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ یہاں اُسے اپنے خانگی جھگڑے کی خبر ملی، اور وہ تین ہزار سوار اور سات ہزار پیادے میر حبیب کے حوالے کرکے وطن کو چلا گیا۔ علی وردی خاں مظفر و منصور فتح کے جھنڈے اُڑاتا مرشدآباد پہنچا۔ اس جنگ میں علی وردی خاں شمشیر خاں و سردار خاں افغانوں سے بدظن ہوگیا۔ افغان آوارہ ہوگئے اور شمشیر خاں و سردار خاں برطرف کیے گئے۔ یہ مرہٹوں سے سازش رکھتے تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ راگھوجی کو شمشیر خاں نے گرفتار کرکے چھوڑ دیا تھا

شادی

جنگ سے فارغ ہوکر علی وردی خاں مرشدآباد پہنچا تو اس نے فضل قلی خاں اکرام الدولہ اور میرزا محمد شاہ قلی خاں سراج الدولہ کی شادیوں کا اہتمام شروع کیا اور شادیوں کی تہ میں یہ مدعا تھا کہ اہلِ لشکر اور لوگوں کو ذرا تفریح کا موقع دیا جائے۔ اعادے سے بے نیاز ہوکر پھر اس طرف توجہ دلائی جاتی ہے کہ اکرام الدولہ

اور سراج الدولہ زین الدین احمد خاں امینہ بیگم کے بیٹے تھے۔ امینہ بیگم علی وردی خاں کی بیٹی تھی۔ اور زین الدین احمد خاں حاجی احمد کا بیٹا تھا۔ حاجی احمد علی وردی خاں کا بھائی تھا۔ سراج الدولہ کو علی وردی خاں اور اکرام الدولہ کو نوازش محمد خاں نے بیٹا بنا لیا تھا۔ نوازش محمد خاں بھی حاجی احمد کا بیٹا اور گھسیٹی بیگم دختر علی وردی خاں کا خاوند تھا۔ اکرام الدولہ کا رشتہ عطا اللہ خاں کی لڑکی سے، سراج الدولہ کا ایرج خاں کی بیٹی زندہ جاوید لطف النسا بیگم سے ہوا تھا۔ تمام رشتے دار اور احباب دور دور سے آکر جمع ہوئے۔ مگر حاجی احمد خاص وجوہات کی بنا پر شامل نہ ہو سکا۔ یہ شادیاں اس دھوم دھام سے ہوئیں کہ بنگالہ تو کہاں ہندستان میں بھی ان کی مثال شاذ ہی ملے گی۔ پہلے اکرام الدولہ کی شادی ہوئی، جس میں ایک ہزار خلعت تقسیم ہوئے، اس کے بعد سراج الدولہ کی جس میں دو ہزار خلعت دیے گئے۔ ہر خلعت کی قیمت ایک ہزار روپے تھی۔ امرا کو خلعتوں کے علاوہ جواہرات بھی انعام ملے۔ ایک ماہ تک دونوں وقت مرشد آباد کے ہر باشندے کو پُر تکلف کھانا ملتا رہا۔ اور محلات میں رقص و سرود کی مجلسیں ہر روز منعقد ہوتی رہیں جہاں ہر شخص کو جانے کی اجازت تھی۔ اس کے علاوہ غریب سے لے کر امیر تک سب کے گھر میں تورہ پہنچا۔ ہر ایک تورہ پچیس روپے کی مالیت کا ہوتا تھا۔ ہر روز شہر میں چراغاں کیا جاتا تھا اور آتش بازی چھوٹتی تھی، سارا شہر ایک بقعۂ نور بن گیا تھا۔ انھی دنوں میں سعید احمد خاں نے اپنی لڑکی کی شادی کی اور شان و شوکت میں علی وردی کی تقلید کی۔ مگر قدرت کا کھیل کر چوتھی کی رسم ادا ہوئی ہی تھی کہ یہ لڑکی بغیر کسی خاص بیماری کے یک بیک

فوت ہوگئی۔ اور مرشد آباد کی عید کا جشن محرّم کی مجلس میں تبدیل ہوگیا۔

مرہٹوں کا نیا حملہ

مرہٹوں کا کھٹکا موجود تھا جو شمشیر خاں اور سردار خاں کو ساتھ لیے موقع کی تاک میں تھے۔ اُڑیسہ کا انتظام بہت بگڑ گیا تھا۔ وہاں سعید احمد صوبے دار اور میر جعفر نائب مقرر ہوئے، نیز میر جعفر کو ہگلی اور میدنا پور کی فوج داری مل گئی۔ ہگلی میں میر جعفر نے جان سنگھ کو اپنا نائب نام زد کیا۔ اس کے بعد میر جعفر سات ہزار سواروں اور بارہ ہزار پیادوں کے ساتھ کٹک کو روانہ ہوا اور اس کے سات دن بعد اس نے مرہٹوں اور افغانوں کے ایک متحدہ دستے کو شکست دی۔ مرہٹے جالیسر کی طرف بھاگے اور میر جعفر نے ان کا تعاقب کیا۔ اتنے میں خبر آئی کہ مرہٹوں کو کمک پہنچ رہی ہے۔ پھر خبر آئی کہ راگھوجی کا بیٹا جانوجی بے انداز فوج لے کر آرہا ہے۔ میر جعفر لرزہ بہ اندام ہوگیا۔ زبانی روایت یہاں تک ہے کہ زار زار رونے لگا۔ بغیر اجازت لیے بلا اطلاع دیے اس نے راہ فرار اختیار کی اور بردوان میں پناہ گزیں ہوا۔ اس نے بھاگنے میں اس عجلت سے کام لیا کہ جانوجی فقط اس کے چند ہاتھی اور تھوڑا سا سامان چھین سکا۔ اس قدر فوج اور ساز و سامان ہوتے ہوئے میر جعفر کا بچوں کی طرح بھاگنا اس قدر مضحکہ خیز ثابت ہوا کہ میر جعفر جس طرف سے نکلتا انگلیاں اُٹھتیں۔ مگر علی وردی خاں میر جعفر کی نااہلیت اور بزدلی سے خوب آگاہ تھا۔ اس نے پہلے ہی عطا اللہ خاں کو مامور کردیا تھا۔ عطا اللہ خاں کے پہنچنے پر میر جعفر کی جان میں جان آئی۔ اتنے میں میر علی اصغر کبرا بھی پہنچ گیا۔ جانوجی نے میر حبیب کے مشورے سے میدان داری کی۔ مرہٹوں کی جانب سے شمشیر خاں اور سردار خاں نے بھی

بڑی دلیری سے کام لیا۔ مگر مرہٹے مقابلہ نہ کر سکے اور حسبِ معمول جنگلوں میں جا چھپے۔

ایک ناکام سازش

میر علی اصغر کبرا ایک منچلا سپاہی، شعبدے باز اور غضب کا چالباز تھا۔ اس نے عطاء اللہ خاں اور میر جعفر کو اس بات پر آمادہ کیا کہ علی وردی خاں کو قتل کر کے مسندِ مرشد آباد کو آپس میں بانٹ لیا جائے۔ اُڑیسہ عظیم آباد میر جعفر کو اور بنگال عطاء اللہ خاں کو ملے۔ میر جعفر جو فطرتاً غدّار، دغا باز، احسان فراموش اور کم ظرف تھا، رضامند ہو گیا۔ مگر ان صفات کے علاوہ وہ کمال کا بزدل تھا۔ چند دوستوں نے جب علی وردی خاں کی طاقت کا ذکر کیا تو یہ اپنے عہد سے پھر گیا۔ اتنے میں علی وردی خاں بھی پہنچ گیا، جسے اس سازش کا سارا پتا چل گیا۔ میر جعفر مجرا بجالانے لگا تو علی وردی خاں نے اس کی بزدلی کو سامنے رکھ کر وہ جھاڑ دی کہ میر صاحب کو پسینہ آ گیا اور آیندہ کے لیے دربار کی حاضری بند کی گئی۔ عطاء اللہ خاں کے پاس علی وردی خاں خود چلا گیا جہاں علی اصغر سے ملاقات ہوئی۔ لیکن عطاء اللہ خاں اپنے متمردانہ انداز میں پیش آیا۔ نواب کبیدہ خاطر ہو کر چلا آیا۔ خیمے میں پہنچا تو عطاء اللہ خاں کی ایک درخواست ملی جس میں استدعا کی گئی تھی کہ علی اصغر کو اس کی فوج میں کوئی عہدہ دیا جائے۔ علی وردی خاں نے یہ حکم لکھا کہ تنخواہ اپنی جیب سے دو تو شوق سے رکھ لو ورنہ گنجایش نہیں۔ اس کے بعد ایک اور عرضی آئی کہ اگر علی اصغر کو ملازم نہ رکھا گیا تو وہ بھی شرفِ ملازمت سے دست بردار ہو جائے گا۔ اس کا علی وردی خاں نے یہ جواب دیا کہ جو آپ کو پسند ہو وہی ہو گا۔

عطا اللہ خاں کو علی اصغر نے یقین دلایا تھا کہ اسے بشارت ہوئی ہے کہ بنگالے کی حکومت تمھارے نصیب ہو چکی ہے۔ جب یہ حکم پہنچا تو اس نے فوراً ملازمت سے استعفا دے دیا اور مرشد آباد میں خانہ نشین ہو گیا۔

اسی عرصے میں میر جعفر کا کوئی رشتے دار مر گیا اس کے ہاں صفِ ماتم بچھی۔ علی وردی خاں ماتم پرسی کے لیے گیا مگر میر جعفر نہ تو استقبال کے لیے آیا نہ مجرا بجالایا۔ علی وردی خاں نے اس جاہل اور بے وقوف کو سبق لینے کے لیے سجان سنگھ کو حکم دیا کہ ہگلی کی فوج داری کا حساب پیش کرو۔ یہ شخص میر جعفر کی بد دیانتوں کا راز دار تھا۔ میر جعفر نے سجان سنگھ کو پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ علی وردی خاں غصّے سے آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے اپنے گرز بردار سید احمد یساول کو مع چند دیگر نفروں کے حکم دیا کہ سجان سنگھ کو گرفتار کر کے فوراً پیش کیا جائے۔ وہ میر جعفر کے خیمے میں گیا اور وہاں سے سجان سنگھ کو پکڑ کر پیش کر دیا۔ علی وردی خاں نے اسے ہگلی کی فوج داری عطا کی۔ بخشی کے عہدے سے میر جعفر کو معزول کر کے نور اللہ بیگ کو مقرر کیا۔ میر جعفر کی فوج کو موقوف کر دیا۔ بخشی نے حکم جاری کیا کہ میر جعفر کی فوج کے جو آدمی نوکر ہونا چاہیں وہ سراج الدولہ کے پاس درخواست کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میر جعفر کی فوج میں ایک شخص نہ رہا۔ اب میر جعفر کی آنکھیں کھلیں اور اسے معلوم ہوا کہ وہ حقیقت میں کیا چیز ہے۔ غرور کا نشہ اترا تو معلوم ہوا کہ عزت اور آبرو کا انحصار علی وردی خاں کے گوشۂ چشم پر منحصر ہے۔ وہ صرف دو ایک دوستوں کے ساتھ مرشد آباد پہنچا اور

نواب شہامت جنگ نوازش محمد خاں کی خدمت میں حاضر ہو کر طالب امداد ہوا۔

مرہٹوں کے حملے کا تسلسل

یہ اندرونی جھگڑے طے ہوئے تو جانوجی کے جدید حملے کی اطلاع ملی۔ علی وردی خاں فوج لے کر اس کے سر پر جا پہنچا اور شکست دی۔ جانوجی نے مرشد آباد کی طرف کوچ کیا لیکن علی وردی خاں نے ایسا سخت تعاقب کیا کہ مرشد آباد پہنچنا محض خواب ہو گیا۔ اب اس نے میدنا پور کا راستہ اختیار کیا۔ بنگالی فوج برابر پیچھے لگی رہی جس کا مقابلہ محال اور جس سے پیچھا چھڑانا اس سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ آخر انھیں اپنی پناہ گاہوں میں جانا پڑا۔ علی اصغر کبرا کو حکم دیا گیا کہ وہ بنگال کی حدود سے باہر نکل جائے۔

زین الدین احمد کا خونِ ناحق

زین الدین کو چند گمراہوں نے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ساری طاقت اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے بھائیوں اور چچا سے زیادہ طاقتور ہو جائے۔ اس غرض کے لیے اس نے اپنا ایک قاصد بھیجا جو علی وردی خاں کے پاس پہنچا۔ جب وہ مرہٹوں کی سرکوبی کے لیے امانی گنج میں مقیم تھا اور شمشیر خاں اور سردار خاں کو ملازمت میں لینے کی اجازت مانگی۔ علی وردی خاں کو یہ تجویز ناگوار گزری۔ مگر بالآخر رضامند ہو گیا۔ چنانچہ ان کو ملازمت میں داخل کیا گیا۔ وہ افغان سپاہیوں کو لے کر عظیم آباد آئے جہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ اس کو چند دن گزرے تھے کہ ایک دن جب اکثر امرا شہر سے باہر گئے تھے شمشیر خاں

اطاعت قبول کرنے کے لیے بُلایا گیا اور اہلِ دربار کی حاضری معاف کی گئی۔ اس طرح زین الدین احمد نے اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودی ۔ اس سانحے کی کیفیت یہ ہے کہ مقررہ وقت پر نواب زین الدین خاں نے چہل ستون میں دربار منعقد کیا۔ اس کے ہمراہ محمد عسکر خاں، منسارام، مہتاب رائے، میر مرتضےٰ، مرلی دھر، رمضانی امرا، چند گرز بردار، پیادے اور غلام تھے۔ یہ سب حسبِ حکم غیر مسلح تھے۔ راجا رام نرائن منشی خانے میں مصروف کار تھا۔ اب افغان آنے شروع ہوئے۔ سب سے پہلے بخش اللہ خاں ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ داخل ہوا، جن کی بندوقیں بھری ہوئیں اور گھوڑے چڑھے ہوئے تھے۔ اس نے مجرا ادا کیا اور ایک جانب صف بندی کر لی۔ پھر یہ آگے آیا اور نذر پیش کی۔ شمشیر خاں کا برادر زادہ مرید شیر خاں پان سو مسلح سپاہیوں کے ساتھ آیا اس نے نذر پیش کی۔ اور نواب نے پوچھا کہ شمشیر خاں کہاں ہے۔ عرض کی گئی کہ حاضر ہوا چاہتا ہے۔ آخر چار ہزار مسلح سپاہیوں کے ساتھ وہ بھی پہنچ گیا۔ اور اس کی فوج کے لیے جگہ بنانے کے لیے موجودہ حاضرین رخصت کیے گئے اور ہر ایک کو نواب نے اپنے ہاتھ سے پان دینے شروع کیے کہ یہ عزّت افزائی کی حد تھی۔ آخر عبدالرشید خاں کی باری آئی۔ وہ پان لینے گیا تو اس کا ہاتھ کانپنے لگا اور پان گر گیا۔ زین الدین دوسرا پان اٹھانے کے لیے پان دان کی طرف جھکا تو عبدالرشید خاں نے خنجر نکال کر مارا مگر زخم کاری نہ آیا۔ پھر اس نے تلوار کی ضرب لگائی جو کندھے پر پڑ کر پیٹ سے نکل گئی۔ میر مرتضےٰ خاں، محمد عسکر خاں، بادشاہ نواز خاں، رمضانی، سیتا رام نے اپنی جانیں نثار کر دیں۔ مہتاب رائے سخت مجروح

ہوا مگر اس نے نواب کا سر اپنی گود سے جُدا نہ کیا جب تک کہ لاش اٹھائی نہ گئی۔ راجا رام نراین نے تمام مال و اسباب ان کے حوالے کر کے جان بچائی۔ یہ حالت دیکھ کر محل سرا کے دربان بھاگ گئے۔ امینہ بیگم نے ہمت نہ ہاری اور محل سرا کے تمام دروازے بند کر دینے کا حکم دیا۔ اس وقت اس کا بچہ مرزا مہدی حیران پریشان گلیوں میں پھر رہا تھا۔ عبدالعلی خاں ایک سردار نے اسے لباس سے پہچانا۔ اس نے اس کی زردار پگڑی اُتار کر پھینک دی، پرانے کپڑے پہنائے اور کمبل میں لپیٹ کر اپنے گھر لے گیا۔ اب افغانوں نے لوٹ مار شروع کی۔ زین الدین خاں کے محل سے تین لاکھ روپیہ برآمد ہوا۔ حاجی احمد کو گرفتار کیا گیا اور تشدد کر کے اس سے ستائیس لاکھ روپے نقد، جواہرات اور سونا لیا۔ پندرہ دن کے بعد حاجی تشدد کی شدت سے مر گیا۔ علی وردی خاں کو خبر ملی تو وہ عظیم آباد کو روانہ ہوا۔ شمشیر خاں کے پاس اب بے شمار روپیہ تھا۔ اس نے ہزاروں افغان جمع کر لیے اور علی وردی خاں کی راہ دیکھنے لگا۔

عبدالعلی خاں کو اپنی جان یا مال منال کی پروا نہ تھی۔ مگر اس امانت یعنی میرزا مہدی کی جان بچانے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ وہ بجروں میں سوار ہو کر بھاگ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ شیر خاں نے اسے بلایا۔ اس کے بدن کے کپڑے تک اُتار لیے اور بڑے ماموں شمشیر خاں کے پاس بھیجا۔ شمشیر خاں اسے پہلے سے بہ خوبی جانتا تھا۔ اس نے بڑی عزت سے اسے گھر واپس کیا۔ پہلے امان دی تھی لیکن بعد میں اسے بلا کر قید کر لیا۔ اُسے دریا میں غرق کرنے کو لے جا رہے تھے مگر کسی نے کہہ سن کر شمشیر خاں سے اس کی جان بخشی کرائی اور یہ شرط ٹھہری کہ

علی وردی خاں کی آمد پر وہ خاموش رہے گا۔

اس تمام عرصے میں زین الدین احمد کی لاش بے کفن پڑی رہی اور دو دن کے بعد سید محمد افغانی نے شمشیر خاں سے اجازت لے کر اسے اس جگہ دفن کیا جسے ہیبت جنگ کا مقبرہ کہتے ہیں۔

بد قسمت شہر لٹ رہا تھا کہ یہ خبر عام ہوئی کہ علی وردی خاں پہنچا چاہتا ہے۔ اس پر شمشیر خاں نے نواب شہید کی بیگم وغیرہ کو قید کر لیا۔ اس بربری وحشی نے حکم دیا کہ مرحوم کی بیگم اور دیگر شہزادیوں کو بے پردہ رتھوں میں بٹھا کر سر بازار کیمپ میں لایا جائے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا بلکہ وہ شمشیر خاں کو صلواتیں سناتے تھے۔ اس سے زیادہ ان کے بس میں نہ تھا۔ کئی افغانوں نے جن میں مادۂ شرافت باقی تھا شمشیر خاں کی اس حرکت کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔

افغانوں کا قلع وقمع

شمشیر خاں نے چالیس ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادوں کی فوج جمع کر لی تھی اور بڑا بھاری توپ خانہ اس کے پاس تھا۔ اس طرح منظم ہو کر وہ علی وردی خاں سے مقابلے کے لیے نکلا۔ علی وردی خاں کو افغانوں کی تیاری کی پوری خبر تھی۔ اس لیے اس نے دربار میں ایک حسرت آمیز تقریر کی۔ سب امرا نے قرآن پر حلف جاں نثاری لیا۔ نواب کو روپے کی سخت ضرورت تھی۔ نوازش محمد اور اس کی بیگم گھسیٹی بیگم نے روپوں اور اشرفیوں کے ڈھیر لگا دیے۔ جگت سیٹھ نے اپنے خزانے کے دروازے کھول دیے۔ جو علی وردی نے کہا پیش کر دیا۔ اس مصیبت کے وقت مرہٹے بھی

کچھ فاصلے پر منڈلا رہے تھے۔ اس نے سعید احمد خاں کو راستے کی حفاظت کے لیے بھنگوان گولا بھیجا اور شہر والوں کو مشورہ دیا کہ جن سے ہو سکے وہ شہر سے چلے جائیں۔

۱۷۴۹ء میں وہ پندرہ ہزار سوار اور اکتیس ہزار پیادوں کی جمعیت کے ساتھ عظیم آباد کو روانہ ہوا۔ مرشد آباد کی حفاظت پر نواب شہامت جنگ نوازش محمد خاں اور میر جعفر مقرر ہوئے۔ جسے پھر بخشی فوج کا عہدہ دیا گیا تھا۔ اب مرہٹے بھی افغانوں کی امداد کے لیے عظیم آباد چلے گئے اور مرشد آباد کو جو خطرہ تھا جاتا رہا۔ راستے میں فوج میں اضافہ ہوتا گیا سیف خاں صوبے دار پورنیا نے پندرہ سو سوار شاہ دین محمد کی کمان میں بھیجے۔ سنگیر میں راجا سندر سنگھ اور قمرالزماں زمین دار ترہٹ بھی شامل تھے۔ اس وقت خبر آئی کہ پچاس ہزار افغانوں کا لشکر بار میں لڑائی کے لیے تیار کھڑا ہے۔ مگر شمشیر خاں کی حرکت دیکھیے کہ اس نے مرہٹوں کے سپہ سالار میر حبیب کو دعوت پر بلایا اور اسے قید کر لیا۔ اور دو کروڑ روپے کا مطالبہ کیا۔ میر حبیب نے اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر دو لاکھ روپے اور باقی مطالبہ جلد پورا کرنے کا عہد کر کے نجات حاصل کی اور اپنے کیمپ میں آیا۔

اس وقت ہندستانیوں میں سوا نظام الملک کے سپہ داری میں علی وردی کا جواب نہ تھا اور اس کی قابلیت ہندستانی خون سے ہولی کھیلنے میں صرف ہو رہی تھی۔ وہ چپکے سے افغانوں کے سر پر جا پہنچا۔ افغانوں میں کھلبلی پڑ گئی اور وہ توپ خانہ چھوڑ کر بغیر لڑے بھاگ گئے۔ رات انھوں نے سوتے جاگتے گزاری۔ صبح کو علی وردی خاں نے نماز

ادا کی اور خاکِ کربلا کو ماتھے سے لگا کر میدان کا رُخ کیا۔ دونوں جانب سے صف بندی اور لڑائی شروع ہوئی۔ مرہٹوں نے دوسری طرف پڑے جمائے۔ اس طرح بنگالی فوج دو فوجوں کے گھیرے میں آگئی۔ مرہٹوں نے اس فوج پر حملہ کیا جو سراج الدولہ کے زیرِ کمان تھی مگر علی وردی خاں نے سراج الدولہ کو پیغام بھیجا کہ مرہٹوں کی کوئی پروا نہ کرو اور زیادہ سے زیادہ انھیں روکے رکھو اور ساری توجہ افغانوں کی طرف کرو۔ افغانوں کے نبٹ جانے کے بعد مرہٹوں کو دیکھ لیں گے۔ دست بہ دست لڑائی شروع ہوئی اور خون کے دریا بہنے لگے۔ دوست محمد خاں اس ہاتھی پر چڑھ گیا جس پر مرید شیر خاں سوار تھا اور اس کا سر اُتار کر اُترا۔ اسی وقت شمشیر خاں زخمی ہو کر ہاتھی سے گرا۔ مگر کس نے مارا معلوم نہ ہو سکا۔ دونوں کے سر علی وردی خاں کے ہاتھی سے باندھے گئے اور افغانوں کو شکست ہوئی۔ مرہٹوں نے لڑائی کا یہ رُخ دیکھ کر حوصلہ ہار دیا اور واپس چلے گئے۔ علی وردی خاں نے افغانوں کا بڑی سختی سے تعاقب کیا اور مار مار کر ان کے لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ امینہ بیگم، مرزا مہدی اور شہزادیاں جو ایک خیمے میں قید تھیں علی وردی خاں کے پاس لائی گئیں۔ اس نے انھیں گلے سے لگایا، کچھ روئے کچھ شکر کیا اور یہ دردناک ملاقات ختم ہوئی۔ عظیم آباد میں خبر پہنچی تو گھر گھر چراغ جلنے لگے۔ چند دن آرام کر کے علی وردی خاں عظیم آباد میں وارد ہوا اور فتح کی اطلاع مُرشد آباد بھیجی گئی۔ افغانوں کے مال و متاع کی ضبطی کے لیے احکام جاری ہوئے تو بتیا کے زمین دار کی عرضی آئی کہ شمشیر خاں اور سردار خاں کے عیال اس کی حفاظت میں ہیں۔ اگر انھیں کسی دیگر

صوبے میں چلے جانے کی اجازت دی جائے تو وہ تین لاکھ روپے نذر گزارنے کو حاضر ہے۔

ظرف اپنا اپنا یہ استدعا منظور نہ ہوئی اور انھیں عظیم آباد لانے کا حکم ہوا۔ زمین دار نے انھیں بنگالی سپاہیوں کے حوالے کر دیا تو حکم ہوا کہ انھیں بند گاڑیوں میں لایا جائے۔ ان پر کسی غیر کی آنکھ نہ پڑے، کوئی ایسی حرکت نہ ہو جو شکایت کی موجب بن سکے۔ بازار کا راستہ چھوڑ کر محل کے جانب مغرب کی طرف سے انھیں محل میں داخل کیا جائے۔

اس بڑی عزت و توقیر سے انھیں محل میں داخل کیا گیا۔ بہترین کمرے انھیں رہنے کو ملے اور حکم عام ہو گیا کہ کوئی شخص بلا اجازت محل میں داخل نہ ہو۔ چناں چہ سراج الدولہ اور خود علی وردی خاں نے اس پر عمل کیا اور خواجہ سرا کے ذریعے اجازت لیے بغیر وہ کبھی محل کے اندر نہ گئے۔ جو چیز آتی پہلے ان کا مہرہ نکال کر انھیں بھیجا جاتا۔ پھر کسی شہزادی کو ملتا۔ علی وردی خاں، شمشیر خاں کی بیوہ کو نانی کہتا تھا۔ علی وردی خاں نے ان کے اخراجات کا انتظام کر کے انھیں آزاد کر دیا۔ شمشیر خاں کی بیٹی کی شادی کے تمام اخراجات ادا کیے اور کئی گاؤں ان کی معاش کے لیے عطا کیے۔ میر حبیب کے عیال بھی آزاد ہوئے جو ایک مدت سے ہیبت جنگ مرحوم کی قید میں چلے آتے تھے۔ اسے کہتے ہیں عالی ظرفی۔ بنگالے میں یہ کچھ ہو رہا تھا کہ محمد شاہ نے ۱۷۴۸ء میں انتقال کیا اور احمد شاہ اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔

عظیم آباد کی صوبے داری یہ بیان ہو چکا ہے کہ جب علی وردی خاں نے

نواب صولت جنگ، سعید احمد خاں کو نائب صوبے دار عظیم آباد مقرر کیا تو اس سے وعدہ ہوا کہ جلد اسے صوبے دار کا عہدہ مل جائے گا۔ سعید احمد خاں نے تمام نامی امرا اپنے پاس جمع کرنے شروع کیے۔ جن میں زیادہ تر صاحب سیر المتاخرین کے رشتے دار تھے جو سازش، فریب، بددیانتی کے عملی ثبوت دے چکے تھے۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ یہ نواب سعید احمد کو اپنے ڈھب پر لاکر علمِ بغاوت بلند کرا دیتے اور انھوں نے مرحوم نواب کے جو امرا اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے انھیں بھی ڈھونڈ نکالا۔ یہ خبر مرشد آباد پہنچی تو علی وردی خاں کی بیگم (اشرف النسا بیگم) کچھ پریشان سی ہوگئی۔ اشرف النسا غیر معمولی فہم و ادراک کی خاتون تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ علی وردی خاں کی ساری سیاست بیگم کے تدبر کی مرہونِ منت تھی۔ سیاست دانی کے علاوہ وہ سپہ گری میں ماہر تھی۔ اور اس میں کلام نہیں کہ علی وردی خاں کی یا تدبیر مشیر بھی تھی۔ سعید احمد کی امرا نوازی علی وردی خاں کو بھی کھٹک رہی تھی۔ آخر بیگم نے نواب سے اس کا ذکر چھیڑا اور کہا کہ "عظیم آباد بنگالے کا دروازہ ہے اس کو ناتجربے کار ہاتھوں میں دینا خطرناک ہوگا۔ ہیبت جنگ خوازش محمد خاں ایک لااُبالی فہم و ادراک سے تہی دست آدمی ہے۔ وہ حکومت کا بار نہیں اٹھا سکتا۔ بلکہ اس کے لیے تو مرشد آباد سے باہر قدم رکھنا بھی دوبھر ہے۔ اگر سعید احمد خاں کو اس عہدے پر سرافراز کیا تو وہ اکرام الدولہ و سراج الدولہ کی جان کا لاگو ہو جائے گا، خانہ جنگی ہوگی اور گھرانہ گھروندا بن جائے گا۔ اس لیے یہ عہدہ کسی ایسے شخص کو ملنا چاہیے جس پر پورا بھروسا ہو۔" علی وردی خاں پر اس مشورے کا بہت اثر ہوا۔ اس کے علاوہ سراج الدولہ کو پٹی پڑھائی کہ وہ علی وردی خاں سے عظیم آباد کی صوبے داری

مانگے۔ جب سراج الدولہ نے یہ مطالبہ کیا تو علی وردی خاں بہت ہنسا اور اسی وقت اسے اپنا جانشین مقرر کرکے اعلان کردیا۔ یہ ۱۷۵۲ء کا واقعہ ہے۔ یہ انتخاب علی وردی خاں اور اشرف النسا بیگم کی صلاح ومشورے کا نتیجہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے خاندان میں سراج الدولہ کے پایے کا جانشین ملنا ناممکن تھا۔ وزرا اور عوام نے بھی اس حسنِ انتخاب کے سامنے سرِ نیاز خم کیا اور دہلی نے بھی اس پر مہرِ توثیق ثبت کی۔ اگر وہ علی وردی خاں اور اشرف النسا کے معیارِ جہاں بانی پر پورا نہ اُترتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اسے نواب شہامت جنگ، اکرام الدولہ اور سعید احمد پر ترجیح دی جاتی۔ سراج الدولہ کی طبیعت خود علی وردی خاں کی ساختہ پرداختہ تھی اور اب وہ اپنی تربیت کو خود اپنے سامنے پروان چڑھتا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے اس اعلان کے ساتھ مہرِ حکومت سراج الدولہ کے حوالے کردی اور ۱۷۵۲ء سے سراج الدولہ کی حکومت کا آغاز ہوا کسی صوبے کا کسی کو پشت در پشت صوبے دار مقرر کرنا صوبے داری ونظامت کے مفاد کے خلاف ہے۔ اس پر سعید احمد خاں بہت رنجیدہ ہوا اور اس نے شاہ جہاں آباد چلے جانے کا عزم کیا۔ علی وردی خان سراج الدولہ کو ہمراہ لے کر عظیم آباد گیا اور دونوں نے مل کر سعید احمد کو سمجھایا، گراں قدر مراعات سے تلافی کی وہ رضامند ہوگیا۔ برسات شروع ہوجانے سے اسے کچھ عرصے عظیم آباد ٹھیرنا پڑا۔ اس نے مرشد آباد حکم بھیجا کہ سراج الدولہ کی بیگم کو راجا جانکی رام کی حفاظت میں عظیم آباد بھیجا جائے۔ جسے وہ نائب صوبے دار عظیم آباد مقرر کرنا چاہتا تھا۔ جب جانکی رام پہنچا تو سراج الدولہ کو صوبے داری عظیم آباد کا خلعت دیا اور راجا جانکی رام

کو نائب کا عہدہ ملا۔ سعید احمد نے بھی بہ خوشی قبول کیا اور برسات ختم کر کے علی وردی خاں، سعید احمد اور سراج الدولہ کو ساتھ لے کر مُرشد آباد چلا گیا۔

عطاءاللہ ملک بدر

سفر کے دوران ہی میں علی وردی خاں نے حکم بھیجا کہ عطاءاللہ خاں کو جس سے ہر وقت بغاوت کا خطرہ تھا، بنگالے کی حدود سے نکال باہر کیا جائے کیوں کہ اس کے خلاف بدظنی کے ثبوت روز بہ روز بڑھتے جاتے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو عطاءاللہ خاں کو جان سے مار دیتا۔ مگر علی وردی نے اسی پر کفایت کی اور اسے اپنے بال بچے، مال و سامان لے جانے کی اجازت دی اور تاکید کی کہ اسے کسی قِسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ ساٹھ لاکھ رُپے، ستّر ہاتھی اور منوں سونا اور جواہرات ساتھ لے کر عطاءاللہ بنگالے سے نکل گیا۔

علما کا ہجوم

علی وردی خاں نے بنگالے میں علم و عمل کا چرچا کرنے کے لیے ہندستان کے مشہور و مستند علما میں سے میر محمد علی حزیں، طاہر حسن خاں اور حاجی عبداللہ کو بُلوا کر مُرشد آباد میں آباد کیا اور انھوں نے اعلا پیمانے پر درس دینے شروع کیے۔

پورنیا کی صوبے داری اور ہگلی کی فوج داری خالی ہو گئی تو علی وردی خاں نے سعید احمد کو پورنیا کی صوبے داری اور سراج الدولہ کو ہگلی کی فوج داری عطا کی۔ انھی دنوں میں اس کا دیوان رائے رایاں چین رائے فوت ہو گیا اور اس کی جگہ راجا بیروِرت مقرر ہوا۔

مرہٹے پھر آ دھمکے

سطور بالا میں ذکر آ چکا ہے کہ جانوجی میر حبیب کو عنانِ سپہ سالاری سپرد کر کے ناگ پور کو

لوٹ گیا۔ بات یہ تھی کہ جانوجی کی ماں فوت ہوگئی تھی اس لیے وہ نہ ٹھیر سکتا تھا۔ وہاں سے اس کے باپ راگھوجی نے اس کے بھائی سبھا جی کو میر حبیب کی مدد کو بھیجا۔ علی وردی خاں کو پرچہ لگا تو وہ بھی ان کی سرکوبی کو روانہ ہوا اور میر حبیب کے قریب بندھا پور میں خیمے لگائے۔ معمولی سی لڑائی میں مرہٹوں کے قدم اکھڑ گئے اور جنگلوں اور پہاڑوں میں جا چھپے اور علی وردی خاں نے تعاقب جاری رکھا مگر مرہٹوں اور افغانوں کا کوئی نشان نہ ملا۔ علی وردی نے کٹک اور بارہ بھاٹی کے قلعوں کی طرف توجہ کی۔ محاصرہ شروع ہوا تو قلعے دار سید نور اور دھرم داس حاضر ہوئے اور صبح کو قلعہ حوالے کرنے کا وعدہ ہوا۔ علی وردی نے انھیں سراج الدولہ کے حوالے کیا کہ اگر صبح تک قلعے حوالے نہ کیے جائیں تو ان کی گردن ماری جائے۔ سراج الدولہ نے انھیں ایک خیمے میں نظر بند کر رکھا تھا۔ اس کے پہلو میں اپنا خیمہ لگایا اور ساری رات پہرے داروں کی نگرانی کرتا رہا مگر انھوں نے قلعے حوالے نہ کیے۔ صبح کو سرانداز خاں نے اُن کے چھڑانے کے لیے حملہ کردیا۔ مگر سراج الدولہ نے مقابلہ کیا اور سرانداز خاں کا اپنا سر تن سے جُدا ہوگیا۔[1] قلعوں کا محاصرہ پندرہ دن تک رہا۔ آخر محصورین نے اطاعت قبول کی۔ علی وردی خاں نے زیادہ قیام بے کار خیال کرکے مُرشد آباد کی طرف مراجعت کی۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ خبر آئی کہ ان کی کٹک سے روانگی کے سات دن بعد میر حبیب اور رانا جی نے اپنے بلوں سے سر نکالا ہے اور کٹک کا محاصرہ

---

[1] نوٹا مانس (NOTA MANUS) مترجم سیر المتاخرین اس واقعے کو مصنف کی اختراع قرار دیتے ہیں۔ جن میں تضاد کثرت سے ہے۔ جلد دوم ص ۸۱۔

کر لیا ہے۔ یہ خبر علی وردی کو بالسر میں ملی اور اس کے بعد یہ پرچہ لگا کہ سید نور صوبے دار کٹک سخت مجروح ہو کر گرفتار ہو گیا۔ مگر برسات کے باعث اس نے اس مہم کو سر دست ملتوی رکھا اور مرشد آباد کے نامکمل محل موتی جھیل میں قیام کیا۔ سراج الدولہ نے فوج کی تنظیم کی جسے علی وردی خاں نے بہت پسند کیا۔ برسات ختم ہو گئی تو علی وردی خاں نے لام بندی کی اور کٹوا کے راستے بردوان اور میدنا پور جا پہنچا۔ میدنا پور میں قیام ہوا اور اس کی فوج داری پر سراج الدولہ کی فوج کا ایک سردار علی قلی خاں مقرر ہوا۔ سراج الدولہ کی کمان میں ایک لشکر بالسر کی طرف روانہ ہوا جہاں میر حبیب ٹھیرا تھا۔ سراج الدولہ نے دوست محمد اور میر قاسم کو ہراول بھیجا کہ دشمن کی نبض دیکھیں اور عقب میں آپ روانہ ہوا۔ مرہٹوں نے برائے نام مقابلے کے بعد راہِ فرار اختیار کی اور سراج الدولہ نے فتح نامہ گزارش کر کے مزید احکام کی استدعا کی۔ کیوں کہ اسے صرف بالسر تک جانے کی ہدایت ہوئی تھی۔

اس عرصے میں علی وردی خاں سراج الدولہ کے لیے بہت بے چین رہا کیوں کہ اس کی تربیت کے لائحے میں شامل تھا کہ ہمیشہ سراج الدولہ زیرِ نظر رہے۔ آخر اسے کمک پہنچانے کے لیے آپ بھی روانہ ہو گیا۔ نراین نگر میں دونوں فوجیں ملیں۔ سراج الدولہ نے قدم بوسی کا شرف حاصل کیا اور دونوں فوجیں مدنا پور میں مقیم ہوئیں۔ انھی دنوں میں سراج الدولہ نے ایک بڑے غبن کا کھوج لگایا جس سے تہلکہ مچ گیا۔ اور لاکھوں روپے خزانۂ عامرہ میں داخل ہوئے۔ یہاں پرچہ لگا کہ مرہٹے مرشد آباد پر حملہ کرنے والے ہیں۔ علی وردی خاں نے مرشد آباد کو روانگی

کا حکم دیا۔ بردوان میں خبر آئی کہ مرہٹے پھر پہاڑیوں کی طرف چلے گئے ہیں۔ یہاں ایک پہاڑی زمین دار حاضر ہوا اور بیان کیا کہ اسے پہاڑیوں میں ایک خفیہ راستہ معلوم ہے جس سے بنگالی فوج مرہٹوں تک پہنچ سکتی ہے۔ زمین دار کو ہاتھی پر سوار کیا گیا اور فوج اس کے پیچھے چلی۔ جب چار پانچ کوس گئے تو زمین دار نے کٹار اپنے پیٹ میں بھونک لی۔ جب اس سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ وہ راستہ بھول گیا تھا اس لیے اس نے خودکشی کرنا مناسب سمجھا۔ اس سے علی وردی خاں بہت کبیدہ خاطر ہوا اور وہ واپس جاکر دیوان مانک چند کے باغ میں مقیم ہوا۔ دیوان مانک چند کو جو شرفِ مہمانی ملا یہ آج تک کسی امیر کو نصیب نہ ہوا تھا۔ یاد رہے کہ میر جعفر نوازش محمد خاں کی کوشش سے پھر بخشی فوج مقرر ہوا تھا اور جدید غبن کا وہی ذمے دار تھا۔ وہ حسب طلب حاضر ہوا۔ علی وردی خاں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ سارا دربار خوف سے کانپنے لگا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ میر جعفر کسی الزام کی تصریح نہ کر سکا اور بت بنا کھڑا رہا۔ آخر اس حکم پر بلا ٹلی کہ میر اسماعیل کی بجائے قاضی ہادی خاں کو اس کا نائب بنایا جائے۔ یہ سراج الدولہ کی رحم دلی اور عنایت کا ثمر تھا۔

مرہٹے پھر میدنا پور کے قرب و جوار میں چھاپے مارنے لگے۔ تو علی وردی خاں اس طرف متوجہ ہوا اور مرشد آباد سراج الدولہ کے سپرد کیا۔

مہدی نثار خاں کی شرارت

جب سراج الدولہ عظیم آباد سے مرشد آباد آیا تو سیر المتاخرین کے

چچا میرزا مہدی نثار خاں جو بڑا بہادر، بڑا لائق، فرشتہ خصلت اور سراج الدولہ کے والد زین الدین احمد خاں کا بڑا دوست تھا، مگر علی وردی خاں اسے منھ نہ لگاتا تھا اور اسے نفرت سے دیکھتا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح سراج الدولہ کے دربار میں بار حاصل کیا۔ اس فرشتہ نما شیطان نے سراج الدولہ کو علی وردی خاں کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا۔ مورخ صاحب فرماتے ہیں کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سراج الدولہ کس قدر احسان فراموش اور بد فطرت تھا۔ مگر اپنے عم بزرگ وار کی شان میں قصیدہ کہے جاتے ہیں جس نے ایک معصوم دل کو گناہ پر اکسایا اور صاف معنوں میں یہ نہیں کہتے کہ اس ہدایت کے چند روز بعد سراج الدولہ نے نہ صرف اسے نوکری سے برطرف کر کے مرشد آباد سے نکال دیا بلکہ مورخ کے بھائی علی قلی خاں کو موقوف کیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ سراج الدولہ کسی بات پر مچل گیا اور عظیم آباد چلا گیا۔ وہاں سے اشرف النسا بیگم اور علی وردی خاں اسے منا کر لے آئے۔ بچے ایسا کرتے اور والدین انھیں مناتے ہی رہتے ہیں۔ جیسے بغاوت، سازش، علی وردی خاں کا قتل، نمک حرامی اور کیا کچھ نہیں بنایا گیا۔ اسے سراج الدولہ کو بدنام کرنے کا سنگ بنیاد بنایا جاتا ہے۔ حالاں کہ یہ ظاہر ہے کہ علی وردی خاں نے اسے اپنا وارث بنا کر بنگالہ، اڑیسہ اور بہار کا مالک بنا دیا تھا پھر اس کا نوازش محمد خاں کی دولت بے کراں اور سعید احمد کی صوبے داری پورنیہ پر رشک و حسد کرنا بے معنی ہی نہیں بلکہ بے ہودہ ہے۔ مورخ نے بیان کیا ہے کہ چچا صاحب نے بھی باتیں سراج الدولہ کو کہہ کر ورغلانے کی کوشش کی تھی۔ چوں کہ یہ محض طبع زاد کہانی ہے اس لیے اس کی تفصیل میں جانا

لاحاصل ہے۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ مہدی نثار خاں نے عظیم آباد میں سراج الدولہ کے نام پر بغاوت کی اور مارا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مورّخ نے مہدی نثار خاں کی بدباطنی کو ڈھانپنے کے لیے یہ طومار باندھا ہے۔

علی وردی خاں نے کٹک کے قلعے میں موسمِ برسات بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور بیگمات بھی مُرشد آباد سے آگئیں۔ قلعے کی مرمّت اس طرح ہوئی کہ بالکل نیا بن گیا۔ میر جعفر جیسے امیروں پر کیا اعتماد ہو سکتا تھا اس لیے علی وردی خاں سراج الدولہ کو بھی عظیم آباد سے ساتھ لے آیا جہاں وہ اسے منانے کے لیے گیا تھا۔ راستے میں ایک سخت بیماری میں مبتلا ہو گیا اور کئی دن صاحب فراش رہنے کے بعد غسلِ صحت کا جشن منایا۔ راستے میں سعید احمد خاں نے کرن گولا پر شاہانہ استقبال کا انتظام کیا اور ساری فوج کو دعوت دی۔ مگر علی وردی خاں بہ وجہ ناسازیِ طبع وہاں نہ جا سکا اور سیدھا مُرشد آباد کو نکل گیا۔ سعید احمد خاں نے مُرشد آباد پہنچ کر نیازنہ حاصل کیا اور وہاں اس کی لڑکی کی نسبت سرافراز خاں مرحوم کے بیٹے آغا بابا سے ہوئی اور شادی مُرشد آباد میں ہونی قرار پائی۔

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ علی وردی خاں میدنا پور میں فوج چھوڑ کر چلا آیا۔ جو اگرچہ مرہٹوں کے مقابلے کے لیے کافی سے زیادہ تھی۔ مگر اس کے کمان دار میر جعفر اور درلب رام کی بزدلی سے ڈر کر علی وردی خاں کا وہاں جانا ناگزیر تھا۔ سراج الدولہ کو تنہا بھیجنا گوارا نہ تھا اور مرہٹے سامنے کھڑے تھے اس لیے فوج لے کر میدنا پور پہنچ گیا۔ مرہٹوں نے چند گھنٹوں کی لڑائی کے بعد شکست کھائی اور بنگالے کے جنگلوں میں چھپ گئے۔ تعاقب ہوا اور وہ اُڑیسہ میں پہنچ گئے اور علی وردی خاں نے

مرشد آباد جاتے ہوئے کٹوا میں قیام کیا۔

میر حبیب اور مرہٹہ سرداروں نے اس لڑائی کو فائدے مند نہ پاکر صلح کی خواہش ظاہر کی اور شرائطِ صلح علی وردی خاں کی مرضی پر چھوڑ دیں۔ علی وردی خاں کی عمر اس وقت پچھتّر سال کی تھی۔ لوگ بھی نت نئے حملوں سے تنگ آ گئے تھے اور یہ ناحق کی خوں ریزی سب کے لیے اجیرن ہو رہی تھی۔ اس لیے علی وردی خاں نے پیغامِ صلح پسند کیا اور میر جعفر کو اجازت دی کہ وہ کسی معقول سفیر کے ذریعے شرائط کا مسودہ بنائے۔ اس لیے میر حسین علی اور میر غوث علی کو مرہٹوں کے کیمپ میں بھیجا۔ میر حبیب بہت خوش ہوا۔ اس نے علی وردی خاں کی اطاعت قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور میرزا صالح کو ان کے ساتھ بھیجا۔ جعفر نے مرہٹوں کے نمایندوں کو علی وردی خاں کے روبرو کٹوا میں پیش کیا اور وہ انھیں ہمراہ لے کر مرشد آباد آیا۔ وہاں میرزا صالح نے عرضی پیش کرکے میر حبیب کی اطاعت اور فرماں برداری کا یقین دلایا اور ان شرائط پر صلح ہو گئی کہ:

میر حبیب علی وردی خاں کی ملازمت قبول کرے گا اور راگھوجی کی بقایا ادا کرنے کا بندوبست کرے گا۔ بارہ لاکھ روپیہ سالانہ راگھوجی کو ادا ہوتا رہے گا اور مرہٹے کبھی اس علاقے میں قدم نہ رکھیں گے۔ فریقین نے یہ شرائط قبول کرلیں اور میرزا صالح، مصلح الدین محمد خاں کا خطاب، ایک ہاتھی اور خلعت لے کر واپس گیا۔ اب علی وردی خاں کے لیے صرف یہ کام رہ گیا کہ دیہات آباد کرے، بنجر اراضیات میں کاشت کرائے، کسانوں کی حوصلہ افزائی ہو اور اُجڑے قصبوں کو آباد کرے۔ اس نے میدناپور کی فوج داری راجا رام سنگھ کے سپرد کی جس نے

مرہٹوں کے برباد کردہ مقامات کی مرمت کی اور ملک پھر سے آباد ہو گیا۔

دیوان کا انتخاب اسی عرصے میں رائے رایاں بھیروت مشیر مالیات کا انتقال ہو گیا اور قلم دانِ وزارت راجا کیرت چند ولد رائے رایاں عالم چند کے نام ہوا اور اس کی آمد تک یہ کام امید رائے نائب کے سپرد ہوا۔ کیرت چند فارسی کا زبردست انشا پرداز اور حساب کتاب کا ماہرِ کامل تھا۔ جب اس نے قلم دانِ وزارت سنبھالا تو متعدد زمین دار جگت سیٹھ اور راجا بردوان کے نام بڑی باقی نکالی۔ سب نے اس حساب کی صحت کو تسلیم کیا اور دو کروڑ سے زیادہ رقم دیکھتے دیکھتے خزانے میں داخل ہو گئی۔ مگر یہ وزیر صرف دو سال زندہ رہا اور فوت ہو گیا۔ اس کا نائب امید رام وزارت کے خلعت سے نوازا گیا اور رائے رایاں کا خطاب ملا۔ انھی دنوں میں جانوجی نے میر حبیب کو قتل کر دیا اور اڑیسہ کی حکومت پر براہ راست تسلّط جمالیا۔ اسی سال راجا جانکی رام نائب صوبے دار عظیم آباد نے انتقال کیا اور راجا رام نرائن اس جگہ مقرر ہوا۔

سعید احمد خاں کی لڑکی اور آغا بابا پسر نواب سرانداز خاں کی شادی کی تیاری بڑی دھوم دھام سے ہو رہی تھی کہ اکرام الدولہ نے مرض چیچک میں مبتلا ہو کر رحلت کی اور سارا بنگالہ وقفِ ماتم ہو گیا۔ نوازش محمد خاں کو ایسا صدمہ ہوا کہ وہ تارک الدنیا ہو گیا اور خود اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ کھانا آیا کھا لیا، میلے کپڑے گندے کمرے میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کا مشغلہ صرف یہ تھا کہ اکرام الدولہ کو یاد کرتا اور عورتوں کی طرح بین کر کے روتا۔ نوازش محمد خاں کی یہ ناگفتہ بہ

حالت تھی کہ اکرام الدولہ کی ایک کنیز کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ سب نے نوازش محمد خاں کو مبارک باد دی کہ خدا نے نعم البدل عطا کیا ہے۔ علی وردی خاں نے اس بچے کو سر پر اٹھا لیا۔ مراد الدولہ کا خطاب ششش ہزاری منصب، پالکی، نقارہ، تخت رواں، ماہی مراتب سب اس کے گہوارے کے گرد جمع کر دیے۔ تعلیم و تربیت کا شاہانہ انتظام ہوا اور نوازش محمد پھر دُنیا میں آ گیا۔ یہ لڑکا میر جعفر کے ہاتھ سے بچ گیا۔ لوٹلمانس کہتے ہیں کہ یہ لڑکا اپنے خاندان کی طرح بے حد خوب صورت تھا۔ اسے انگریزوں سے پانسو روپے ماہوار پنشن ملتی تھی۔ اس نے جعفر اور قاسم کی ہنگامہ آرائیوں سے کوئی سروکار نہ رکھا اور آرام کی زندگی بسر کی۔

حسین علی خاں کا قتل اور سراج الدولہ پر حملے

اب ہم اس مقام پر پہنچے ہیں جہاں سیر المتاخرین سراج الدولہ کو جلی کٹی سناتا ہے۔ اس کے پُرزور قلم نے اتہامات کے انبار لگا دیے جنھیں اگر درست تسلیم کیا جائے تو سراج الدولہ جیسا لُچّا، شہدا، بازاری اور آوارہ گرد شاید دنیا کے طبقہ پر نظر نہ آئے۔ لیکن ان تمام الزامات کا گھروندا اپنے آپ ہی گر پڑتا ہے جب وہ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں کر سکتے جس سے سراج الدولہ کی اوباشانہ زندگی کی تائید ہوتی ہو۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ غلام حسین طباطبائی مصنف کتاب مذکور کو سراج الدولہ سے ذاتی عناد تھا جس کے ثبوت سے یہ کتاب پٹی پڑی ہے۔ پھر یہ کتاب سرکار کمپنی کی براہ راست سرپرستی میں لکھی گئی جن کی اغراض چاہتی تھیں کہ سراج الدولہ کو ہر پہلو سے ناقابل حکومت ثابت کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان اور ہندستان کے انگریز پرست

طبقے میں اس کتاب کو وہ اہمیت دی جاتی ہو جس کی وہ مستحق نہیں اور جس کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہو کہ یہ کتاب جانب داری کے عیب سے پاک نہیں۔ اور اس قابل نہ تھی کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرکے یورپ میں پھیلایا جاتا اور اس طرح کلائیو کی وحشیانہ چیرہ دستیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی۔ سراج الدولہ کی شان میں فرماتے ہیں:

علی وردی خاں پیرانہ سالی کے باعث سراج الدولہ کی نگرانی کرنے سے عاجز آگیا تو سراج الدولہ کھیل کھیلا (مگر یہ کب ہوا۔ تاریخ سے تو یہی ثابت ہو کہ علی وردی خاں آخر دم تک سراج الدولہ کو سینے سے لگائے رہا) اور اپنے دادا حاجی احمد کی رندِ مشربی سے آگے نکل گیا جو بڑا زن پرست تھا۔ علی وردی خاں کے عروج میں زن و مرد اس کے اوباشانہ مشغلوں کے لیے وقف ہو گئے تھے۔ جن واقعات کو بیان کرنے سے شرم آتی ہو۔ اس کی تمام بیٹیاں اور سراج الدولہ ایسی شرمناک اور حیا سوز حرکات پر اُتر آتے تھے کہ عامیانہ اخلاق بھی انھیں برداشت نہ کرسکتا تھا۔ چہ جائے کہ ان کے مرتبے کے اشخاص کو زیب دیتیں۔ اس کا لاڈلا اور چاہتا نواسہ سراج الدولہ بازاروں اور گلیوں میں دوڑتا پھرتا تھا اور ایسی نامعقول حرکتیں کرتا تھا کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ وہ علی وردی خاں کے بچوں اور پوتوں کو ہمراہ لے کر بازاروں میں گھومتا تھا اور ایسی ذلیل حرکتیں کرتا تھا جو اس خاندان کی شان کے شایاں نہیں تھیں اور صاف نظر آتا تھا کہ یہ بدمعاشیاں رنگ لائیں گی اور سراج الدولہ خاندان کو ٹھکانے لگا کے چھوڑے گا۔ کوئی اسے نہ روکتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ سراج الدولہ کے ظلم و ستم کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ سراج الدولہ کے اس

چلن کو علی وردی خاں نظرانداز کر دیتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خصائل اس کی ایسی طبیعت ثانی بن گئے کہ وہ آخرکار بالکل نڈر ہو گیا۔ بلا خوف وخطر اور شرم و حیا کے ہر قسم کی بدمعاشی رات دن کرنے لگا۔ خواہشاتِ نفسانی کے پورا کرنے میں وہ مرد اور عورت میں تمیز نہ کرتا تھا اور ہر شخص اس کی بے روک بدمعاشیوں کا شکار ہو رہا تھا۔ ان شیطانی اغراض کو پورا کرنے کے لیے اس نے غنڈوں کا ایک جتھا بنا لیا تھا اس لیے اس کا کردار سراسر بدمعاشی بن گیا۔ جب ان حرکات کا موقع نہ ملتا تو وہ آزردہ اور آشفتہ ہو جاتا۔ اُسے نیک و بد کی کوئی تمیز نہ تھی۔ اس کی بدمعاشی قریبی رشتے دار کی پروا نہ کرتی تھی۔ جہاں سے گزر جاتا تھا عفت و عصمت کو آگ لگا جاتا تھا۔ ان حرکات سے لوگوں نے یہ خیال کرنا شروع کیا کہ اس کے دماغ کا توازن ٹھیک نہیں رہا اسی لیے وہ امرا کے محلات کو اپنا ہدف بنانے میں دریغ نہیں کرتا۔ جب لوگ اسے دیکھتے تو کہتے تھے "وہ آیا۔ خدایا، ہمیں اس سے بچا۔"

طباطبائی صاحب دروغ گوئی میں بے باک تو ہیں مگر کمتھا کا لنگر نہیں سنبھال سکتے اور نیم صداقت میں اس قدر جھوٹ کی آمیزش کرتے ہیں کہ تضاد پر تضاد پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ انھوں نے جو معائب سراج الدولہ سے منسوب کیے اس میں اپنی مزدوری بے شک حلال کر لی۔ لیکن ان اتہامات کی نسبت کوئی ایسا واقعہ نہیں بتایا جس سے پایا جائے کہ اس نے گلیوں میں کیا حرام کاری کی۔ اس کی کون سی بدمعاشی کا علی وردی خاں کو پتا لگا اور وہ چُپ ہو رہا۔ آپ نے سارے خاندان کو ہدفِ ملامت بنایا کیوں کہ اس سارے خاندان

نے آپ کے سارے خاندان سے ہمیشہ بے اعتنائی کی۔ چین ملا تو سرکار کمپنی سے جو شفقت ہیں۔ مگر آپ بید ہیں کچھ تو ایمان داری بھی کی ہوتی۔ بے بنیاد سبّ و شتم ہر شخص کر سکتا ہے۔ مگر آخر صداقت بھی تو کوئی چیز ہے البتہ آپ شہامت جنگ کے بہت مداح ہیں (صفحہ فارسی ۵۹) کیوں کہ یہ نواب ان کی والدہ جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتا تھا جس کا خود انھیں اعتراف ہے۔ سچ ہے جس کا کھائیں اس کا گائیں۔ ایک کہانی اور آپ کی زبانی سُنیے:۔

سراج الدولہ کا تکبّر اور رعونت اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ اس نے حسین قلی خاں اور اس کے بھائی حیدر قلی خاں کی بلند پایہ خدمات کی بھی پروا نہ کی اور ان دونوں کے قتل پر آستین چڑھائی۔ اس بیل کو منڈھے چڑھانے کے لیے اس نے ایک نوجوان کو منتخب کیا جس کا نام آغا حاذق تھا۔ یہ اُڑیسہ کا بہت بڑا زمین دار تھا جہاں حسین الدین خاں حسین قلی خاں کا برادر زادہ نائب صوبے دار تھا۔ یہ زمین دار نائب صوبہ کے خلاف شکایتوں کا پلندا لے کر آیا تھا جو نوازش محمد خاں کے سامنے پیش کی گئیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے توجہ نہ کی اور سراج الدولہ نے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ڈھاکے واپس چلا جائے اور حسین قلی خاں کو قتل کر دے۔ اس خونِ ناحق نے ڈھاکے میں ہنگامہ برپا کر دیا اور لوگ ششدر رہ گئے۔ جب لوگوں کو پتا ملا کہ آغا حاذق کے پاس اس کے قتل کرنے کا کوئی حکم نہ تھا تو انھوں نے اس کی بجائے اس کے باپ آغا باقر کو مار ڈالا۔ آغا حاذق مُرشد آباد بھاگ گیا سراج الدولہ نے کچھ دن اس معاملے کو دبائے رکھا اور اپنے خاندان کے سب

اراکین کو حسین قلی اور حیدر قلی کے خلاف کر دیا۔ اشرف النسا بیگم نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لیا اور علی وردی خاں کو یہ مشورہ دیا کہ ان دونوں بھائیوں کو فوراً قتل کیا جائے۔ علی وردی خاں قائل تو ضرور ہو گیا مگر اس نے یہ شرط لگائی کہ پہلے نوازش محمد خاں کی رضامندی حاصل کی جائے۔ اشرف النسا بیگم نے خاوند کی منظوری لے کر اپنے داماد نوازش محمد خاں کی طرف توجہ کی۔ اس کی بیگم گھسیٹی بیگم کو اپنا ہم نوا کر کے نوازش محمد خاں کو بھی اس طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ گھسیٹی بیگم کو سراج الدولہ سے ایک مدت سے عناد تھا اور حسین قلی خاں سے بھی ناراض ہو گئی تھی اور اس کی ناراضگی اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ نوازش محمد خاں کو آمادہ کرنے میں اشرف النسا سے ہم آواز ہو گئی۔ نوازش محمد خاں ایک کم زور شخص تھا دُنیا و مافیہا سے بے خبر۔ وہ اس سازش کے دام میں آ گیا اور مان گیا کہ یہ دونوں بھائی گردن زدنی ہیں جس کے لیے وہ ہر دو جہاں میں قابلِ ملامت ہو کیوں کہ حسین قلی خاں اس کا بڑا گہرا دوست تھا اور نوازش محمد خاں نے قرآن پر حلف لیا تھا کہ وہ ہمیشہ اس کے جان و مال کی حفاظت کرے گا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو علی وردی خاں اس الزام سے بچنے کے لیے راج محل چلا گیا۔ علی وردی خاں کے جانے کے بعد سراج الدولہ آپ نوازش محمد کے پاس گیا اور اس کی رضامندی کی تصدیق کرا کے شام کے وقت محل کو واپس جا رہا تھا کہ راستے میں حسین قلی خاں کا مکان آ گیا۔ حسین قلی خاں ڈر کے مارے خانہ نشین ہو چکا تھا باہر نہ جاتا تھا۔ سراج الدولہ نے حکم دیا کہ دونوں بھائیوں کو باہر لایا جائے۔ حسین قلی خاں

نے نوازش محمد خاں سے استمداد کی مگر اس نے ٹال دیا۔ سپاہی حسین قلی خاں کو پکڑ کر اپنے مالک کے پاس لے گئے اور ظالم، بے رحم، سنگ دل وحشی نے حسین قلی خاں کو قتل کرا دیا۔ اس کے بھائی حیدر قلی خاں کی بھی وہی گت بنی"۔

اب ہمارے مصنف مبصر بلکہ پیمبر کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں کہ "اس قتل کی سزا میں علی وردی خاں کا خاندان جلد تباہ ہو جائے گا" مگر کیوں؟ اس کے متعلق وہ حسب عادت خاموش ہیں۔

کچھ پتا نہیں چلتا کہ اس قتل کو اس قدر اہمیت کیوں دی جاتی ہے۔ مشرقی حکومتوں میں ایسا قتل کی کوئی انوکھی بات نہیں۔ ایسے امرا کے قتل کی مثالیں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ شاید ہی کسی حکومت کا دور اس الزام سے پاک ہو۔ بات یہ ہے کہ سراج الدولہ کے خلاف کوئی بات نہ پائی تو اس واقعے کو بانس پر چڑھانے کی کوشش کی۔

مورخم دار کہتے ہیں کہ سراج الدولہ ایک مہم میں ناکام رہا تو واپس آکر غصے میں حسین قلی خاں اور اس کے بھائی کو قتل کر ڈالا۔ اس میں بھی معاملہ مبہم رہ جاتا ہے۔ (مورخم دار ص 95)

راجندر ناتھ بنرجی اپنی کتاب بیگمس آف بنگال میں یوں رقم طراز ہیں:-

"حسین قلی خاں گھسیٹی بیگم کے خاوند (نوازش محمد خاں) کا دوست تھا گھسیٹی بیگم اسے چاہتی تھی اور اس کے عروج کی خواہاں تھی۔ اس بات نے نواب (نوازش محمد خاں) کو بیگم سے بدظن کر دیا اور باہمی فتنہ فساد کی نوبت پہنچی مگر

وہ حسین قلی خاں کی طرف داری سے باز نہ آئی اور اس کی دشمن ہوگئی۔ سراج الدولہ بھی حسین قلی خاں کے اطوار سے خوش نہ تھا اور وہ اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ اس نے علی وردی خاں کو حسین قلی خاں کے قتل کا حکم صادر کرنے کا مشورہ دیا مگر چوں کہ نوازش محمد خاں کی رضا ضروری تھی اس لیے وہ فوراً حکم نہ دے سکا۔ گھسیٹی بیگم نے اپنی ماں اشرف النسا سے مل کر نوازش محمد خاں کو رضامند کر لیا اور یوں اس کا خاتمہ ہوا۔[۵۱]

نوٹا مانس طباطبائی سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور یوں حاشیہ آرائی کرتے ہیں:-[۵۲]

"مصنّف جس بات کو ناواجب سمجھ کر اس کے بیان کرنے سے اغماض کرتا ہے وہ عورتوں کے لیے (ہندستانی یا مغربی؟) چنداں ناواجب نہیں۔ بات یہ تھی کہ حسین قلی خاں ایک خوب صورت گھبرو جوان تھا اس کی گھسیٹی بیگم سے آشنائی تھی۔ پھر وہ گھسیٹی بیگم کو چھوڑ کر آمنہ بیگم (والدۂ سراج الدولہ) سے وابستہ ہوگیا۔ حسین قلی خاں دونوں ہاتھوں سے کام کرتا تھا۔ اس کا کئی دفعہ نوازش محمد خاں سے جھگڑا ہوا تھا جو قوتِ مردمی سے محروم تھا۔ مرشد آباد میں اِس وقت (۱۷۹۰ء) ایسے آدمی موجود ہیں جنھوں نے

---

۵۱ بیگمات بنگال ترجمہ ص۱۳ ۔

۵۲ سیر المتاخرین جلد دوم ص۱۲۳ نوٹ ۵۱ ۔

نوازش محمد خاں اور گھسیٹی بیگم کی اسی قضیے پر کئی دفعہ لڑائی ہوتی دیکھی۔ مگر ان باتوں کی تفصیل کو مغربی اخلاق گوارا نہیں کرتا۔"

اگر لوفرضناً یہ سب روایتیں درست تسلیم کی جائیں تو اگر سراج الدولہ کی غیرت یہ بے عزتی گوارا کرتی تو اس سے بدتر انسان کون ہو سکتا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا اس سے کم کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ حسین قلی خاں نے علی وردی خاندان کی عصمت پر حملہ کیا تو اس کی سزا سوا قتل کے کیا ہو سکتی تھی۔ سراج الدولہ تو کجا ایک ادنا غیور ہندستانی ایسی بے حرمتی گوارا نہیں کر سکتا لیکن یہ تمام داستان تنقید کے معیار پر نہیں اُترتی اور سراج الدولہ کی کوئی خاص ذمے داری نہیں پائی جاتی۔

ان تمام روایات کو سامنے رکھ کر درایت کی نگاہ سے کام لیں تو پایا جاتا ہے کہ حسین قلی خاں نے نوازش محمد خاں کی نوازشات سے ناجائز طور پر فائدہ اٹھانا چاہا اور یہ ڈینگیں مارنے لگا کہ اس کا گھسیٹی بیگم سے واسطہ ہے۔ گھسیٹی بیگم کو خبر ہوئی تو لازماً وہ بگڑ گئی۔ اس نے اپنی ماں اشرف النسا بیگم، اپنے باپ علی وردی خاں کے کان بھرے۔ سراج الدولہ نے سُنا تو اس کی رگِ حمیّت بھی بھڑکی۔
اشرف النسا بیگم نے علی وردی خاں سے براہ راست شکایت کی جس میں سراج الدولہ کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ اشرف النسا بیگم نے نوازش محمد خاں کو رضامند کیا جس میں سراج الدولہ قطعاً شامل نہ ہوا۔ اس سے صاف ہویدا ہوتا ہے کہ اس قتل کی محرک اور کامل و واحد ذمّے دار اشرف النسا بیگم ہے نہ کہ سراج الدولہ۔ حکم جو جاری ہوا وہ سراج الدولہ کے ایما پر نہیں بلکہ علی وردی خاں نے خود پوری حزم و احتیاط سے حکم دیا۔ علی وردی خاں

نے جب اس حکم کی بجا آوری سراج الدولہ کے سپرد کی تو اس نے پھر نوازش محمد خاں سے استمزاج کرنا ضروری خیال کیا تاکہ چچا کے خلاف مزاج کوئی بات عمل میں نہ آئے۔ نوٹا مانس کا یہ کہنا کہ نوازش محمد خاں کا گھسیٹی بیگم سے حسین قلی خاں کے بارے میں اکثر جھگڑا رہتا تھا، مہمل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو نوازش محمد خاں کی رضامندی حاصل کرنا اس قدر دقت طلب نہ خیال کیا جاتا اور حسین قلی خاں گرفتاری کے وقت نوازش محمد خاں سے مدد مانگنے کی جرأت نہ کرتا۔ ان سب باتوں سے بجا طور پر یہ اخذ ہوتا ہے کہ حسین قلی خاں اور گھسیٹی بیگم کا ناجائز تعلق کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ حسین قلی خاں نے یہ ڈینگ ماری اور کیے کی سزا پائی۔ نوٹا مانس جس کا گزارہ صرف کمپنی کی ذرہ نوازی پر تھا، حقِ نمک ادا کرنے کی کوشش میں آمنہ بیگم کی عصمت اور حیاداری پر جو حملہ کرتا ہے اس میں اگر ذرا بھی صداقت ہوتی تو طباطبائی اسے جلی حروف میں لکھتا۔ سٹر چیٹر جی جنھوں نے بیگمات بنگال تحریر کرنے میں بڑی تحقیق سے کام لیا ہے وہ آمنہ بیگم کے متعلق اعتراف کرتے ہیں کہ "یہ خاتون نہایت نیک خیال اور حیا پرور تھی۔ اپنی لڑکیوں کو ہمیشہ حیا، حفظِ عصمت اور پاسِ آبرو کی تلقین کرتی تھی اور بدنامی اور رسوائی سے بچنے کی تعلیم دیتی تھی۔" پھر آمنہ بیگم سراج الدولہ اور اپنے دوسرے بیٹے میرزا مہدی کے ساتھ علی وردی خاں کے محل میں اپنی والدہ اشرف النسا بیگم کے ساتھ رہتی تھی۔ وہاں اگر حسین قلی خاں جھانک کر بھی دیکھتا تو گولی اس کے سینے سے پار ہو جاتی۔ بات یہ ہے کہ حسین قلی خاں کو قتل محض آغا صادق

نے ذاتی دشمنی کی بنا پر کیا۔ ورنہ سراج الدولہ کو اس کے قتل کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ جب وہ آسانی سے علی وردی خاں سے حکم حاصل کر سکتا تھا۔ مگر جیسا کہ بیان ہوا ایسا کوئی حکم آغا حاذق کے پاس نہ تھا۔

نوازش محمد خاں کی وفات

اکرام الدولہ کی وفات کے بعد نوازش محمد خاں کی صحت بگڑتی چلی جاتی تھی۔ آخر حکیموں نے تنبیہ کی کہ مرض اس حد تک پہنچ گیا ہو کہ اگر مداوا نہ کیا گیا تو نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ مگر وہ دوا سے کوسوں بھاگتا تھا۔ علی وردی خاں اسے اپنے محل میں لے گیا اور بڑے اہتمام سے علاج شروع ہوا۔ جب حالت نازک ہو گئی تو گھسیٹی بیگم اسے اپنے محل میں لے آئی تاکہ ایسا نہ ہو کہ نواب کی وفات پر سراج الدولہ اسے نظربند نہ کر دے۔ نوازش محمد خاں خوش تھا کہ مرنے کے بعد اکرام الدولہ سے ملاقات کرے گا اس لیے موت کا اسے کوئی خوف نہ تھا۔ آخر ۱۷۵۶ء میں اس نے رحلت کی اور اکرام الدولہ کے پہلو میں دفن ہوا۔ مرشد آباد میں کہرام مچ گیا کیوں کہ نوازش محمد خاں کی حاتم صفت فیاضی نے اس کے ہزاروں مداح پیدا کر دیے تھے۔ سینتیس ہزار روپے ماہ وار خیرات دینا اس کا معمول تھا۔ ماہ دار وظائف اس کے علاوہ تھے۔ یہ تمام خیرات خفیہ طور پر کی جاتی تھی اور مستحقین کے مکانات پر تھیلیاں پہنچ جاتی تھیں۔ ہر شخص کی مشکل کو حل کرنا ان کا فریضۂ حیات تھا۔ بڑی شان کی زندگی بسر کرتا تھا اور کسی کو نقصان پہنچانے سے اجتناب کرتا تھا۔ اس کے دربار میں سب کو حقہ اور چائے پینے کی

اجازتِ عام تھی۔

سعید احمد کی وفات انھی دنوں میں سعید احمد (پسر حاجی احمد) صوبے دار پورنیہ نے انتقال کیا اور اس کی جگہ سعید احمد کا بیٹا میرزا ہمایوں شوکت جنگ مقرر ہوا۔ اس کے خطاب ناصر الملک سعید احمد خاں صولت جنگ تھا۔[۱]

علی وردی خاں کی وفات اسی سال ۹ اپریل ۱۷۵۶ء کو اسّی سال کی عمر میں نواب علی وردی خاں نے رحلت کی۔ سراج الدولہ نے فوراً طبا طبائی کے دو بھائیوں ملا علی اور غالب علی کو مرشد آباد سے باہر نکال دیا اس لیے آپ سراج الدولہ کے پاس تشریف نہ لائے۔ علی وردی خاں کو اس کے خاندانی گورستان واقع خوش باغ میں دفن کیا گیا۔

انگریزوں سے علی وردی خاں کے تعلقات بلّیسٹڈ نے علی وردی خاں اور کمپنی کے تعلقات پر بڑی عالمانہ اور طویل بحث کی ہے جس کا

---

[۱] طبا طبائی نواب سعید احمد کی اور اس کے بعد اس کے بیٹے شوکت جنگ کی ملازمت میں تھے۔ اس کے بعد سراج الدولہ کی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ آپ نے سعید احمد کی تعریف کے پل باندھ دیے ہیں۔ ملازمت سے پہلے ایام میں کہا کرتے تھے کہ وہ خوب صورت عورتوں کے پیچھے دوڑا پھرتا تھا لیکن اب کہتے ہیں کہ اس نے سب باتیں چھوڑ دیں اور متقی اور پرہیزگار بن گیا مگر نوٹا مانس کہتے ہیں کہ اس کے محل میں ۵۰۰ عورتیں تھیں۔ بہیں تفاوت ۔۔۔۔۔۔۔

ماحصل حسب ذیل ہے:[۹]

"علی وردی خاں کمپنی کے حفظ و رعایت کے عوض سالانہ خراج لیتا تھا۔ وہ انھیں بنگال میں رہنے کا صرف اس حد تک روادار تھا کہ ان کی سرگرمیاں تجارت تک محدود رہیں۔ اسے ہمیشہ کمپنی کی بحری طاقت کا خدشہ رہتا تھا۔ وہ کلکتے کی قلعہ بندی کا کبھی روادار نہ ہوا۔"

علی وردی خاں کا نظامِ زندگی

علی وردی خاں کی زندگی از بس زاہدانہ و متقیانہ تھی۔ وہ نواب بھی تھا اور فقیر بھی۔ اس کی بیوی ایک تھی اور سراج الدولہ کی بھی ایک۔ علی وردی خاں کو اوباشانہ کاموں سے ابتدا ہی سے نفرت تھی۔ منشیات سے لگاؤ نہ تھا، رقص و سرود میں کوئی دل چسپی نہ تھی، نہ عورتوں کی مجلس منعقد کرتا تھا۔ اور یہ وہ خصائل ہیں جو ہندستان کے امرا میں شاید ہی کسی میں ہوں۔ پنج وقتہ نماز، تلاوتِ قرآن مجید اور تاریخ خوانی اس کی فرصت کے رفیق تھے۔ نماز میں اس نے اشراق و تہجد کو روزانہ عبادت میں داخل کیا تھا۔ صبح ہونے سے دو گھنٹے پہلے اٹھ کر، وضو کر کے عبادت میں محو ہو جاتا تھا۔ سات بجے دربار میں جاتا اور ہر کس و ناکس کی فریاد سنتا۔ دو گھنٹے یہ دربار رہتا پھر خلوت ہو جاتی جس میں شہزادوں اور خاص امرا کو بار ملتا۔ اس کے بعد مزے مزے

---

۹۵ ECHOES FROM OLD CULTURE BY BUSTND (1897) P. 6.

کی باتیں، شعر خوانی یا داستان گوئی ہوتی۔ پھر کھانا آتا اور بہت بڑا دسترخوان بچھایا جاتا۔ علی وردی خاں خود کامل باورچی تھا اور نئے سے نیا کھانا ایجاد کرتا تھا حقّہ نہ پیتا تھا مگر چائے بہت پسند تھی۔ نظم و نسق میں علی وردی خاں جہاں تک ممکن ہوتا بڑی نرمی اور فیاضی سے کام لیتا۔ گناہ بخشی اور درگذر کرنے کا موقع دینا اس کا شعار تھا۔

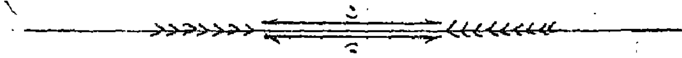
اس موقعے پر ہمارا کچھ کہنا ممکن ہے بے محل ہو مگر اس سے بہت سے تواتر سے نجات ملے گی اس لیے کہے دیتا ہوں کہ یہ مسلّمہ ہے کہ علی وردی خاں نے کبھی سراج الدولہ کو آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ یہی ماحول تھا جس میں اس کے شباب نے آنکھیں کھولیں۔ طباطبائی بلکہ کوئی مورخ بھی یہ نہیں کہتا کہ سراج الدولہ نے علی وردی خاں کے اس نظامِ عمل سے انحراف کیا ہو۔ ورنہ طباطبائی اور نوٹا مانس اسے اُبھار اُبھار دکھاتے۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نظامِ زندگی میں سراج الدولہ علی وردی خاں کا مقلد تھا اور اس کی زندگی ایسی ہی بے لوث تھی جیسی علی وردی خاں کی۔

سراج الدولہ کی نسبت علی وردی خاں کی رائے

جب دکن میں وراثت کا جھگڑا اچل رہا تھا تو بوسے نے ایک خط کے ذریعے استدعا کی کہ چندر نگر کے فرانسیسیوں کی حفاظت کی جائے۔ اس وقت علی وردی خاں نے کہا "شکر ہے کہ خدا نے سراج الدولہ کو میرے جیسا فہم و ادراک عطا کیا ہے اور وہ بہ خوبی جانتا ہے کہ خلقِ خدا پر کس طرح حکومت کرنی چاہیے۔"

سیر المتاخرین والے یہ بتا کر اس کے خلاف کہتے ہیں۔ لیکن اگر علی وردی خاں کی رائے میں سراج الدولہ اس کا صحیح جانشین نہ تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس نے شوکت جنگ کو کیوں جانشین نامزد نہ کیا اور مرتے مرتے یہ سند کیوں دے گیا جس کی کوئی تردید نہیں کر سکتا۔

جب سراج الدولہ کو جانشین کیا (۱۷۵۴ء) اس وقت سراج الدولہ بچہ نہ تھا کہ اس کی طبیعت کا اندازہ نہ لگ سکتا اور شہامت جنگ، اکرام الدولہ، سعید احمد، میرزا ہمایوں موجود تھے۔ اگر سراج الدولہ وہ تھا جو طباطبائی نے دکھایا ہے تو علی وردی خاں نے اتنے بڑے خاندان میں کسی اور کو کیوں منتخب نہ کیا۔



باب پنجم

منصور الملک، سراجِ الدولہ، میرزا محمد شاہ قلی خاں، ہیبت جنگ

(اپریل ۱۷۵۶ء - جون ۱۷۵۷ء)

مدت حکومت ۱۴ ماہ - مدت عمر ۱۹ سال

سراج الدولہ کی ۱۹ سالہ زندگی اور ۱۴ ماہ کی حکومت سے متعدد واقعات کی توقع ممکن نہیں۔ مگر علی وردی خاں کے دورِ حکومت میں سراج الدولہ کے متعلق کئی واقعات ظہور میں آئے جن سے سراج الدولہ کے حقیقی کردار پر روشنی پڑتی ہے جنھیں دہرانا محض سعی حاصل ہے۔ اس کے انداز حکومت، اس کے حسنِ تدبر، اس کی شجاعت کے نمونے ان دنوں سے ظاہر ہونے شروع ہوئے جب بچپن نے اپنی امانت لڑکپن کے حوالے کی۔ علی وردی خاں کی حکومت کے دور کے آخری چار سال درحقیقت سراج الدولہ کی حکومت ہے اور اس عرصے میں ملک میں جو امن امان رہا وہ سب سراج الدولہ کی محنت کا ثمر ہے۔

سراج الدولہ کا ذکر ہمیشہ اس کے اس خطاب سے ہوتا ہے۔ بہت

کم حضرات کو اس کا نام معلوم ہے۔ یہاں تک کہ اس میں مورخوں کو بھی اختلاف ہے۔ خادم علی اپنی تاریخ صفحہ ۴۰۹ میں اس کا نام غلام حسین خاں بتاتے ہیں۔ مرتضیٰ حسین حدیقۃ الاقالیم صفحہ ۴۵۸ میں "احمد" کہتے ہیں۔ بسٹیبڈ "محمود" سے موسوم کرتے ہیں اور قاموس المشاہیر جلد اوّل صفحہ ۲۸۴ میں یہی نام لکھا ہے۔ مگر سیر المتاخرین اور بیگماتِ بنگال اور مسند مرشدآباد کو اتفاق ہے کہ صحیح نام میرزا محمد تھا اور یہی درست معلوم ہوتا ہے کہ علی وردی خاں نے اس کا نام وفورِ محبت سے اپنے والد ماجد کے نام پر رکھا ہو۔ خطابات ایامِ شہزادگی ہی میں مل گئے تھے۔

تعلیم و تربیت

پہلے سطورِ بالا میں یہ ذکر آچکا ہے کہ علی وردی خاں نے بہترین استاد اس کی تعلیم کے لیے مقرر کیے تھے اور یہی وجہ ہے کہ تھوڑے عرصے میں اسے ضروری علوم پر عبور حاصل ہو گیا۔ سپاہ گری کے تمام نکتے اسے بتائے گئے۔ تدبیر و تنظیم کے امور علی وردی خاں اور اشرف النسا بیگم نے ذہن نشین کیے۔ علی وردی خاں نے ہر مہم میں اُسے شامل رکھا اور میدان داری کی عملی تربیت دی۔ پھر مُلک کی عنان اس کے سپرد کر کے خود دیکھا کہ وہ اس گاڑی کو کس طرح چلا سکتا ہے۔ جب اطمینان ہوا تو حکومت کی وہ سند دی جس کا بیان ہو چکا ہے۔

مسند نشینی

علی وردی خاں کے مراسمِ تعزیت بجا لانے کے بعد سراج الدولہ بنگالہ اور اُڑیسہ کی صوبے داری کی مسند پر بیٹھا۔ قلم دانِ وزارت راجا موہن لال اور علمِ سپہ سالاری میر مدن کو عطا ہوئے جس پر میر جعفر اور راجا دلبھ رام حسد کے مارے جل گئے۔

مگر زمانے نے بتایا کہ سراج الدولہ کی نظر کس قدر دوررس تھی۔ اس وقت سراج الدولہ کے دو مخالف میدان میں تھے، ایک گھسیٹی بیگم اور دوسرے میرزا ہمایوں شوکت جنگ صوبے دار پورنیہ۔ اور ان سے نپٹنا اس کا پہلا کام تھا۔ راجا موہن لال کو مہاراجا کا خطاب اور پنج ہزاری منصب ملا۔ میر مدن کو ڈھاکے سے طلب کیا گیا جہاں وہ فوج دار تھا۔ طباطبائی میر جعفر کی معزولی پر بہت بگڑتے ہیں مگر انھیں یاد نہیں رہتا کہ میر جعفر نے اپنی نالائقی کے کس قدر ثبوت بہم پہنچائے تھے اور یہ سراج الدولہ کی محض بندہ پروری تھی کہ اسے کمان دار رہنے دیا۔ علی وردی خاں نے اسے کئی دفعہ معزول کیا اور نوازش محمد خاں کی سفارشوں سے اسے عہدے ملتے رہے اور نوازش محمد خاں کی سادہ لوحی کی بہ دولت طباطبائی کے اس ممدوح مار آستیں کی پرورش ہوتی رہی۔

گھسیٹی بیگم

اس کا نام مہرالنسا تھا مگر گھسیٹی بیگم کسی نامعلوم وجہ سے موسوم ہوئی۔ مہدی بیگم اور موتی جھیل کی بیگم بھی کہلاتی تھی۔ یہ ننگ خاندان علی وردی کی بڑی لڑکی نوازش محمد پسر حاجی احمد برادر علی وردی خاں کی بیگم تھی اور علی وردی خاں کے خاندان کو تباہ کرنے کا داغ اسی کے ماتھے لگتا ہے۔ علی وردی خاں کی زندگی ہی میں وہ اس خبط میں پڑی چلی آتی تھی کہ اکرام الدولہ کے کنیزک زادہ مرادالدولہ کو جسے اس نے اکرام الدولہ کے بعد اپنا بیٹا بنایا تھا صوبے دار مقرر کرائے[1] اس غرض کے لیے اس نے بیس ہزار سپاہی ملازم رکھے۔ راج بلبھ کو جو اس کے خاوند کا وفادار ملازم تھا اپنے ساتھ شریک

---

[1] بیگمات بنگال چیٹرجی ص۲۰ ۔

کیا اور نذیر علیؔ سے تعلقات پیدا کیے۔ سراج الدولہ نے ایک خط کے ذریعے تنبیہ کی مگر اس نے پرواہ نہ کی۔[۵۲] علی وردی خاں نے اپنی زندگی ہی میں اسے ان حرکات سے باز آنے کی نصیحت کی مگر اس سرپھری خاتون نے کوئی پرواہ کی اور اپنی سازشوں کے حلقے کو اس قدر وسیع کیا کہ میر جعفر اور شوکت جنگ بھی اس میں پھنس گئے۔

سراج الدولہ نے مسند نشین ہونے پر پہلا حکم یہ دیا کہ گھسیٹی بیگم کے محل موتی جھیل کا محاصرہ کیا جائے۔ گھسیٹی بیگم کو وہاں سے لا کر کسی اور محفوظ مقام پر رکھا جائے۔ جو کچھ برآمد ہوا سے خزانۂ عامرہ میں جمع کرایا جائے۔ یہ حالات دیکھ کر اس کے بہت سے سپاہی بھاگ گئے اور محل میں ہراسانی پھیل گئی۔ میر نذیر علی بھی گھبرا گیا۔ یہی گھسیٹی بیگم کو مقابلے پر اُکسانے والا تھا۔ اس نے بہت سا رُپیہ دے کر دو امیروں کو رضامند کیا کہ وہ سراج الدولہ سے معافی دلائیں۔ گھسیٹی بیگم کی خطا معاف ہوئی۔ اسے کسی اور مقام پر بھیج دیا گیا اور اس کا مال و متاع خزانے میں داخل ہوا۔ اس واقعے کے بیان کرنے میں طباطبائی کا قلم کچھ سُست نظر آتا ہے اور وہ ان تفصیلات سے کام نہیں لیتے جو اُن کا

---

۵۱ بیگمات بنگال۔ چٹرجی صفحہ ۲۔ ۵۲ نوٹا مانس کا یہ حاشیہ ہے کہ نذیر علی حسین قلی خاں کی قسم کا آدمی تھا۔ جب وہ سراج الدولہ کے دربار کے باعث بنگالے سے بھاگا تو اس کے پاس بارہ لاکھ کے جواہرات اور بے شمار رُپیہ تھا۔ اس نے یہ سب زر و مال بنارس کے قمار خانوں میں ضائع کیا۔ یہاں تک کہ ۱۷۸۰ء میں جب مرشد آباد آیا تو قلاش محض تھا۔ سیر المتاخرین جلد ۲ صفحہ ۱۸۰ نوٹ ۹۶

شیوہ ہے۔ بنرجی نے اسے زیادہ واضح کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں[1]

جب سراج الدولہ کو پتا چلا کہ گھسیٹی بیگم اب نذیر علی کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے تو اس نے گھسیٹی بیگم کو ایک خط لکھا کہ نذیر علی اس پر اتہام لگا رہا ہے۔ یہ افواہ نواب کے خاندان کے لیے شرم ناک ہے۔ مناسب یہی ہے کہ اس کا سر کاٹ کر دربار میں بھیج دیا جائے۔ گھسیٹی بیگم نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ اس سے فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ نواب نے اسے دبانا چاہا مگر کامیاب نہ ہوا۔ گھسیٹی بیگم کو کچھ آثار اچھے نہ نظر آئے اور اس نے اپنے وفادار ملازموں نذیر علی اور راج بلب کے ساتھ موتی جھیل میں پناہ لی۔ بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ قلعہ بندی کی اور ہتھیاروں اور گولے بارود کا کافی ذخیرہ بہم پہنچایا۔ ان تیاریوں میں اسے راج بلب نے قابلِ قدر امداد دی۔ نوازش محمد خاں کے انتقال کے بعد راج بلب کو قید خانے بھیجا گیا تھا مگر گھسیٹی بیگم کی سفارش پر سراج الدولہ نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ چوں کہ اسے سراج الدولہ سے کسی فائدے کی امید نہ تھی اس لیے وہ سراج الدولہ کے خلاف سازش کرنے میں گھسیٹی بیگم کے ساتھ ہو گیا اور اپنے اہل و عیال اور مال و دولت کو کلکتے میں کمپنی کی حفاظت میں بھیج دیا۔ راج بلب ڈھاکے میں بڑا بارسوخ تھا اور ڈھاکہ کمپنی کی تجارت کا مرکز تھا اس لیے یہ انگریز تاجر راج بلب کو ممنونِ احسان کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس کے عیال کی بہت تواضع کی اور ایک محفوظ مقام پر انھیں رکھا۔ سراج الدولہ نے اپنی جانشینی کا اعلان کر کے دوسرے دن موتی جھیل کا محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ

---

[1] بیگمات بنگال ص۲۱۔

قلعہ مستحکم تھا مگر بیگم تین روز سے زیادہ مقابلہ نہ کر سکی۔ اس کو صوبے دار پورنیہ سے کمک کی امید تھی مگر وہ بھی نہ پہنچی۔ سپاہیوں نے قلعے کا دروازہ کھول دیا اور چلتے بنے۔ اس وقت اشرف النسا بیگم قلعے میں گئیں اور اپنی بیٹی کو سمجھا بجھا کر شرائط پر رضامند کر لیا۔ گھسیٹی بیگم نے میر نذیر علی کی جان بخشی اور اس کے بنگال سے نکل جانے کی اجازت مانگی جو اسے دی گئی۔ میر نذیر علی نے کچھ عرصے دہلی میں فوج جمع کرنے کی کوشش کی۔ گھسیٹی بیگم نظر بند کی گئی۔ مال و متاع، قلعہ، محلات سب ضبط ہو گئے۔ مگر سراج الدولہ نے اس کے سپاہیوں کو معافی دے دی۔ چند دنوں کے بعد گھسیٹی بیگم آزاد ہو گئی۔ اب جعفر، مہاراجا سروپ چند، جگت سیٹھ اور راج بلبھ سے مل بھگت شروع کی۔ شوکت جنگ بھی اس میں شامل تھا اور سراج الدولہ کے خلاف اندر ہی اندر زبردست سازش ہونے لگی۔ گھسیٹی بیگم نے اپنا وہ سونا نکالا جو ایک خفیہ خزانے میں رکھا تھا اور اس کا کچھ حصہ سازش کے اخراجات کے لیے میر جعفر کو دیا۔ مسند نشینی کے تغیر سے فائدہ اٹھانے کے لیے انگریز کلکتے کے گرد خندق کھودنے لگے اور قلعہ بندی میں مصروف ہوئے۔ نیز انھوں نے راج بلو (یا راج بلبھ) کے بیٹے کشن داس یا کشن بلبھ کو اپنے ہاں پناہ دی۔ کشن داس جو مال و متاع ہمراہ لے گیا اس میں گھسیٹی بیگم کے بھی زر و جواہر تھے۔ خود سری کا یہ کھلا پیام تھا جو انگریزوں نے سراج الدولہ کو دیا اور سب عہد نامے اور اقرار نامے بالائے طاق رکھ دیے۔ کشن داس سرکاری ملازم تھا۔ اس کی گرفتاری کے لیے حکم جاری ہو چکا تھا مگر وہ سپاہیوں سے نظر بچا کر ڈھاکے

سے نکل گیا اور ڈریک کی پناہ میں جا پہنچا۔ یہ خبر اس وقت ملی جب سراج الدولہ راج محل میں شوکت جنگ کی سرکشی کو دبانے کی تدبیر کر رہا تھا مگر یہ خبر سن کر وہ واپس چلا آیا۔

کمپنی سے بگاڑ

سراج الدولہ نے ڈریک سے خط و کتابت شروع کی اور اسے سمجھایا کہ یہ خندق سازی اور قلعہ بندی معاہدے کے خلاف ہے اسے بند کرو۔ (حقیقت یہ ہے کہ جب کمپنی کو بنگالے میں تجارت کی اجازت دی گئی تو یہ شرط نہایت وضاحت سے لگائی گئی کہ انگریز کسی قسم کی عمارت جو قلعے کی شکل کی ہو ہرگز تعمیر نہ کریں[a]) اور کشن داس سرکاری ملزم ہے اسے جواب دہی کے لیے واپس بھیج دو۔ کئی خط آئے گئے مگر ڈریک نے نہایت متمردانہ اور گستاخ روش اختیار کی اور سراج الدولہ کلکتے پر حملہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ سیاسی نگاہ سے دیکھیے تو سراج الدولہ اس کے سوا کچھ اور کر ہی نہ سکتا تھا۔ مگر طباطبائی کمپنی پرستی کی دُھن میں کہتے ہیں "اس نواب کا دماغ تکبر، تبختر اور جہالت سے معمور تھا اور اس لیے یہ ہر وقت غلط راستے پر گامزن ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اعلانِ جنگ کے بعد بھی غرور، نخوت اور حقارت سے اس کا دل نہ بھرا۔ بڑے بڑے سپہ سالاروں کی اس نے بر سرِ دربار بے عزتی کی۔ اس لیے وہ مشورہ دینے سے پرہیز کرنے لگے بلکہ اس کی تباہی کی طرف جھک گئے۔ بلکہ سراج الدولہ نے خود ہی انھیں مخاطب کرنا

---

a EARLY RECORDS OF BE: INDIA LY "WHEER" (1879) CH: VI P. 245.

چھوڑ دیا اور اپنے نوخیز امرا سے سرگوشیاں ہونے لگیں۔ وہ خود ناتجربے کار تھا اور اپنے ساتھ معقول جمعیت رکھنے کی اہلیت سے محروم تھا اس میں نام کو عقل وشعور نہ تھا۔ جوشِ جوانی اور حصولِ جاہ وجلال نے اسے اندھا کردیا تھا اور اس میں نیک وبد میں تمیز کرنے کی قوت ہی نہ رہی تھی۔ وہ اس قدر شوخ چشم واقع ہوا تھا کہ لڑائی کے دوران میں بڑے بڑے افسروں کی پگڑی اچھال دیتا تھا جس کا نتیجہ انگریزوں سے تصادم کی شکل میں نکلا۔ ورنہ اگر بڑے امرا سے رجوع کیا جاتا تو لڑائی کی ضرورت ہی نہ پڑتی"۔ یہاں بھی طباطبائی نے اتہام سے کام لیا ہے اور ان اتہامات اور گالیوں کو حق بہ جانب ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت دینے کی تکلیف گوارا نہیں - ان کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سراج الدولہ، راجا دلب رام، مہاراجا سروپ چند اور میر جعفر سے مشورہ لیتا۔ لیکن انھیں یہ یاد نہ رہا کہ وہ تو پہلے ہی گھسیٹی بیگم اور شوکت جنگ سے مل کر اس کی جان کے بیری ہورہے تھے۔ رہا امرا کو سرِ دربار بےعزّت کرنے کا الزام تو وہ کسی امیر کا نام نہیں لیتے۔ لیکن یہ کوئی بدعلّت نہ تھی۔ علی وردی خاں نے بیسیوں دفعہ میر جعفر کی وہ گت بنائی کہ اگر اس میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرتا۔ شاید طباطبائی چاہتا ہے کہ سراج الدولہ کو واجب تھا کہ وہ میر جعفر کو ہمراہ لے کر ڈریک کے آستانے پہ حاضر ہوتا، نذر گزارتا، خندق کھودنے میں خود شریک ہوتا اور قلعہ بندی کی تعریف کرتا، کشن داس کی قدم بوسی سے مشرف ہوتا، ڈریک کی بدکلامی کو شیرِ مادر کی طرح پی جاتا اور اس طرح لڑائی سے بچ جاتا۔ مگر علی وردی خاں کے خاندان کے چشم وچراغ

سے اس بزدلی اور ذلت کی توقع عبث ہے۔ البتہ سراج الدولہ کی جگہ میر جعفر ہوتے تو ان سے ایسا ہونا ممکن تھا کیوں کہ وہ ایسی حرکات کے ماہر تھے اور انھوں نے ایسی ترکیبوں سے کئی دفعہ مرہٹوں سے نجات پائی تھی۔ رہے سراج الدولہ کے نوخیز امرا جن سے مہاراجا موہن لال اور میر مدن مراد ہے۔ تو دنیا جانتی ہے کہ ان سے بڑھ کر خیر خواہ، جاں نثار اور ہوش مند امرا اسے سارے دربار میں نہ مل سکتے تھے اور ان کے عروج نے میر جعفر کی سازش کو کم زور کر دیا تھا اور اصل میں اسی بات کا رونا طبا طبائی رو رہے ہیں کہ انگریزوں کو اتنے مقابلے کی زحمت کیوں اٹھانی پڑی۔ سراج الدولہ نے جو مخالفت کی یہ بدعت نہ تھی بلکہ علی وردی خاں اور مرشد قلی خاں بھی کبھی اس بات کے روادار نہیں ہوئے کہ انگریز یا کوئی اور مغربی جماعت بنگالہ تو کیا ہندستان کے کسی حصے میں قلعہ بندی کریں۔ اس لیے سراج الدولہ اگر روایات حکومت کے خلاف قلعہ بندی پر معترض نہ ہوتا تو اس کا عدم و وجود برابر تھا اور اس کی حالت بھی وہی ہو جاتی جو دہلی اور لکھنؤ کی تھی بلکہ وہ اچھا خاصا میر جعفر بن جاتا۔ ان باتوں کو ملحوظ رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سراج الدولہ نے جو کیا وہ درست اور مناسب حال تھا جس پر ہندستان کو ناز کرنا چاہیے۔ کلکتے کی قلعہ بندی ہندستان کی غلامی کی پہلی کڑی تھی جسے توڑنے کے لیے سراج الدولہ نے اپنی جوانی اور بے مثال حسن و جمال کو قربان کر دیا سراج الدولہ کے حلم و بردباری کا اندازہ اس چٹھی سے لگ سکتا ہے جو فتح کلکتے کے بعد اس نے گورنر مدراس کو لکھی۔ جس کی تلخیص درج ذیل ہے:-[۹۱]

---

۹۱ ECHOES FRON OLD CALCUTTA LY BUSTUD P.26.

"یہ میرے کبھی وہم وگمان میں بھی نہیں آیا کہ انگریزی کمپنی کو بنگال کی تجارت سے محروم کیا جائے مگر آپ کا گماشتہ مسٹر ڈریک بہت برا آدمی ہے اور ان آدمیوں کو پناہ دیتا ہے جنھیں شاہنشاہ کو حساب دینا ہے۔ میں نے بساط بھر اسے ہوش سے کام لینے کی دعوت دی اور غلط کاری سے آگاہ کیا مگر بجائے نادم ہونے کے وہ اڑا رہا۔ ان اشخاص کو جو یہاں کمپنی کی خدمت کے لیے آئیں مناسب نہیں کہ وہ اس طرح کا سلوک کریں۔"

طباطبائی اس بات کو بھی چبا گئے ہیں کہ کمپنی کی تجارت میں امینہ بیگم والدۂ سراج الدولہ کو دلچسپی تھی کیوں کہ وہ کمپنی کے ذریعے وسیع پیمانے پر تجارت کرتی تھی۔ اس لیے کمپنی کے نقصان میں خود اس کا نقصان تھا۔

کلکتے پر حملہ

القصہ جب ڈریک کسی طرح راہ پر نہ آیا اور کشن داس کے حوالہ کرنے یا قلعہ بندی کو مسمار کرنے سے انکار کیا تو سراج الدولہ کو فوج کشی کرنے کے سوا کیا چارہ تھا۔ اس نے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ کلکتے کا محاصرہ کر لیا۔ سراج الدولہ کے لیے جنگ جوئی کے لیے یہ وقت سازگار نہ تھا۔ جب اس کے گھر میں ایک گہری سازش کارفرما تھی۔ ہارش مین کہتے ہیں کہ "سراج الدولہ کی فوج میں پچاس ہزار سپاہی تھے اور قلعے میں صرف ۱۷۴ آدمی تھے جن میں سے دس ایسے تھے جنھوں نے کبھی بندوق چلتی نہ دیکھی تھی۔ اس وقت گورنر ڈریک اور فوجی سردار مینو نک تھا۔ نواب نے ۱۷ جون ۱۷۵۶ء

کو (یعنی علی وردی خاں کی وفات کے پچھتر دن بعد۔ سیر المتاخرین صفحہ ۱۹۰)
قلعے کو محاصرے میں لیا۔ دوسرے دن ڈریک نے بچوں اور عورتوں کو
جہاز میں سوار کر کے قلعے سے باہر بھیج دیا۔ ڈریک بھی چپکے سے ایک
کشتی پر سوار ہو کر بھاگ گیا۔ میونک نے بھی اس کی پیروی کی اور
دونوں جہاز تک پہنچ گئے۔ اس ذلیل پسپائی کے بعد ہال ویل نے
کمان سنبھالی۔ لڑائی جاری رہی اور اڑتالیس گھنٹے تک مقابلہ ہوا۔
۲۱ جون کو نواب نے ایک فیصلہ کن حملہ کیا۔ کمپنی کے سپاہی "شرابخانہ"
چڑھا گئے اور کام کرنے کے قابل نہ رہے۔ ہال ویل نے ہتھیار
ڈال دیے اور نواب نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ خزانے سے صرف پانچ
لاکھ روپیہ برآمد ہوا۔[ف۱] سیر المتاخرین کا بیان ہے[ف۲] کہ جب ڈریک کو
اس حملے کی خبر ملی تو شہر کی ہر عمارت کو مورچہ بند کیا اور بڑی بہادری
سے مقابلے کی تیاری کی۔ سراج الدولہ کے پاس کثیر فوج تھی اس
لیے اس نے جلد ہی قلعہ بندیوں پر قبضہ کر لیا اور بلا کسی مزاحمت
کے شہر پر قابض ہو گیا اور ڈریک اپنے ہم وطنوں کو خبر کیے بغیر
سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس نے اپنے چند رفقا کے ساتھ ایک
جہاز پر پناہ لی اور فوراً غائب ہو گیا۔ باقی ساتھی نے جہاں تک
ہو سکا مقابلہ کیا مگر گولا بارود ختم ہو جانے کے باعث جو باقی رہے
انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور قید ہوئے۔ سپاہیوں نے کوٹھی
لوٹ لی جس میں سراج الدولہ نے کوئی حصہ نہ لیا۔ مسٹر واٹ بھی

ف۱ HISTORY OF INDIA BY MARSH MON P. 149, 131

ف۲ سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۱۸۹

گرفتار ہوا۔ میر جعفر کے ہاتھ چند خواتین آ گئیں جنھیں اس نے راتوں رات امیر خاں کی نگہداشت میں بہو والیہ کشتی میں سوار کرا کے روانہ کر دیا اور وہ اس جہاز پر پہنچا کر دن چڑھنے سے پہلے واپس آ گیا۔ امیر خاں کو انھوں نے انعام دینا چاہا مگر اس نے نظرِ کرم کو رُپے پر ترجیح دی۔ سراج الدولہ چند دن کلکتے میں گزار کر مرشد آباد کو لوٹ گیا۔ اس نے دیوان مانک چند کی کمان میں پندرہ ہزار سپاہی چھوڑے اور کلکتہ اس کے سپرد ہوا۔ طباطبائی اس تقرر پر بھی ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میر جعفر کو یہ اعزاز کیوں نہ دیا گیا اور راجا ولبھ رام کو کیوں محروم رکھا گیا یعنی سراج الدولہ نے مسلّمہ غداروں پر کیوں اعتبار نہ کیا۔ اس سے تو سراج الدولہ کی دوراندیشی، مردم شناسی قابلِ داد ثابت ہوتی ہے۔ مگر آپ کو اس کا صواب بھی عیب نظر آئے تو کیا علاج۔ پھر ان شکایتوں کا پلندا باندھتے وقت انھیں مہاراجا سروپ چند جگت سیٹھ یاد آتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ لوگ غداری میں میر جعفر کے شریک غالب تھے۔ اور اسی سانس میں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب غدار سراج الدولہ کی جان کے لاگو تھے اور یہ کہ جعفر اس چنڈال چوکڑی کا سرغنہ تھا۔ جگت سیٹھ نے دل و جان سے اس کی مدد کا عہد کیا تھا۔ سلسلۂ سبّ و شتم کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن اصحاب کو سراج الدولہ کی کج روی اور حمایت کا علم ہو گیا ہے یہ سننے کے لیے بے تاب ہوں گے کہ سراج الدولہ نے کس بدانتظامی سے کام لیا اور اس کا کیا حشر ہوا (اس لیے وہ سرِ دست گالیوں سے محترز ہوتے ہیں)

کمپنی سے بگاڑ کے وجوہات

میجر ڈاکٹر باسو اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں :-[۱]

"یہ غیر اغلب نہیں کہ علی وردی خاں کو انگریزوں کے منصوبوں کا علم تھا۔ کیوں کہ اس نے ایک دوراندیش مدبر کی طرح صوبے بھر میں جاسوس اور پرچہ نویسوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ یہ پرچہ نویس ہر چھوٹے موٹے واقعے کی خبر جلد سے جلد گوش گزار کرتے رہتے تھے۔ اس لیے یہ قرین قیاس ہے کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ جو انگریز تاجروں کے لباس میں گھوم رہے ہیں ان کا دانت صوبے کی حکومت پر ہے۔ اس لیے وہ کسی طور پر ان کی حوصلہ افزائی نہ کرنا چاہتا تھا۔"

انگریز اور ہندو دونوں دکان دار تھے اور وہ ہمیشہ اپنے نفع نقصان کو ترازو کے تول دیکھتے رہے اس لیے انگریزوں نے یہ نسخہ کارگر سمجھا کہ ہندوؤں کو اسلامی حکومت سے بدظن کرکے اپنے ساتھ ملایا جائے۔ یہ امر کہ انگریز سراج الدولہ کی مسند نشینی سے بہت پہلے ہندوؤں سے توڑ جوڑ کر رہے تھے، اس خط سے عیاں ہوتا ہے جو کرنل اسکاٹ نے ہندستان سے اپنے دوست چارلس نوبل کو انگلستان فروری ۱۷۵۴ء میں لکھا۔ جس کا حوالہ آخر الذکر نے اپنی چٹھی مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۷۵۶ء میں دیا۔

۱۔ RISE OF CHRISTIAN POWER IN INDIA VOL: I, P. 6..

"کرنل اسکاٹ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہندو راج اور
عوام مسلمانوں کی حکومت سے دل برداشتہ ہو چکے ہیں
اور خفیہ خفیہ چاہتے ہیں کہ ان کا طوقِ غلامی اُتار پھینکیں
اور اگر کوئی یورپی طاقت مہم شروع کرے تو وہ ساتھ
دینے پر تیار ہو جائیں گے۔ مگر یہ اسی صورت میں ممکن
ہے کہ انقلاب ان کے لیے مفید ثابت ہو"

اس سے صاف نظر آتا ہے کہ ہندوؤں کو اپنی کوئی ایسی خواہش نہ تھی۔ وہ حکومتِ اسلامیہ میں خوش حال تھے۔ چناں چہ مسٹر ہل یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ :-

"مسلمان مورخوں نے اسلامیہ حکومت کے جو حالات
بیان کیے ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مشرقی قوم ان
کے باعث بغاوت پر آمادہ ہو سکے"

مگر انگریز انھیں اپنا آلۂ کار بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ ہمیشہ ہندوؤں سے سازش کرنے میں منہمک رہے اور انھیں سبز باغ دکھا کر مسلمانوں سے متنفر کرتے رہے۔ شاید کرنل اسکاٹ انھی میں سے تھا جو اس کام میں مشغول تھے۔ چناں چہ مذکورہ بالا چٹھی سے ظاہر ہوتا ہے کہ :

"کرنل نہایت سرگرمی سے اس دھن میں رہا کہ دربار
مرشد آباد کی حکومت، ملک اور رعیت کی حالت کے متعلق
صحیح معلومات حاصل کرے۔ کرنل نے اسی چند کے ذریعے
ہندستان کے اکابر سے راہ و رسم پیدا کی، گفت و شنید

ہونے لگی۔ جس میں بالخصوص راجا تلوچند بردوانی اس کی
باتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ اس نے ہگلی کے قاضی واجد
پر بھی ڈورے ڈالے مگر اس نے نواب کو کرنل کی آمد کی
اطلاع دے دی۔"

اس میں کسی شک شبہ کی گنجایش نہیں کہ یہ کرنل ہندوؤں سے سازش کر رہا تھا۔ علی وردی خاں نے اسے طلب کیا اور اگر وہ جاتا تو عین ممکن ہے کہ بہ نظرِ انتقام اس کا سر اُڑا دیا جاتا، یا کم از کم قید خانے بھیجا جاتا۔ مگر وہ ٹال گیا اور مدراس چلا گیا۔ علی وردی خاں کا انگریزوں سے بدظن ہونا حق بہ جانب تھا۔ جین مرلا قاسم بازار کا فرانسیسی گورنر اس بارے میں لکھتا ہے کہ :-

"وہ کارومنڈل اور دکن میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کی
پیش قدمی یکساں خطرناک خیال کرتا تھا۔ کیوں کہ اس کے
جاسوس وہاں موجود تھے اور ہر بات کی خبر پہنچاتے تھے۔
وہ جانتا تھا کہ فرنگی ایک دن اس کے صوبے کی بھی وہی
گت بنائیں گے ..... جو انھوں نے کرناٹک اور دکن
کی بنائی۔"

یہ اندیشہ اور خطرناک صورت اختیار کر گیا۔ جب پرچہ لگا کہ کلکتہ یا چندر نگر میں کچھ قلعہ بندی کی گئی ہے۔ قلعے کے محاذی کسی مکان کی مرمّت یا تعمیر اسے پریشان کرنے کے لیے کافی تھی۔ علی وردی خاں نے حکم جاری کیا کہ یہ تعمیر فوراً بند کی جائے۔ وہ اس بات کا روادار نہ تھا کہ کوئی فرنگی طاقت اس کے صوبے میں قلعہ بنائے۔ اس نے

ہمارے اور انگریزی وکیلوں سے برملا کہا کہ آپ تاجر ہیں، آپ کو قلعوں کی کیا ضرورت ہے۔ میرے دورِ حکومت میں آپ کو کسی دشمن کا خوف نہ ہونا چاہیے۔ اگر عمر وفا کرتی تو وہ اپنے ارادوں کو پروان چڑھاتا۔ (فرنگی) خطرے سے بچنے کے لیے اس نے اپنے جانشین کو جو وصیت کی اس کی تکمیل میں جانشین نے اپنی جان لڑا دی۔

ہال ویل کی روایت سے یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے جب وہ کوئی دم کا مہمان تھا، علی وردی خاں نے سراج الدولہ کو یہ وصیت کی:-

"فرنگی اقوام نے جو طاقت مُلک میں پیدا کرلی ہے اس کا ہمیشہ دھیان رکھنا۔ اگر خدا مجھے کچھ اور زندہ رہنے کی اجازت دیتا تو میں تمھاری یہ فکر بھی دور کر دیتا۔ بیٹا! اب یہ کام تمھیں سنبھالنا ہے۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ تلنگانہ کی جنگ اور سیاسیات سے سبق لو۔ وہاں کے نوابوں کے ذاتی تنازعات کا فیصلہ کرنے کے بہانے انھوں نے شاہنشاہ کا مُلک اور لوگوں کے مال و زر پر قبضہ کیا اور آپس میں بانٹ لیا۔ ان تین طاقتوں کو ایک وقت میں ہٹانے کی کوشش نہ کرنا۔ ان میں انگریزوں کی طاقت سب سے زیادہ ہے۔ انھوں نے حال ہی میں ایک بڑے حکمراں کو شکست دی ہے اور اس کے مُلک پر قابض ہو گئے ہیں۔ پہلے انھیں ملیا میٹ کرو اس کے بعد باقی تمھیں تکلیف نہ دیں گے۔ بیٹا! انھیں قلعہ بندی کرنے

یا فوج رکھنے کی کبھی اجازت نہ دینا۔ اگر ایسا کیا تو ملک گیا۔"

علی وردی خاں نے ۱۰ اپریل ۱۷۵۶ء کو رحلت کی اور سراج الدولہ ۲۵ سال (۱۹ سال تحقیق میں آتی ہے) کی عمر میں گدی نشین ہوا۔ سراج الدولہ نے جو تاج پہنا وہ پھولوں کا نہیں بلکہ کانٹوں کا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے دل بھی اس کی طرف سے صاف نہ تھے۔ لا "LAW" کہتا ہے کہ: "انگریز کبھی اس کے دربار میں نہ آئے، نہ کبھی خط و کتابت کی۔ کئی دفعہ انھوں نے نواب کو قاسم بازار کی کوٹھی دیکھنے تک کی اجازت نہ دی۔"

ممکن ہے غیر شعوری طور پر انھوں نے اس کی مسند نشینی کے وقت نذر تو کجا زبانی مبارک باد تک دینے کی پروا نہ کی ہو مگر اس میں شک نہیں کہ انگریز اس کے خلاف بڑے اہتمام پر سازش کر رہے تھے اور انھوں نے عمداً اس کی توہین کی۔ حکمراں کی حیثیت کو الگ رکھ کر سراج الدولہ انسانیت کے وقار سے محروم ہو جاتا اگر وہ اسے محسوس نہ کرتا۔ اگر اس صورت میں سراج الدولہ نے انھیں بنگال سے بدر کرنے کی کوئی تجویز کی ہو تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے لیکن ان ذاتی وجوہات کے ماسوا اور بھی کئی باتیں ہیں جن کی بہ دولت انگریزوں کو بنگالے سے نکال باہر کرنے کے سوا چارہ نہ تھا اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سراج الدولہ انگریزوں کی مکاری سے تنگ آنے میں حق بہ جانب تھا۔ ڈیوڈ رانے (DAVIDRANNIE) اپنے مضمون بہ عنوان (CAUSES OF THE LOSS OF CALCUTTA)

مورخہ یکم اگست ۱۷۵۶ء میں لکھتا ہے:۔

"مسلمانوں سے بے انصافی کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے فرنگیوں کو بہ حیثیت سوداگروں کے یہاں رہنے کی اجازت دی، ان کے ملازموں کی حفاظت کی اور انھیں تجارتی مال کا محصول معاف کیا۔ اسی بہانے سے ہم نے نواب کی اس رعایا کو پناہ دی جو نہ سوداگر تھی نہ ہماری نوکر اور معافی محصول کی دستکیں دیسیوں کو دے کر نواب کو کثیر نقصان پہنچایا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو مال نواب کے علاقے سے آتا تھا اس پر بیش بہا محصول لگا دیا اور الٹا دربار پر الزام عائد کرنے لگے۔"

انگریزوں نے نواب کی حکومت سے سرکشی کی اور بنگالہ خاص کر کلکتے میں قلعہ بندیوں کی مرمت شروع کردی اور انھیں مضبوط سے مضبوط تر کرنے لگے۔ انھوں نے اس کی یہ وجہ بتائی کہ چوں کہ انگلستان اور فرانس میں جنگ چھڑ گئی ہے اس لیے اپنی حفاظت اور مدافعت کے لیے انھیں اپنی قلعہ بندیوں کی مرمت اور ترمیم ضرور ہے۔ لیکن اگر اس عذر میں کچھ بھی جان ہوتی تو وہ کورٹ آف ڈائریکٹرز کی ہدایت پر عمل کرتے جنھوں نے اپنی چٹھی مورخہ ۹ ؍ دسمبر ۱۷۵۵ء میں کمپنی کو لکھا:۔

"ہم آپ سے بڑے زور سے یہ سفارش کریں گے کہ آپ اپنی جایداد واقع بنگالے کی حسب ضرورت خوب حفاظت اور خاص کر یہ کوشش کریں کہ نواب آپ کو اپنے ظل عاطفت میں رکھے۔ کیوں کہ نوآبادی کی جایداد کی حفاظت کا یہی بہترین طریق ہے۔"

کمپنی کے عمال نے اس ہدایت پر عمل نہ کیا مگر نواب نے حُسنِ اخلاق سے کام لے کر فرانسیسی اور انگریزی کمپنیوں کو لکھا کہ جو کچھ بن چکا، بن چکا۔ مزید تعمیر اور مرمّت بند کر دیں۔ لا گورنر فرانسیسی قاسم بازار سے لکھتا ہے۔

"میں نے حکم پہنچتے ہی ایک عرضی لکھی اور چندر نگر سے بھی اسی مضمون کی ایک درخواست لکھوائی جن میں تعمیل حکم کا وعدہ کیا گیا۔ یہ دونوں عرائض گزارش ہوئیں تو سراج الدولہ کی تشفی ہو گئی اور اس نے مزید رعایت دیتے ہوئے لکھا کہ موجودہ عمارات کی بے شک مرمّت کی جائے مگر نئی عمارت نہ بنائی جائے۔ اس طرح دربار کے پرچہ نویسوں کا اطمینان ہو گیا اور یہ جھگڑا نہایت خوش اسلوبی سے ختم ہوا۔"

لیکن انگریز فتنہ و فساد بپا کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ ان کی نسبت لا (LOW) کہتا ہے کہ جب یہ حکم ان کے پاس پہنچا تو نواب کے پرچہ نویسوں سے نہایت بُرا سلوک کیا گیا۔ نواب کو مطمئن کرنے کی بجائے انھوں نے از بس گستاخانہ جواب دیا۔ سُننے میں آیا ہے کہ مسٹر ڈریک نے پرچہ نویسوں سے کہا کہ اگر نواب خندق گرانی چاہتا ہے تو یہ خندق مسلمانوں کے سروں سے پُر ہوگی۔ سُنی سُنائی بات ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ اس نے یہ حرکت کی ہو۔

انگریز اس لیے سر پر چڑھ رہے تھے کہ وہ نواب شوکت جنگ کی اس سازش میں شریک تھے کہ بنگالے کی صوبے داری سراج الدولہ سے چھین کر اُسے دی جائے۔ اس نے شاہِ دہلی سے بنگالہ، بہار اور اُڑیسہ کی صوبے داری کی سند حاصل کر لی تھی اور اس کا قبضہ حاصل

کرنے کے لیے اسے غالباً انگریزوں کی مدد کی ضرورت تھی۔ نواب نے شکار کے بہانے اس کی طرف رُخ کیا مگر وہ خواہانِ عفو ہوا اور نواب نے اُسے معاف کر دیا۔ اور بھی بہت سے قرائن تھے جن کی بدولت نواب کے دل میں کوئی شک نہ رہا کہ انگریز اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بات کشن داس کو کلکتے میں پناہ دینا تھا۔

چناں چہ علی الرغم نواب کشن داس کو پناہ دی گئی اور وہ امی چند کے مکان پر ٹھیرا۔ یہ وہی امی چند ہے جس نے دھوکا دینے کے لیے کلایو نے جعلی دستاویز بنائی۔ اہلِ کمپنی نے کشن داس کو نواب کے حوالے کر دینے کا مطالبہ ٹھکرا دیا۔ سراج الدولہ نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا اور یہ کوشش کی کہ یہ جھگڑا بڑھنے نہ پائے اور باہمی مفاہمت ہو جائے۔

HASTINGS MSS. VOL: 29, P. 209 میں تحریر ہے کہ:

"نواب انگریزوں کے سلوک سے دل برداشتہ ہو گیا ہے نیز اس نے سُنا ہے کہ وہ کلکتے کے قریب مورچے بنا رہے ہیں اور اجازت تو کجا اس سے مشورہ تک نہیں کیا گیا۔ وہ ہمیں صرف سوداگر سمجھتا ہے اور اس حیثیت سے ہمارا یہاں رہنا اسے گوارا ہے۔ لیکن وہ مصر ہے کہ جو نئی قلعے بندیاں بنائی گئی ہیں انھیں مسمار کیا جائے۔"

مگر مسٹر اورمی اپنی تاریخ جلد دوم صفحہ ۵۵ میں کہتے ہیں کہ مسٹر ڈارٹ نے کمپنی کو یہ کبھی نہ بتایا کہ سراج الدولہ کو کمپنی سے کیا شکایات تھیں۔ خواہ مسٹر ڈارٹ نے کمپنی کو یہ شکایات بتائیں یا نہ بتائیں۔ مگر یہ عیاں ہے کہ کمپنی کو سراج الدولہ کی شکایات اور مطالبات کا پورا پورا علم

تھا۔ چوں کہ انگریز ہنگامہ برپا کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے سراج الدولہ کے مطالبات نہ مانے اور سراج الدولہ ان کی تادیب پر مجبور ہو گیا۔ خواجہ واجد نے اپنی چٹھی مورخہ یکم جون ۱۷۵۶ء میں لکھا ہے کہ انگریزوں کو بنگالے سے باہر نکالنے کی تین وجوہات تھیں: (۱) انھوں نے قلعہ بندی کی اور خندق کھودی (۲) دستک کا ناجائز استعمال کیا (۳) جو ملزم علاقۂ نواب سے بھاگ کر آتے تھے انھیں پناہ دی جاتی تھی۔ تاریخ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ نواب انگریزوں پر حملہ کرنے میں حق بہ جانب تھا یہاں تک کہ خود "HILL" کو دبی زبان میں کہنا پڑا کہ:۔

"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سراج الدولہ نے جو بہانے اس غرض سے تراشے تھے کہ اس نے جو حملہ انگریزوں پر کیا وہ حق بہ جانب ثابت ہو، ان بہانوں میں معقولیت کی جھلک ضرور پائی جاتی ہے۔"

جنگ کا آغاز انگریز تاجروں کی بے باکی اور بدتہذیبی ناقابلِ برداشت ہو گئی تو سراج الدولہ نے بنگالے سے ان کی بیخ و بن اکھیڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے اس نے ۲۴ مئی ۱۷۵۶ء کو انگریزی کوٹھی واقعہ قاسم بازار کا محاصرہ کیا۔ مسٹر واٹس نے بلا مزاحمت ہتھیار ڈال دیے۔ اس سے انگریزوں کا وقار پاش پاش ہو گیا۔ مگر سراج الدولہ کی عالی حوصلگی اور نیک نفسی دیکھیے کہ اس نے قاسم بازار کے انگریزوں سے وہ سلوک نہ کیا جس کے باغی سزاوار ہوتے ہیں۔ کیوں کہ درحقیقت باغی ہی کہلانے کے مستحق تھے ان کی سزا یہی تھی کہ انھیں فی الفور جلاد کے حوالے کیا جاتا۔ اس نے ایسا نہ کیا۔

اگر وہ ایسا کرتا تو یہ تاجر جن کی اس نے جان بخشی کی بعد میں اسے دھوکا نہ دے سکتے۔ کیوں کہ وہ تشکر و احسان کے جذبات سے معرّا تھے۔

مسٹر ہِل کہتے ہیں:-

"مسٹر واٹس کوئی سادہ لوح تاجر نہ تھا اور اس کی مکّاری سراج الدولہ کو معزول کرنے میں کلایو کی فتح جنگ پلاسی سے کچھ کم کارساز نہیں ہوئی لہ"۔

ہال ول نے واٹس کو قاسم بازار کی کوٹھی سراج الدولہ کے حوالے کرنے پر متہم کیا ہے۔ چناں چہ اپنی چٹھی ۳۰ نومبر ۱۷۵۶ء میں وہ کورٹ آف ڈائریکٹرز کو لکھتا ہے:-

"...... اور ان کی فوج مزاحمت کے لیے کافی تھی اور وہ مدّت تک نواب کے حملے کی مدافعت کر سکتے تھے ..... اگر مقابلہ کیا جاتا تو نتائج نہایت خوش گوار ہوتے اور صوبے دار ضرور صلح پر آمادہ ہو جاتا۔ اگر چوبیس گھنٹے بھی مقابلہ کیا جاتا تو کلکتے پر حملے کی نوبت نہ آتی"۔

یہاں سے فارغ ہو کر ۵ جون ۱۷۵۶ء کو سراج الدولہ کلکتے کی طرف بڑھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو برسات شروع ہو جاتی اور راستہ قابلِ سفر نہ رہتا۔ سراج الدولہ کی تسخیر مستحقِ تحسین ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ چندے اور زندہ رہتا تو کیسا زبردست سپہ سالار ثابت ہوتا۔ کاش کہ اس کے پروردے نمک حرام نہ نکلتے۔ مسٹر ہِل حیرت سے لکھتے ہیں:-

لہ میجر باسو یہاں DEPLOMACY کو TREACHEEY کا مترادف قرار دیا ہے۔ یہ سب اندراج میجر باسو کی کتاب پر مبنی ہیں۔

"گرمی کے موسم میں، ایسی سرزمین میں جہاں کوئی سڑک نہ تھی، ایک بھاری توپ خانے کے ساتھ جسے ہاتھی اور بیل کھینچتے ہیں اس کی فوج ۱۶۰ میل کا فاصلہ گیارہ دن میں طے کرتی ہے"

جو لوگ سراج الدولہ کو کاہل، سُست، عیش دوست اور آرام طلب کہتے ہیں کیا وہ مسٹر ہِل کی یہ شہادت سُن کر بھی بہ ضد رہیں گے۔ کلکتے جاتے ہوئے سراج الدولہ نے انگریزوں کا قلعہ ہِلنا بھی سر کر لیا۔ سراج الدولہ نے بہادری کے کرشمے دکھائے اور انگریزوں کو شکستِ فاش ہوئی جنھیں مورّخ اورمی تسلیم کرتا ہے:۔

"نواب کا پہلے ہی سے ارادہ تھا کہ اس قلعے پر قبضہ کرے یہ کلکتے سے ۵ میل پر ہے۔ دریائے ہگلی اور سمندر کے مابین ایک بہت تنگ مقام ہے۔ اس وقت قلعے میں ۱۳ توپیں تھیں۔ ۱۳ جون کی صبح کو وہاں چار جہاز سامانِ حرب سے لدے ہوئے پہنچے تھے۔ جب نواب نے گولہ باری شروع کی تو توپوں اور جہازوں نے بھی جواب دیا اور نواب کی حملہ آور فوج جس میں صرف ۵۰۰ آدمی تھے بھاگ گئی۔ اس پر انگریزوں کی فوج ساحل پر اُتری اور نواب کے توپ خانے کی جو توپیں وہاں رہ گئی تھیں انھیں بے کار کر کے دریا میں پھینکا۔ لیکن دوسرے دن جب دو ہزار سپاہیوں نے قلعے کا محاصرہ کر لیا تو انگریز اپنے جہازوں پر چلے گئے اور وہاں سے بندوقیں چلانے لگے مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ تیسرے دن کلکتے سے کمک

پہنچی مگر اس میں ۳۰ سپاہی تھے جو چنداں مفید ثابت نہ ہوئے۔" (اورمی جلد ۲ صفحہ ۱۵۹)

ہم سراج الدولہ کی صلح پسندی اور خون ریزی سے نفرت کی جس قدر تعریف کریں کم ہو۔ قاسم بازار کی تسخیر کے بعد نواب کو یقین واثق تھا کہ انگریز صلح پر رضامند ہو جائیں گے۔ واٹس اس کا قیدی تھا وہ بہ معیت ایک اور قیدی مسمی کولٹ بتاریخ ۱۷ جون ۱۷۵۶ء کورٹ آف ڈائرکٹرز کو لکھتا ہے:۔

"یہ قتل اور غارت گری، اس کے ملازموں کی زبوں حالی کلکتے کے لاکھوں باشندوں کی تباہی کبھی وقوع میں نہ آتی اگر گورنر اور کونسل کچھ روپے کے عوض مصالحت کر لیتے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ نواب نے قاسم بازار میں کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ صرف سامان حربی پر قبضہ کیا۔ راجا ولبھ رام نے کئی دفعہ کمپنی کے سردار کو بلایا اور سمجھا کر کہا کہ ایک کروڑ روپے کے ادا کرنے پر صلح ہو سکتی ہے اور پھر صرف بیس لاکھ مانگے۔ جب اس کی ادائی سے بھی عجز کا اظہار کیا تو راجا نے کہا کہ اچھا تم بتاؤ کیا دے سکتے ہو۔ اس پر کہا کہ ہمیں شرائط صلح طے کرنے کا اختیار نہیں، کلکتے چٹھی لکھ کر دریافت کرنے کی اجازت دیں۔ اس بات سے راجا نے انکار کر دیا۔ جب ہگلی پہنچے تو کلکتے یہ خبر پہنچائی اور کہا کہ کسی معقول آدمی کو نواب کے پاس بھیجو صلح ہو جائے گی۔"

لیکن حکام کلکتہ نواب کے خلاف آستینیں چڑھائے بیٹھے تھے۔

وہ کب مانتے تھے۔ سراج الدولہ کا مطالبہ معقول تھا۔ اسے بیرونی تاجروں کی خصلت اور طبیعت سے آگہی نہ تھی مگر انگریز جانتے تھے کہ وہ کھلے میدان اور مہذب طریق سے نواب کی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس لیے انھوں نے نواب کی فوج میں غداری اور بے چینی پیدا کرنے کے لیے جملہ مساعی وقف کر دیں۔ گورنر ڈریک اپنے تذکرے میں ۱۹ جولائی ۱۷۵۶ء کو لکھتا ہے کہ:

"نواب کی فوج میں جو فرنگی اور پرتگیزی ملازم ہیں انھیں بھکانے کے لیے انھیں مذہب کے نام پر پادریوں سے چٹھیاں لکھوائی گئیں کہ عیسائیوں کا مسلمانوں کی طرف سے عیسائیوں سے لڑنا بہت گناہ ہے۔۔۔۔۔ یہ چٹھیاں نواب کے کیمپ میں پہنچائی گئیں تو ان اشخاص نے جواب دیا کہ ان کے بھاگنے کے تمام راستے مسدود ہیں۔ اگر اس گناہ سے انھیں پہلے آگاہ کیا جاتا تو وہ حاضرِ خدمت ہو جاتے۔"

یہ وہ حربہ تھا جس سے کام لینا ہندستانی حکمرانوں کو نہ آتا تھا۔ بہرحال نواب کے حملے کی اطلاع ملنے پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ شہر کی کوئی مدافعت نہ کی جائے۔ گورنر ڈریک جو اس فیصلے کا ذمے دار قرار دیا جاتا ہے اپنے مذکورہ بالا تذکرے میں لکھتا ہے۔

"کالے سوداگر (یعنی ہندستانی) اور باشندے نواب کے آنے کی خبر سن کر کانپنے لگے اور انھوں نے اپنے بال بچے اور مال و اسباب کو مضافات میں بھیج دیا۔ اس سے پہلے انھیں کہا گیا تھا کہ کالوں کی آبادی کے اردگرد مورچے بنائیں۔۔۔۔"

بات یہ تھی کہ کلکتے کے تاجر اور باشندے انگریزوں کے حکم کی تعمیل کو سود مند خیال نہ کرتے تھے کیوں کہ انھیں یہ خوبی علم تھا کہ وہ ان کی حفاظت کے لیے انگلی نہ اٹھائیں گے۔ مورچے بنانے یا سڑکوں میں رکاوٹیں پیدا کرنے سے نواب کا حملہ نہ رک سکتا تھا اس لیے سوا ایک شخص مسمّی گوبند رام متر اور کسی نے انگریزوں کی کہی نہ مانی جب انگریزوں نے غربا کی جھونپڑیاں جلا دیں تو انھیں انگریزوں کی حفاظت کی کیا توقع ہو سکتی تھی۔ گورنر ڈریک لکھتا ہے کہ:-

"جب دشمن کے بگٹٹ آنے کی خبر پر خبر آنے لگی تو ہم نے نے یہ فیصلہ کیا کہ حملہ آور کے مقابلے کے لیے راستہ صاف کریں اس لیے ہم نے ان تمام جھونپڑیوں کو جلا دیا جو ہمارے محلے میں تھیں اور آگ دور تک پھیل گئی"۔

اس لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ چند سپاہی اور نوکر انگریزوں سے الگ ہو گئے۔ نواب ۱۶ جون کو کلکتے میں پہنچا۔ کچھ چھوٹی موٹی لڑائیاں ہوئیں اور ۱۸ جون کو اس نے باقاعدہ حملہ کر دیا۔ انگریزوں نے اعلان کر دیا کہ دشمن کی کوئی جان بخشی نہ کی جائے گی۔ اس کے علاوہ امی چند کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ کتنا افسوس ناک ہے۔ یہ شخص انگریزوں کا بڑا ہوا خواہ اور سرگرم خادم تھا۔ جب کلکتے پر حملہ ہوا تو انگریزوں کو یہ شبہہ ہوا کہ امی چند نواب سے مل گیا ہے اس لیے اس کی گرفتاری لازم آئی۔ چناں چہ وہ قید کیا گیا مگر اس کے بیٹے ہزاری مل اور اس کے مہمان کشن داس نے مقابلہ کیا۔ گولی چلنے لگی اور ہزاری مل اس وقت گرفتار ہوا جب اس کا بایاں ہاتھ کٹ گیا۔ کشن داس تو خود

انگریزوں کا پناہ گیر تھا اور اسی عزت کا مستحق تھا جو ایک مہمان کی کی جاتی ہے۔ یہ مشرقی تہذیب کے خلاف تھا کہ مہمان سے ایسا سلوک کیا جاتا مگر سب سے بدتر یہ کہ انگریزوں نے امی چند کے زنانے میں سپاہیوں کو بھیجا۔ اس کے متعلق اورمی کہتے ہیں :۔ جلد ۲ صفحہ ۹۰۔

"امی چند کے جمع دار نے جو ایک اعلا قوم سے تھا گھر کو آگ لگادی اور مخدرات کی آب رو بچانے کے لیے وہ ان کے کمرے میں گیا اور سب عورتوں کو جن کی تعداد تیرہ تھی قتل کرڈالا۔ اس کے بعد اس نے کٹار اپنے پیٹ میں ماری۔ مگر وہ زخم مہلک ثابت نہ ہوا"

مگر باوصف ان سب حرکتوں کے انگریزوں کو مکمل شکست ہوئی۔ اس کے متعلق تاریخ سلطنت برطانیہ مصنفہ ٹھارٹن (THARTON) جلد ا صفحہ ۱۹۰) میں درج ہے کہ :۔

"ان حالات میں محصورین نے بھی مناسب خیال کیا کہ قلعہ چھوڑکر جہازوں میں چلے جائیں اور ایسی پس پائی بلا رسوائی کے ممکن ہو سکتی ہے۔ مگر ان سپاہیوں نے نفسا نفسی کا اظہار کرکے اور اپنی اپنی جان بچانے کی کوشش کرکے اسے مبتذل کر دیا جو ذلت انگریزوں نے کبھی برداشت نہیں کی"

اس بزدلی کو سٹرلنگ نے بھی برداشت نہ کیا وہ اپنی تاریخ ہند حصہ اوّل صفحہ ۵۰ پر لکھتے ہیں : "یہ آدمی قابو میں نہ رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے شراب کے نشے میں تھے۔ بعض نے سنگینوں سے ان افسروں پر حملہ کیا جو انھیں اپنے فرائض بجالانے کو کہتے تھے"

جان کک جو اس وقت قلعے میں موجود تھا یہ شہادت دیتا ہے:-

"اس وقت سے جب ہم قلعے میں مدافعت کے لیے چلے گئے کچھ بھی سوا پریشانی، خودسری اور کھلبلی کے نہ تھا۔ ہر ایک ہدایت دیتا تھا لیکن کوئی ہدایت دینے کے قابل نہ تھا۔"

اگر محصورین کی تکا بوٹی نہ ہوئی تو یہ محض محاصرین کی فیاضی اور رحم دلی کا ثمر تھا۔ چناں چہ کک نے لکھا ہے کہ:-

"کارخانے میں اس قدر پرتگالی عورتیں اور غیر ضروری اشخاص گھس آئے تھے کہ ان کے لیے ہفتہ بھر کی خوراک بھی قلعے میں موجود نہ تھی۔ اس صورت میں یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ مسلمان رات کے وقت نہیں لڑا کرتے۔ نواب کی فوج نے شام کے وقت لڑائی بند کر دی اور ہمیں سوچ بچار کرنے کا موقع دیا۔"

اب انگریزوں نے نواب کے ساتھ صلح کرنے کی کوشش شروع کی۔ ہال ویل نے امی چند سے استدعا کی کہ وہ نواب کے پاس جائے اور شرائط صلح دریافت کرے لیکن اس کے ساتھ جو بدسلوکی ہوئی تھی اسے مدنظر رکھ کر اس نے صاف انکار کر دیا۔ (مسٹر ہل کی تاریخ ہند حصہ اوّل صفحہ ۵)۔

"بلیک ہول" یا کال کوٹھری کی جھوٹی کہانی

یہ افسانہ ہندستان کے بچے بچے نے ذہن پر کندہ کیا گیا اور اس کے لیے بہت محنت اور صرفِ زر سے کام لیا گیا کہ سراج الدولہ نے فتح کلکتہ کے وقت ۱۴۶ انگریزوں کو جن

میں مرد اور عورتیں شامل تھیں ایک ۲۰ فٹ مربع کمرے میں محبوس کیا جن میں سے ۲۳ جاں بر ہوئے اور باقی حبسِ دم کے باعث مر گئے۔ اس پر بڑے بڑے مورخوں اور ادیبوں نے قلم فرسائی کی اور نواب کو بے نقط سنائیں۔ مگر بنگالی محققین نے جب اس طرف توجہ کی تو ثابت ہوا کہ بلیک ہول کا واقعہ محض طبع زاد کہانی ہے۔

جب اہلِ بنگال کو سراج الدولہ کی عظمت اور شان کا احساس ہوا تو انھوں نے اس کی برسی منانی شروع کی اور حکومت کو مجبور کیا کہ وہ بلیک ہول کی یادگار کو مٹا دے۔

میرا اس داستانِ پاستان کو زیرِ بحث لانے کا ارادہ نہ تھا لیکن احباب کے اصرار پر اس طرف متوجہ ہونا پڑا کہ شاید مورخوں کی قلابازیاں ضیافتِ طبع کا باعث ہوں۔

اس کہانی کا موجد یا مصنف ڈاکٹر ہال ویل ہے۔ اس نے یہ کہانی فروری ۱۷۵۷ء میں یعنی وقوعہ سے پانچ ماہ بعد اس وقت لکھی جب وہ سائرن (SYAREN) نام جہاز پر انگلستان جا رہا تھا اور وقت گزارنے کے لیے اس کے پاس اور کوئی شغل نہ تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی اس واقعے کا کسی سے ذکر تک نہ کیا نہ کسی اور نے کسی اور اسلوب سے بیان کیا[۱]۔ ہال ویل کی نسبت لٹل فرماتے ہیں[۲]۔

"ہال ویل کا تذکرہ افواہوں کی پوٹ ہے جس کی کوئی ہم عصر تائید نہیں کرتا یہ بلیک ہول کی کہانی ہال ویل اور کک

---

۱. ECHOIS FROM OLD CULCUTTA BY BUSTEUD P.44

۲. BENGAL PASTAND PRESENT P.16 BY

وغیرہ کی گھڑی ہوئی ہے"

ہر شخص جس نے اس وقت کا ریکارڈ ملاحظہ کیا اس نتیجے پر پہنچے گا کہ ہال ویل کوئی شریف اور دیانت شعار آدمی نہ تھا۔ علاوہ اس کے ایک اور زبردست شہادت اس کی تردید میں یہ ہے کہ سیر المتاخرین جو ۱۷۸۰ء میں لکھی گئی اس واقعے کی نسبت بالکل خاموش ہے اور نوٹا مانس نے اس کا ترجمہ اپنے حواشی کے ۱۷۸۹ء میں کیا لیکن اس نے بھی اپنے حواشی میں بلیک ہول کی تصدیق نہ کی بلکہ خلاف شہادت دی۔ اس بناوٹ میں صداقت کا شائبہ تک ہوتا تو کمپنی کے پھاڑے کے ٹٹو اس کے بیان کرنے میں زمین و آسمان ایک کر دیتے۔ پھر مورخم دار کہتے ہیں کہ عہدِ حاضر کے مورخ سراج الدولہ کو اس فعل کا ذمے دار نہیں ٹھیراتے۔ مسٹر لٹل فرماتے ہیں کہ "جن اشخاص کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بلیک ہول میں ختم ہو گئے وہ درحقیقت قلعہ پر حملے کے وقت کام آئے تھے۔ ہال ویل نے بلیک ہول کی یادگار میں جو جھوٹ کا مینار بنایا اس کی کوئی شہادت نہیں۔ ہال ویل نے یہ کہانی محض اپنی خدمات کو نمایاں کرنے کے لیے بنائی اگر درحقیقت (۱۴۶ آدمی) ۲۰ فٹ کے

ف۱ صفحہ ۲۲۶ ECHOES TREM OLD CALCUTTA BUSTUEL PAGE 44.

ف۲ صفحہ ۲ BENGAL RAST PRCSENTG J.H. LITTLE PAGE 16 (1916)

ف۳ CNNLRIDLL HISTORY OF INDIA V.5. P156

ف۴ MU

کے کمرے میں اور موسم گرما میں بند کیے جاتے تو یہ ممکن نہ تھا کہ ان میں سے ایک بھی زندہ بچتا۔" ڈاکٹر باسو کہتے ہیں کہ ہال ویل کے شریکِ کار خود اس کی دروغ بیانی کے معترف ہیں[۵۱] کیمبرج ہسٹری میں لکھا ہے کہ کوئی ایسا سالہ موجود نہیں جس سے پتا لگ سکے کہ قلعہ کلکتے کی تسخیر کے وقت کتنے انگریز موجود تھے[۵۲]

میرے خیال میں یہ شواہد اس داغِ ناحق کے دور کرنے کو کافی ہیں۔ مگر اور سُن لیجیے کہ بڑے بڑے —— مورخوں نے کیا کیا ٹھوکریں کھائی ہیں اور ایک دوسرے کی تردید کی ہے۔

لارڈ مکالے کہتے ہیں (ESSAYS OF MACONLEY ON LORD CLIVE) "......... انگریزوں کی ایک بڑی جماعت فاتح کے ہاتھ آئی نواب نے ان قیدیوں کو بہت لعن طعن کی اور ان کی جاں بخشی کرکے اپنے کیمپ میں چلا گیا۔ قیدی محافظانِ قلعہ کے رحم پر تھے انھوں نے قیدیوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا جو بلیک ہول کے خوفناک نام سے مشہور ہے۔ یہ ۲۰ فٹ مربع کمرہ ایسا تھا کہ اس گرمی کے موسم میں ایک انگریز بھی اس میں نہ رہ سکتا تھا۔ اس رات کی تکلیف اور مصیبت کے جو حالات بیان کیے جاتے ہیں ان کی مثال دُنیا کی تاریخ

---

۵۱ BISE OF CHRISTIAN PAMN IN INDIA
BY BASU V.I P. 174

۵۲ CUMLRIDLL HISTORY OF INDIA
VAL P. 156

نوٹ ۔ جہاں حوالہ نہیں دیا گیا وہاں میجر باسو کے بیان پر حصر کیا گیا ہے۔

ہیں تو کیا کہانیوں میں بھی نہیں مل سکتی۔ وہ رحم کے لیے چلاّتے تھے، پانی کے لیے تڑپتے تھے، دروازوں سے ٹکرے لیتے تھے۔ ہال ویل نے کوشش کی مگر کوئی نواب کو جگانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ یہ سُن کر قیدی مایوس ہو گئے اور ان پر غشی سی طاری ہو گئی اور کھڑکیوں تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ پانی آیا تو اس کے لیے جو ہاتھا پائی ہوئی اس میں بہت سا ضائع ہو گیا۔ روشن دان چھوٹے چھوٹے تھے جن سے کافی ہوا اندر نہ آتی تھی۔ صبح کو نواب نے دروازہ کھولنے کا حکم دیا، اس میں سے ۲۳ آدمی زندہ نکلے جن کا حلیہ اس قدر بگڑا ہوا تھا کہ ان کی مائیں بھی شناخت نہ کر سکیں۔ ۱۲۳ لاشیں نکلیں جن کو ایک گڑھے میں دفن کیا گیا مگر نواب نے کسی رنج یا افسوس کا اظہار نہ کیا ...... اس حادثے سے صرف ایک عورت مسز کیسری (KESRY) بچی جو نوجوان اور بلا کی خوب صورت تھی۔ سراج الدولہ نے اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ سراج الدولہ نے کلکتے کا نام علی نگر رکھا (جس کا ترجمہ لارڈ صاحب نے (FORT OF GOD) کیا ہے)۔ اس کے بعد نواب مُرشد آباد جا کر بدمعاشی میں مشغول ہو گیا۔ یہ نواب اس قدر جاہل تھا کہ کہا کرتا تھا "یورپ کی آبادی دس ہزار سے زیادہ نہیں" نواب تو جاہل تھا مگر آپ اپنے ترجمے کی نسبت کیا فرماتے ہیں کہ علی کو اللہ بنا دیا۔

بس ٹیڈ لکھتا ہے کہ: بلیک ہول کے طول و عرض میں اختلاف ہے۔

---

(1) Busteeds Echoes from the old Calcutta

P 281, 190, 34, 36, 40, 41, 39

اور حمی ۲۵ فٹ سے کم ہال ویل ۱۸ فٹ اور گک ۱۴ × ۱۸ فٹ بتاتا ہو
جس میں ایک دروازہ اور کھڑکی جملہ قیدی جن میں ہر ملک کے لوگ تھے
۱۴۶ تھے جن میں ایک عورت تھی۔ انھیں پانی کی ایک مشک پہنچائی گئی
قیدیوں میں بہت سے زخمی تھے۔ کُک صاف الفاظ میں کہتا ہو کہ چھ
اور سات بجے شام کے وقت سراج الدولہ قلعہ مانک چند کے سپرد
کرکے چلا گیا۔ نواب کو قیدیوں کے رکھنے کے معاملے میں کوئی دخل نہ
تھا اس نے صرف اتنا کہا کہ انھیں رات کو رکھو۔ نواب کی صرف اتنی
ذمے داری ہو کہ اس نے قیدیوں کی مصیبت پر اظہارِ افسوس نہیں کیا مگر
اس نے پانی بہم پہنچانے کا حکم دیا۔ انھیں مرشد آباد میں جب اس نے
آزاد کیا تو کسی نے گزارش کی کہ انھیں مانک چند کے حوالے کیا جائے
تو نواب نے کہا: "اگر کسی کے پاس کچھ بچ گیا ہو تو رہنے دو، انھوں
نے بہت تکلیف اٹھائی ہو"۔ اس کے بعد بس ٹیڈ کپتان ملز کے
حوالے سے کہتا ہو کہ: "۱۴۴ کس جلائے گئے اور ۱۲۰ مارے گئے"۔
پھر ٹاس بی لس کی روایت سے فرماتے ہیں کہ "مسز کیری کے ساتھ
اس کی ماں اور بہن بھی تھیں۔ لیکن بچنے والوں کی جو فہرست ملز نے
تیار کی اس میں مسز کیری کا نام تک نہیں"۔ ہاول کا قول ہو کہ ۱۸۰
مرے اور ۱۶۰ بچے اور کرکس کہتا ہو کہ قیدیوں میں صرف ایک عورت
تھی اور بہ قول ہال ویل، جس قدر بچ نکلے ان سب کو ماسوا مسز کیری کے
جو نوجوان اور حسینہ تھی آزادی مل گئی۔ اس پر آپ اپنی طرف سے
ایزاد کرتے ہیں کہ اس زبوں حالی میں کسی عورت کا حسن دکھائی دینا
محالات سے ہو۔ وہ باقیوں کے ہمراہ کالی باڑی چلی گئی ہو گی"۔ مگر

اورمی کہتے ہیں کہ "مسز کیسری کو میر جعفر اٹھا لے گیا تھا۔ یہ قرین قیاس ہو سکتا ہے کیوں کہ میر جعفر خوب صورت عورتوں کا شیدائی تھا اس لیے اورمی نے اسے منتخب کیا۔ مکالے نے لکھا ہے: ایک انگریز خاتون جس نے اپنے خاوند کو مرتے دیکھا اس حادثے سے بچ گئی لیکن ظالم کو پسند آگئی اور وہ اس کے حُسن کی تاب نہ لا سکا اور اسے ہم آغوشی کے لیے کہا اور وہ سراج الدولہ کی حرم سرا میں سات برس رہی آخر گورنر وین اسٹارٹ نے اسے آزاد کرایا اور آج کل وہ کلکتے میں رہتی ہے۔" لیکن جب ظالم نواب خود اس حادثے کے ایک سال بعد تک زندہ نہ رہا تو مسز کیسری اس کے محل میں سات سال کس طرح رہی؟[۹۱] اس کے بارے میں نوٹا مانس لکھتے ہیں:[۹۲]

"یہاں مصنف نے ان انگریزوں کا ذکر نہیں کیا کہ جو بلیک ہول میں بند کر کے ہلاک کیے گئے۔ سچی بات یہ ہے کہ انھیں صرف رات کی رات کے لیے بند کیا گیا۔ صبح صوبے دار کے رو بہ رو پیش ہونا تھا۔ انھوں نے انگریزوں کو اس کمرے میں بند کیا جو انھیں بتایا گیا کہ قلعے کا بندی خانہ ہے۔ انھیں کمرے کی وسعت کا کوئی علم نہ تھا بلکہ انگریز بھی اس سے بے خبر تھے۔ بنگالے میں اس حادثے کا کسی کو پتا نہیں۔ خاص کلکتے میں چار لاکھ کی آبادی میں ایک شخص کو بھی

---

۹۱ THE CTLEN SIDE OF THE MIDAL BY THUHSAN P. 78

۹۲ سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۱۹۵ نوٹ نمبر ۹۹

اس کا کوئی پتا نہیں۔ صاف یہ ہی کہ سارے بنگالے میں ایک
بھی شخص نہ ملے گا جو اس حادثے سے واقف ہو۔"

اگر یہ الزام ہندستانیوں پر وارد ہوتا ہی تو انگریز اس واقعے کا کیا جواب دیں گے کہ انھوں نے چار سو ہندو سپاہی کشتیوں میں ڈال کر مدراس روانہ کیے جن میں ان کی ضروریات کی ایک بھی چیز نہ تھی اور تین دن کے فاقے کے بعد سب ہلاک ہو گئے۔[1] اسی سلسلے میں ایک اور ہول ناک روایت یہ ہی کہ: یکم اگست سنہ ۱۸۵۷ء کو بے شمار سپاہی امرت سر کے ایک بُرج میں بند کیے گئے۔ جب ان میں سے ۲۳۷ کو گولی سے مارا گیا تو رپورٹ ہوئی کہ باقی باہر نہیں آتے۔ جب دروازہ کھولا گیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ سب کے سب مر چکے ہیں۔ ان کی تعداد ۴۵ بتائی جاتی ہی۔ یہ سب خوف، تھکان، گرمی اور حبس دم کی بدولت فوت ہوئے۔"

ایک شاہد عینی کا بیان ہی کہ اس کے روٗ بہ روٗ ایک قیدی کو سنگین کی نوک سے مجروح کر کے جلتی آگ پر زندہ جلایا گیا جس کی بوٗ سے ناک نہ دی جاتی تھی۔ حیرت ہی کہ انیسویں صدی میں تہذیب اور اخلاق کے ذمے دار اس طرح ایک انسان کی زندگی ختم کریں اور انگریز نہایت اطمینان سے کھڑے تماشا دیکھیں۔ (یہ ایک جملہ معترضہ ہی یہ دکھانے کے لیے کہ "ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔"

---

(1) "The Crisis in the Punjab", Calcutta Review for April 1892

مسٹر بسٹیڈ کہتے ہیں کہ: "ایک شخص انھیں ملا جو مسز کیسری کا پروردہ تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے کوئی مسلمان اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔"

مارش مین کہتے ہیں۔ (HISTERY P.148) کہ "شام کے وقت نواب اپنے خیمے کو چلا گیا۔ انگریز قیدیوں کو ایک وارنٹ میں جمع کیا گیا اور دیسی افسر کسی ایسی عمارت کی تلاش کرنے لگے جس میں انھیں رات کے وقت رکھا جائے مگر کوئی موزوں جگہ نہ ملی اور انھیں ایک پاس کے کمرے میں جانے کو کہا گیا جسے انگریز بہ طور حوالات استعمال کرتے تھے۔ یہ کمرہ ۲۰ فٹ مربع تھا جس میں صرف ایک کھڑکی تھی اور گو وہ چند ملزم سپاہیوں کے لیے کافی ہوتی مگر ۱۴۷ اشخاص کو اس میں ٹھونس دینا موت کو دعوت دینا تھا۔ خاص کر جب کہ موسم سخت گرم تھا۔ یہ بے چارے قیدی نفس بند گرمی اور ناقابلِ برداشت پیاس سے تڑپنے لگے اور انھوں نے سپاہیوں سے کہا کہ انھیں گولی مار کر اس عذاب سے نجات دلائیں۔ وہ ایک ایک کرکے موت کے گھاٹ اترنے لگے اور جب صبح کو دروازہ کھولا گیا تو صرف ۲۳ زندہ رہے جنھیں گھسیٹ کر باہر نکالا گیا۔ یہ ہے بلیک ہول کا حادثہ جس نے سراج الدولہ کو ایسا داغ لگایا ہے جو رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ لیکن اسے ایک ایسی معمولی بات سمجھا گیا کہ ہندستانیوں نے

اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی اور مسلمان مورخوں نے اس کا ذِکر تک نہیں کیا .... انگریز اس طرح بنگال سے بدر کیے گئے جیسے اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں ہوئے تھے۔"

میجر بی ڈی باسو اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں:۔

"جب کلکتے کا قلعہ موسومہ فورٹ ولیم سر ہوا تو سراج الدولہ نے حکم دیا کہ قیدیوں کو حفاظت سے رکھا جائے۔ سراج الدولہ انگریزوں کی خصلت سے آگاہ نہ تھا ورنہ ان سب کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا وہ بجا طور پر باغی تھے اور باغی کی سزا موت ہے۔ اس لیے اگر ان سب کو ہلاک کر دیتا تو وہ کسی صورت میں موردِ الزام نہیں ہو سکتا تھا لیکن سراج الدولہ مشرق کا رہنے والا تھا جس میں گوتم، مسیحؑ اور محمدؐ نے جنم لیا۔ رحم اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اس لیے وہ فتح کے وقت بھی خوفِ خدا کو نہ بھولا اور اس نے اس فیاضی اور فراخ دلی سے کام لیا جو مغربیوں میں شاذ ہی پائی جاتی ہے۔ بعض ہندستانی مورخ جو دُنیا جہان کے مصائب اس کے سر دھرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اس کی اس جان بخشی کو اشرف النسا بیگم اور امینہ بیگم کی سفارش کا ثمر کہتے ہیں۔ وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ ہر دو بیگمات انگریزوں کے ذریعے تجارت کرتی تھیں۔ اگر یہ درست ہو تو بنگالہ اور نواب کی زندگی کی صورت جواب

کی سی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نواب انگریزوں کو حقیر سمجھتا تھا اور چوہوں کا مارنا اسے گوارا نہ تھا۔ یہ اس کی غلطی تھی جس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا۔ انگریز لوگ کلکتے کی تسخیر کے ساتھ بلیک ہول کا حادثہ وابستہ کرتے ہیں۔ یہ مشتبہ ہے کہ آیا ایسا کوئی واقعہ ظہور میں آیا بھی اور اگر آیا تو سراج الدولہ اس کا کس حد تک ذمے دار ہے۔"

۲۰ جون ۱۷۵۶ء بروز اتوار نواب کی فوج قلعے میں داخل ہوئی اور محصورین کے ساتھ انھوں نے کوئی بدسلوکی نہیں کی۔ ڈریک کے تذکرے مورخہ ۱۹ جولائی ۱۷۵۶ء کے مطابق سراج الدولہ قلعے میں داخل ہوا اور اس نے ایک دربار منعقد کرکے امرا کو مبارک باد دینے کا موقع دیا۔۔۔۔ قیدی اس کے روبرو پیش کیے گئے اور انھوں نے جان بخشی چاہی۔ یہاں ہال ویل بھی دست بستہ پیش ہوا۔ مسٹر ہل لکھتے ہیں:-

"نواب کے سپاہیوں نے انگریزوں کا مال لوٹا مگر کوئی بدسلوکی نہ کی۔ چند انگریزوں نے جو شراب کے نشے میں چور تھے نواب کے سپاہیوں کو زدوکوب کیا۔ انھوں نے نواب کے پاس شکایت کی اور اس نے پوچھا کہ انگریز بد اطوار سپاہیوں کو کہاں قید کیا کرتے تھے تو اسے بتایا گیا کہ بلیک ہول میں۔ امرا نے عرض کی کہ اس قدر سپاہیوں کو رات کے وقت کھلا چھوڑ دینا درست نہ ہوگا۔ اس لیے نواب نے حکم دیا کہ انھیں بلیک ہول میں بند کیا جائے

چناں چہ ۱۴۶ نفوس ایک ایسے کمرے میں بند کیے گئے جو
۱۸ فٹ مربع تھا اور جس میں ایک یا دو آدمیوں سے زیادہ
نہ سما سکتے تھے۔ اس پر غضب یہ کہ گرمی شدت کی پڑ رہی تھی"۔
ہال ویل نے ان قیدیوں کی مصیبت کو اپنے تذکرے میں بہت
رقت انگیز طرز سے بیان کیا ہے۔ ۷ بجے شام سے ۶ بجے صبح تک یہ
لوگ محبوس رہے مگر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ نواب کو بیدار کرتا۔
صبح کو جب وہ بیدار ہوا تو ۱۴۶ میں سے صرف ۲۳ برائے نام زندہ تھے۔
بلیک ہول کے بارے میں انگریز مورخوں کی یہ رائے ہے۔
افسوس کہ مسٹر ہل نے ان دلائل کی طرف توجہ نہیں دی جو
بلیک ہول کو محض ایک افسانہ ثابت کرنے کے لیے ایک بنگالی
کتاب میں دیے گئے ہیں۔

TRAVELS OF A HNDU کے مصنف ڈاکٹر بھولاناتھ
چندر نے کلکتہ یونی ورسٹی میگزین سنہ ۱۸۹۸ء میں ایک مضمون شائع کرایا
جس کی تلخیص اس سلسلے میں قابلِ ملاحظہ ہے۔ آپ لکھتے ہیں:۔
" بلیک ہول کے متعلق جسے ہال ویل نے پہلے پہل دنیا
کے سامنے پیش کیا، یہ سوال ہمیشہ میرے دامن گیر رہا کہ
۱۴۶ آدمی کس طرح ۱۸ فٹ کمرے میں دھکیلے گئے۔ اسے
سراسر جھوٹ قرار دینا پڑتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ محض
جذبات ترحم کو بیدار کرنے کے لیے یہ کہانی بنائی
گئی ہے"۔
کپتان گرانٹ منیجر کلکتہ کی رپورٹ مورخہ ۱۲ جولائی سنہ ۱۸۵۷ء میں

لکھتے ہیں :۔

" قیدی ایک ۱۶ فٹ مُربع کمرے میں (بلیک ہول میں) بند کیے گئے جن کی تعداد ۲۰۰ تھی اور ان میں انگریز، پرتگالی اور ارمنی شامل تھے۔ گرمی اور تنگ کمرے کے باعث ان ۲۰۰ میں سے صرف دس زندہ بچے۔"

کپتان گرانٹ کو بلیک ہول کی پیمائش، قیدیوں اور زندہ بچنے والوں کی تعداد میں دیگر انگریز موّرخوں سے اختلاف ہے۔

ڈاکٹر ولسن اپنی کتاب OLD FORT WILLCAN IN) (BENGAL (جلد دوم میں لکھتے ہیں :۔

" بلیک ہول کا رقبہ ۱۸ × ۱۴ فٹ ۱۰ انچ تھا یعنی ۲۶۷ مُربع رقبہ میں ۱۴۶ آدمی بند کیے گئے۔ اس طرح ایک آدمی کے حصے میں ۲ مربع فٹ جگہ آئی۔ مگر ڈاکٹر ولسن نے یہ دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ ۱۴۶ نفوس ۲۶۷ فٹ مربع جگہ میں کس طرح بند کیے گئے۔ اندازاً ایک آدمی کے بیٹھنے یا کھڑا رہنے کے لیے ۳ فٹ مُربع جگہ مطلوب ہوتی ہے اس حساب سے ۸۹ سے زیادہ آدمی اس میں بند نہ ہو سکتے تھے۔"

یہ بحث اس صورت کے متعلق ہے جب کہ بلیک ہول کا حادثہ وقوع میں آنا تسلیم کیا جائے لیکن ایسے بھی دلائل اور ثبوت موجود ہیں جن سے ایسے واقعے کے ظہور میں آنے کی تکذیب ہوتی ہے۔ مسلمان موّرخوں کی کتابوں میں یا مدراس کونسل کی رودادمیں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ کلائیو واٹسن

نے جو خط نواب کو لکھے اور معاہدۂ علی نگر بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔ کلائیو نے جو چٹھی بورڈ آف ڈائرکٹرز کو یہ بتانے کو لکھی کہ سراج الدولہ کو کیوں معزول کیا گیا۔ اس میں اس واقعے کی نسبت اشارۃً تک نہیں کیا۔ سازش کے تعلق میں جو معاہدہ میر جعفر سے ہوا اس میں ہر قسم کے نقصان کا معاوضہ درج ہوا مگر اس میں ایک ہول میں مرنے والوں کے رشتے داروں کے لیے کوئی خوں بہا طلب نہ ہوا۔ ۴ اگست ۱۷۶۵ء کو کمیٹی کے سامنے جب رپورٹ پڑھی گئی اس وقت بھی یہ واقعہ یاد نہ آیا۔ کلائیو ہندستان دوبارہ اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ بلیک ہول کے حادثے کے ذمے داروں کو قرار واقعی سزا دے لیکن اس نے ہندستان میں آکر اس کے متعلق کوئی بات تک نہ کی۔ مخفی نہ رہے کہ ہال ویل کو بھی صداقت پسند تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ وہ جھوٹی کہانیوں کا موجد بیان کیا جاتا ہے۔

یہ شخص ۱۷۱۱ء میں ڈبلن میں پیدا ہوا اس نے طبابت کا پیشہ اختیار کیا اور ۱۷۳۲ء میں ہندستان آیا۔ چند سال طبابت کرنے کے بعد وہ کلکتے کا زمین دار بن گیا اور طبابت کے ساتھ جج اور کلکٹر کے فرائض اسے تفویض کیے گئے نیز اسے کونسل کا ممبر بنایا گیا۔ جب سراج الدولہ نے کلکتہ فتح کیا تو وہ قید ہو گیا۔ رہا ہونے کے کچھ عرصے بعد وہ کچھ سرکاری کاغذات لے کر سائرن نامی جہاز پر وطن کو روانہ ہوا۔ اس سفر کے دوران میں ۲۸ فروری ۱۷۵۷ء کو اس نے ایک ۳۲ صفحے کی چٹھی ولیم ڈیوس کو لکھی جس میں بلیک ہول کے واقعہ کا ذکر کیا۔ جب وہ پھر ہندستان آیا تو سراج الدولہ شہید ہو چکا تھا اور میر جعفر مسند نشین تھا۔ میر جعفر نے اسے ایک لاکھ روپیہ انعام دیا مگر اس کی ناشکر گزاری ملاحظہ ہو کہ وہ

میر جعفر کی معزولی کی سازش میں شریک ہوگیا اور میر قاسم سے تین لاکھ روپے رشوت لیے۔ میر جعفر پر جھوٹے الزام لگانے میں اس نے مطلق تامل نہ کیا۔ اپنی ایک یادداشت میں لکھتا ہے:-

"نواب جعفر علی خاں بڑا ظالم اور حریص تھا اور پرلے درجے کا سُست۔ اس نے بلا وجہ بے شمار بے گناہوں کا خون اپنے سر لیا۔ ان سب کا نام گنوانا طولِ عمل ہے، مگر چند مثالیں:

(۱) گھسیٹی بیگم = بیوہ شہامت جنگ

(۲) امینہ بیگم = والدہ سراج الدولہ

(۳) مراد الدولہ = پسر بادشاہ قلی خاں اکرام الدولہ

(۴) لطیف النسا بیگم = بیوہ سراج الدولہ اور اس کی شیر خوار بچی

یہ پانچ کس جون ۱۷۶۵ء کو رات کے وقت ڈھاکے میں مارے گئے جہاں وہ میر جعفر علی خاں کی مسند نشینی کے وقت سے مقید چلے آتے تھے۔ جسارت خاں نائب ڈھاکہ کے نام ایک پروانہ بھیجا گیا کہ نوابان علی وردی خاں، شہامت جنگ، اور سراج الدولہ کے تمام رشتے داروں کو ٹھکانے لگایا جائے۔ لیکن اس نے اس ظالمانہ حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کیا اور قاصد نے جب ہدایت کے مطابق انھیں بندی خانے سے نکالا تو انھیں رات کے وقت دریا پر لے گیا اور قتل کرکے دریا میں ڈبو دیا۔ ان کے ساتھ بیس لونڈیاں ہلاک کی گئیں۔"

یہ تحریر سراسر جھوٹی ہے۔ یکم اکتوبر ۱۷۵۸ء کو جو رپورٹ قلعے سے ولایت بھیجی گئی اس میں لکھا گیا کہ :۔

"مسٹر ہال ویل نے جن خوف ناک قتلوں کا الزام سابقہ نواب میر جعفر پر لگایا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے۔ تمام مقتول ماسوا دو کے زندہ سلامت ہیں۔ گھسیٹی بیگم اور امینہ بیگم تو ضرور قتل ہوئیں مگر باقی مدت تک زندہ رہے"

اگر ہال ویل کو اپنے مربی اور سرپرست میر جعفر پر بہتان باندھنے میں تامل نہ کیا تھا تو کیا تعجب ہے کہ اس نے سراج الدولہ کو بدنام کرنے کی غرض سے بلیک ہول کی کہانی تصنیف کی۔

اس پر بھی اگر اس واقعے کو تسلیم کیا جائے تو یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ سراج الدولہ اس الزام کا مستحق ہے۔ اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ کوٹھری سراج الدولہ نے تعمیر نہ کی تھی۔ مورخ جیمس مل (جلد سوم صفحہ ۱۷) لکھتا ہے کہ

"صوبے دار۔ گو انسانیت اس کے کردار کا کوئی جزو نہ تھی۔ اس موقعے پر ظلم کرنے کا خواہاں نہ تھا کیوں کہ جب ہال ویل کو دست بستہ اس کے روبرو لے گئے تو اس نے فوراً اس کے ہاتھ کھول دینے کا حکم دیا اور اسے بہ حیثیت ایک سپاہی کے یقین دلایا کہ ان کا بال تک بیکا نہ ہوگا۔ اس کے بعد جب شام ہوگئی تو یہ دیکھنا محافظوں کا کام تھا کہ ان قیدیوں کو رات بھر کس طرح رکھا جائے۔ کسی موزوں کمرے کی تلاش کی گئی مگر قلعے

میں کوئی ایسا کمرہ نہ ملا۔ آخر ایک کمرے کی اطلاع ملی جسے انگریز خود بندی خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے بلا مزید تفتیش کے قیدیوں کو اس میں ڈال دیا گیا سوئے اتفاق سے یہ کمرہ تنگ و تاریک تھا۔ ہوا اس میں برائے نام آتی تھی اس کمرے کو بلیک ہول کہتے ہیں۔

انگریزوں کو اپنا شکوہ ہونا چاہیے کہ خود انھوں نے نواب کے ملازموں کو بتایا کہ یہ کمرہ قید خانے کے لیے موزوں ہے۔"

مسٹر ہل لکھتے ہیں:-

"غالباً بلیک ہول محض بات کا بتنگڑ ہے اور کلکتے کے متعلق باتوں میں بلیک ہول اور فورٹ ولیم کو مدغم کیا گیا ہے اگر یہ درست ہے تو بلیک ہول کی کہانی کا سراغ مل جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ آدمی جو جہازوں تک بھاگ نہ سکتے تھے گرفتار ہوئے اور فورٹ ولیم میں قید کیے گئے۔"

ان واقعات کے پیشِ نظر جو انھوں نے تفصیل سے بیان کیے، میجر باسو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:-

"بلیک ہال کا حادثہ محض دیو مالا ہے اور خود غرض انگریزوں نے اپنا مطلب نکالنے کے لیے بنا یا ہے۔ اگر تئاون آدمی مر گئے تو وہ حبسِ دم کی وجہ سے نہیں بلکہ زخموں کی وجہ سے اور درد کی بہ دولت جاں بر نہ ہو سکے۔ کیوں کہ وہی اشخاص قلعے میں رہ گئے تھے جو جہازوں تک پہنچنے سے

معذور تھے۔"

ان تمام بیانات اور مختلف آرا سے یہ عیاں ہو کہ یہ سراسر ایک بے بنیاد کہانی ہو اور ہال ویل نے جہاز کا سفر کاٹنے کے لیے بنائی ہو۔ اب سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ داستان من گھڑت ہو اور قلعے میں کوئی ایسا کمرہ ہی نہیں جسے بلیک ہول سے منسوب کیا جائے۔ اس افسانے کی صحت کو قبول کرنے والے مورخ بھی مانتے ہیں کہ سراج الدولہ کو اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب کچھ اس کے علم کے بغیر اور دیوان مانک چند کے حکم سے ہوا اور اس لیے ہوا کہ قلعے میں یہی جگہ بندی خانہ تھی مگر اس سے صرف نواب کو ملزم گردانا مقصود نہ تھا بلکہ انگلستان کو یہ جتانا مقصود تھا کہ ہندستانی ایک جاہل اور وحشی قوم ہیں جن میں انسانیت نام کو نہیں تاکہ کمپنی کے بدمعاش افسروں کے جور وستم کو حق بہ جانب ثابت کرنے کا راستہ صاف ہو جائے۔ کیوں کہ اس وقت کمپنی میں وہی انگریز ملازم ہوا کرتے تھے جن کو یورپ قبول نہ کرتا تھا۔ ان کی اخلاقی حالت کیا تھی اور ان پر بربریت کا اثر کس قدر غالب تھا، اس کے لیے غدر ۱۸۵۷ء کے اختتام پر جو ستم رانیاں کی گئیں، انھیں دیکھنا چاہیے۔ ان سے معلوم ہوتا ہو کہ اہلِ کمپنی میں انسانیت نام کو نہ تھی اور انھوں نے بے گناہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے قتل کرنے میں کبھی تامل نہ کیا۔ انگلستان کے بعض مورخ اب بھی ان حرکاتِ ناشایستہ کا ذکر کرتے وقت عرقِ ندامت میں غرق ہو جاتے ہیں۔ اس ظلم و جور کی تاب نہ لا کر ہچنسن (HUTCHINSON) کہتے ہیں اشتعال میں جس بربریت سے کام لیا گیا اس پر سادہ تنقید سے کام

لینا محال ہے۔ چند واقعات ملاحظہ ہوں جن میں ایسے ظلم توڑے گئے کہ ان کی مثال ہندستان تو کیا دُنیا کی تاریخ میں نہ ملے گی۔

(۱) بہادر شاہ کے سب بچے گولی سے مار دیے گئے۔ بتائیے ان معصوموں کو موت کی سزا کس طرح مل سکتی تھی۔

(۲) لوگوں کو توپ کے ساتھ باندھ کر اُڑا دینا عام طریق سزائے موت تھا۔

(۳) لوگوں کے جسم کو اکٹھا کر کے آٹھ 8 کی شکل بنا کر مار دینا کہاں کی تہذیب ہے۔

(۴) عورتوں اور بچیوں کو آگ کے الاؤ میں زندہ جلا دینا ایک مسلمہ ظلم و سفاکی ہے[1]۔

شوکت جنگ کی بغاوت ذکر ہو چکا ہے کہ سعید احمد یعنی سراج الدولہ کا دوسرا چچا پورینہ کا صوبے دار تھا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا میرزا ہمایوں شوکت جنگ صوبے دار پورینہ بنا اور سراج الدولہ کے خلاف گھسیٹی بیگم اور میر جعفر کی سازش میں شریک ہوا۔ نواب اس کی سرکوبی کو بڑھا مگر کمپنی کی بغاوت سُن کر اسے واپس ہونا پڑا۔ جب وہ کلکتے سے واپس آیا تو اس نے پورینہ کی طرف توجہ کی۔ صاحب سیر المتاخرین نے شوکت جنگ کی مصاحبت اختیار کی مگر اس نے آپ کے مشورے پر عمل نہ کیا۔ اس مورخ کے بیان سے

---

(1) "The Empireul the Nabules" by Hutchins P 138-140 — "Histury of Sepoy" By Kayce P 93

معلوم ہوتا ہے کہ شوکت جنگ بالکل ناخواندہ تھا۔ اسے پڑھانا چاہتے تھے لیکن وہ نہ پڑھتا تھا۔ انھی دنوں اسے میر جعفر کی چٹھی ملی کہ وہ علی وردی خاں کی تمام جائداد کا دعوے دار بنے اور سراج الدولہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے۔ اس نے پوری امداد کا وعدہ کیا تھا۔ اس قسم کی ترغیبوں نے بے وقوف شوکت جنگ کے دماغ کا توازن قائم نہ رہنے دیا۔ اس حماقت میں مصلی خاں کی تائید نے اور اضافہ کیا۔ یہ شخص میر جعفر کا آدمی تھا اور شوکت جنگ کو بغاوت پر اُکسانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ جو کسر باقی رہ گئی تھی اسے حبیب بیگ نے پورا کیا۔ اس شخص نے کلکتے کے محاصرے میں سراج الدولہ سے دغا کی تھی اس لیے بھاگ کر پورنیہ چلا آیا تھا اور نواب کی جان کا لاگو ہو گیا تھا۔ دُنیا کی باتوں سے ناآشنا، ناتجربے کار، ناخواندہ، عیش پرست، شوکت جنگ ان کے جُل میں آ گیا۔ اس نے حبیب بیگ اور میر مصلی خاں کے مشورے سے وہ لائحہ عمل بنایا جس سے اس کی شیخ چلّی کی ایسی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ منصوبے یہ تھے کہ بنگال پر قبضہ کر کے وہ شجاع الدولہ اور عمدۃ الملک کو شکست دے گا اور اپنی پسند کے شہزادے کو دہلی کے تخت پر بٹھا کر لاہور کو فتح کر کے کابل کو زیرِ نگیں لائے گا اور خراسان اور قندھار کو قبضے میں لا کر وہاں سکونت اختیار کرے گا کیوں کہ بنگال کی آب و ہوا اسے راس نہیں آتی۔ میر جعفر کی چٹھی کے پہنچتے ہی اس کا غرور و تکبر جو پہلے ہی آسمان پر پہنچے تھے، اب عرشِ معلےٰ کی خبر لانے لگے اور اس نے اپنے باپ کے اُمرا کے ساتھ چھیڑ خانی شروع کی۔ پُرانے

وفا شعار امرا نکالے گئے میر مصطفیٰ خاں اور حبیب بیگ سب کام پر چھا گئے اور صاحب سیر المتاخرین بھی کس مپرسی کے ریلے میں آ گئے جن کی وجہ سے اسے جلی کٹی سناتے جاتے ہیں۔ اب اس نے اپنے مشیروں کے ایما پر "عالم پناہ" کا لقب اختیار کیا اور اس کی اطلاع دہلی دی گئی اور کہا گیا کہ جو حکم اس لقب سے معرّا ہو اس کی تعمیل نہ ہوگی۔ یہ نواب زنانہ انداز میں باتیں کرتا اور اسی وضع کا لباس پہنتا تھا۔ میر دربار فحش گالیاں دینے اور بازاری محاورے بولنے سے اسے دریغ نہ تھا۔ کرنل لا کی بھی ایک دفعہ شوکت جنگ نے بہت بے عزتی کی یہاں تک کہ وہ سر دربار اسے کوڑے لگانے لگا۔ اب یہ خبر پہنچی کہ کرنل لا سراج الدولہ کی دعوت پر مرشد آباد جا رہا ہے۔ اس پر اسے غصہ آیا اور بہکا ہوا بہت کچھ کہہ گیا۔ سراج الدولہ کو بھی ہر ایک خبر پہنچ رہی تھی۔ اسے شوکت جنگ کے ارادوں اور میر مصطفیٰ خاں اور حبیب بیگ کی ریشہ دوانیوں کا پورا علم تھا۔ مگر اس نے تحمل سے کام لیا اس نے کسی اقدام سے پہلے ان خبروں کی تصدیق کرنی چاہی تاکہ جہاں تک ممکن ہو سکے سہولت سے قصہ طے ہو جائے۔ مگر اس میں کام یابی نہ ہوئی اور خوف ناک خبروں کا تانتا بندھ گیا۔ نواب نے شوکت جنگ کو ایک اور موقع امتحان کے لیے دیا اور راجا دلب رام کے چھوٹے بھائی راش بہاری کو بیر نگر اور گوند وارہ کا فوج دار مقرر کیا۔ یہ علاقے صوبہ پورنیہ میں واقع تھے۔ راش بہاری کو حکم نامہ عطا ہوا اور غیر سرکاری خط میں سراج الدولہ نے تمام معاملہ شوکت جنگ کو

سمجھایا کہ کیوں راش بہاری کو فوجدار مقرر کیا گیا ہے۔ راش بہاری نے راستے ہی سے ایک عرضی اور نواب کا حکم شوکت جنگ کو بھیجے۔ لیکن اس وقت صاحب سیر المتاخرین کے مشورے کے مطابق شوکت جنگ اس بات پر آمادہ ہو چکا تھا کہ برسات کے موسم میں سراج الدولہ کو خط کتابت میں الجھایا جائے اور بعد میں انگریزوں سے سازش کر کے سراج الدولہ کا کام تمام کیا جائے کیوں کہ انھیں معلوم ہوا تھا کہ انگریز عنقریب نواب پر حملہ کرنے والے ہیں۔ غرض اس نے راش بہاری کے قاصد کو بلا کر اسے خوب تنبیہ کی اور دھمکایا اس کے بعد اس نے وزیر اعظم دہلی کی چٹھی منگوائی جسے وہ اپنی جہالت کے باعث فرمان سمجھتا تھا اسے سر دربار پڑھا گیا نہایت تحکمانہ لہجہ میں اس نے زبانی جواب دیا اور نواب کے نام ایک چٹھی لکھوا کر دی جس کا لب لباب یہ تھا:-

"میرے پاس صوبہ بنگالہ، بہار اور اڑیسہ کا فرمان پہنچ گیا ہے لیکن چوں کہ آپ میرے بھائی اور ایک خاندان سے ہیں، میں آپ کی جان بخشی کرتا ہوں اور اس سلسلے آپ کے اخراجات کے لیے جہانگیر نگر میں کچھ اراضی جو آپ پسند کریں دے دوں گا۔ جب آپ چاہیں فرمان جاری ہو جائے گا۔ سردست آپ اسی طرف چلے جائیں اور محلات، خزانہ، مال و متاع میرے اہل کاروں کے حوالے کر دیں جو اب جلد استعمال کریں کیوں کہ میں اس کے حصول کے لیے پا بہ رکاب ہوں۔" قاصد یہ جواب لے کر راش بہاری کے پاس پہنچا خط دیا اور زبانی جواب

بھی سُنا دیا۔ سراج الدولہ نے شوکت جنگ کی اس حرکت کو خلافِ شان سمجھا اور بہ نفسِ نفیس اسے سزا دینے کے لیے آمادہ ہوگیا اور راجا رام نراین صوبے دار عظیم آباد کو حکم دیا کہ وہ اپنی فوج ہمراہ لے کر پورینہ پر حملہ آور ہو۔ راجا رام نراین راجا سُندر سنگھ کی معیت میں پورینہ کی فوج سے چار گُنی زیادہ فوج کے کر روانہ ہوا۔ ادھر سراج الدولہ ایک جانب سے خود بڑھا اور راج محل میں قیام کیا اور دوسری طرف سے اس کے وزیر مہاراجا موہن لال نے پورینہ کا رُخ کیا، شوکت جنگ کی فوج گو کم تھی مگر پورینہ کی دلدل اسے پناگاہوں کا کام دے سکتی تھی اور اس کے پاس کارگزار خاں، شاہ جہاں یار خاں اور میر سلطان قلی خاں جیسے کارآزمودہ جرنیل تھے جو چاہتے تو مہینوں مقابلہ کرتے مگر وہ اس جنگ کو ناحق کی مصیبت خیال کرتے تھے اور انھیں سراج الدولہ کے خلاف نبردآزما ہونا پسند نہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ شوکت جنگ کی طفلانہ حرکات سے متنفر تھے۔ بہرحال مارے باندھے سب شوکت جنگ کے ساتھ سرحد سے دو کوس پر خیمہ زن ہوئے اور حملے کا انتظار کرنے لگے۔ یہاں آکر بھی شوکت جنگ نے ترش روئی اور بدکلامی نہ چھوڑی جس سے افسروں کے دل ٹوٹ گئے۔ آخر مہاراجا موہن لال کا عَلَم نمودار ہوا اور اس نے شوکت جنگ کے کیمپ سے دو کوس کے فاصلے پر جھنڈا گاڑ دیا۔ اس وقت شوکت جنگ کے کیمپ میں جسے صاحب سیر "ہماری فوج" کہتے ہیں، کوئی کسی کے حکم کا پابند نہ تھا اسی وقت بنگالی فوج نے گولہ اندازی سے

جنگ کی ابتدا کی۔ شوکت جنگ کو اپنی جان کی فکر ہوئی اور جا بہ جا پناہ ڈھونڈنے لگا۔ اس پر ایک جہاں دیدہ سپہ سالار عمر خاں نے اسے بتایا کہ "لڑائی سے پہلے ہی بھگدر پڑ رہی ہے۔ لڑائیاں اس طرح نہیں لڑی جاتیں۔ میں نے نظام الملک کے جھنڈے تلے معرکے دیکھے ہیں مگر یہ کھل بلی کہیں نہیں دیکھی" اس پر شوکت جنگ نے نظام الملک کو گالیاں دے کر کہا کہ اسے کسی معلّم کی ضرورت نہیں وہ خود تین سو جنگوں میں شریک ہو چکا ہے۔ اب شوکت جنگ نے کارگزار خاں کے پاس چوب دار بھیج کر دریافت کیا کہ مہاراجا کے حملے کا کیوں جواب نہیں دیا جاتا۔ کارگزار خاں نے جواب دیا کہ اتنی بڑی فوج پر حملہ کرنا حماقت ہے، جب وہ حملہ کریں گے تو ہم بھی جہاں تک ہو سکے گا مقابلہ کریں گے۔ اس پر شوکت جنگ بہت برافروختہ ہوا اور کارگزار خاں کو خوب بے نقط سُنائیں۔ دوپہر ڈھل رہی تھی شوکت جنگ بھنگ کے پیالے پر پیالہ چڑھا رہا تھا، طوائفوں کے مجروں اور رقص و سرود میں مشغول تھا۔ شوکت جنگ ہاتھی سے اُتر آیا تھا اور خیمے میں آرام کر رہا تھا۔ صاحب سیر کی نمک حلالی کے جذبات اُبھرے اور انھوں نے ایک بھنگڑ کو نصیحت کے گھونٹ پلانے چاہے۔ یہ کہتے بہت کچھ رہے مگر وہاں سُنتا کون تھا، خیمے سے باہر آئے تو افسروں کو بد دل پایا۔ پھر جا کر شوکت جنگ سے کہا کہ جنگ شروع ہو گئی ہے ناچ رنگ چھوڑیے اور میدان میں نکلیے۔ شوکت جنگ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا بڑی مشکل سے ہاتھی پر سوار ہوا جس پر اسے بیٹھنا بھی دوبھر معلوم ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر فوج کے کچھ حوصلے بڑھے

مگر شوکت جنگ کی یہ حالت تھی کہ وہ نشے کے مارے ہاتھی کا دوڑنا بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اب بنگالی فوج نے اجتماعی حملہ کر دیا اور دست بہ دست لڑائی ہونے لگی۔ پورینہ کے بہت سے جاں باز افسر کام آئے شوکت جنگ کی فوج اس حملے کی تاب نہ لا سکی اور شوکت جنگ کا محافظ دستہ بھی بکھر گیا۔ اب شوکت جنگ کے اردگرد صرف سولہ سپاہی رہ گئے جن میں سے ایک صاحب سیر بھی تھے۔ شوکت جنگ اس وقت بالکل مدہوش تھا اتنے میں ایک گولی اس کی پیشانی پر لگی اور اس نے اسی دم دم دے دیا۔ اس کا سر پیچ اور بگڑی نیچے پڑ گر پڑی باقی لوگ بھاگ گئے۔ صاحب سیر صرف اپنے گھر چلے گئے۔ شام کے وقت لڑائی ختم ہوئی اور فوج کو تعاقب کی اجازت نہ دی گئی۔ فتح نامہ پہنچنے پر سراج الدولہ نے مہاراجا موہن لال کو ہدایت کی کہ شوکت جنگ کے خزانے اور توشہ خانے پر قبضہ کر لے۔

مہاراجا نے شوکت جنگ کی دولت و زر مرشد آباد روانہ کی اور اس کے اہل و عیال کو بھی نہایت عزت کے ساتھ مرشد آباد لے گیا۔ جب نظم و نسق اچھی طرح قائم ہو گیا تو مہاراج نے ملک ایک نائب کے سپرد کیا اور خود نواب کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ سراج الدولہ پر جو اعتراضات وارد ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے حقیقی عم زاد بھائی کو قتل کیا۔ سطور بالا سے عیاں ہے کہ جنگ کے وقت سراج الدولہ موجود نہ تھا اس لیے اسے براہ راست شوکت جنگ کی موت کا ذمے دار قرار نہیں دے سکتے۔ ایک اور بات قابل غور ہے کہ اگر اس کو شوکت جنگ کی ہلاکت منظور ہوتی تو

اس کی ہلاکت کا سہرا اپنے سر بندھوانے کے لیے کسی شخص اپنے آپ کو پیش کرکے انعام و اکرام حاصل کرتے لیکن کسی نے یہ دعوا نہ کیا اور آج تک یہ پتا نہ چلا کہ شوکت جنگ کی ہلاکت کا باعث کس کی گولی تھی۔ شوکت جنگ کے رویے سے بغاوت کا اعلان ہو رہا تھا وہ مقتضی تھا کہ اسے فوراً حکومت سے الگ کیا جائے اور ایک بہت بڑی سازش کا خاتمہ ہو۔ یہ فعل تو سراج الدولہ کی دوراندیشی اور جہاں بانی پر دلالت کرتا ہے۔

انگریزوں سے تصادم جعفر کی غدّاری کا دوسرا منظر

شوکت جنگ کے مارے جانے سے مرشد آباد کے غدّاروں یعنی میر جعفر، ولبھ رام، فتح جنگ، بھگت سیٹھ اور گھسیٹی بیگم کی سازش پر اوس پڑ گئی) اور انھوں نے انگریزوں سے ساز باز کرنے کا ارادہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اندرونِ ملک میں کسی حمایت کی توقع نہ تھی نہ انھیں امید تھی کہ خود ان کے ماتحت فوج سراج الدولہ کے خلاف تلوار اٹھائے گی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی رعایا کو کس قدر عزیز تھا۔

ان تمام مشکلات کا بانی اور سراج الدولہ اور کمپنی میں فساد برپا کرنے والا ڈریک جب کلکتے سے بھاگ کر مدراس پہنچا تو وہاں کلائیو موجود تھا جس کی مدح کے فریضے کو صاحب سیرپوں ادا کرتے ہیں:-

> "کلائیو نے فرانسیسیوں کو بارہا شکست دی تھی اور نواب سید محمد خاں صلابت جنگ کو کٹھ پتلی بنا لیا تھا۔ اس کی چار دانگ عالم میں دھاک بیٹھ گئی اور اسی وجہ سے اسے ثابت جنگ کا خطاب دیا گیا۔ کلائیو نے ایک

مجلس شورا منعقد کی اور کلکتے کی شکست کو زیرِ بحث لایا
متفقہ طور پر یہ قرار پایا کہ ثابت جنگ کرنل کلایو خود بنگالے
کو جائے اور ہر ممکن طریق سے جو اس کے ذہن میں آئے،
کارخانے کو ازسرِ نو قائم کرے اور پہلے کی طرح کمپنی کی
تجارت کو فروغ دے۔ چناں چہ کرنل کلایو چند جہاز
لے کر بنگالے کو روانہ ہوا جس قدر سپاہ موجود تھی اس کے
ہمراہ گئی اور انھوں نے دریا بھاگیرتی کے سمندر سے
اتصال کے موقع پر لنگر ڈالے لیکن چوں کہ انگریزوں کے
افسر بڑے دُور اندیش، کار آزما اور باریک بیں ہوتے
ہیں اس لیے کلایو نے یہ ضروری خیال کیا کہ سراج الدولہ
سے نامہ و پیام سے کام لیا جائے۔ چٹھی لکھی جس
کی عبارت یہ ہے: "مسٹر ڈریک نے جو غلطیاں کیں ان
کی معافی چاہتا ہوں اب چند لاکھ رُپے دیے جائیں تاکہ
کلکتے میں پہلی جیسی کوٹھی (کارخانہ) قائم کی جائے اس
طرح باہمی شکررنجی دُور ہو جائے گی اور تعلقات خوش گوار
ہو جائیں گے۔"

سراج الدولہ جیسا جاہل اور حواس باختہ حکومت کے نکات
سمجھنے سے قاصر تھا اور سب افسر نالائق تھے۔ یہ چٹھی موصول
ہونے پر اس نے معتبر افسروں کو مشورے کے لیے طلب کیا مگر
ان میں سے کسی نے بھی پیش کردہ شرائط پر صلح کرنے کا مشورہ نہ دیا
(یعنی یہ گوارا نہ کیا کہ انگریز کلکتے میں پھر سے قلعہ بندی کریں اور

لاکھوں روپے ان کی نذر کیے جائیں۔ کیسے نالایق افسر تھے کہ اپنی جان کا بھی خیال نہ کیا اور لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے اور ہزاروں روپے ضائع کیے جو کلایو انھیں دے سکتا تھا اور میر جعفر کی چنڈال چوکڑی سے جو ملتا وہ اس کے علاوہ۔ کاش صاحب سیر ہوتے اور فوراً اطاعت کا مشورہ دیتے۔ مولف) بنگالی صرف اتنا جانتے تھے کہ انگریز تاجر ہیں۔ سراج الدولہ اور اس کے مصاحبوں کو ذرا بھی علم نہ تھا کہ جنگ کے معاملات میں یہ قوم کیسی شجاع اور کیسے وسائل و قابلیت کی مالک ہے۔ جو معاملہ فہم تھے (یعنی میر جعفر اور اس کے لگے بندھے) بالکل خاموش رہے اگر وہ کچھ کہتے تو کون اعتبار کرتا کیوں کہ ان کے کرتوت طشت از بام ہو چکے تھے، اس کے علاوہ وہ سراج الدولہ کی حکومت سے بیزار تھے اور اس کے ظلم کے باعث مایوسی کی حد تک پہنچ چکے تھے (کون سا ظلم؟) اور وہ تہِ دل سے یہ چاہتے تھے کہ وہ کوئی ایسی مہم شروع کرے جس میں آپ سے آپ تباہ ہو جائے۔ اگر کوئی صلح کا نام لیتا تو اس کے منظورِ نظر سرِ دربار اس کا گلا دبا لیتے۔ کلایو کو بات بات کی اطلاع پہنچتی تھی جب اس نے دیکھا کہ دربار میں نفاق پیدا ہو گیا ہے اور امرا کے دل بدل گئے ہیں تو اس نے سراج الدولہ کے جواب کا انتظار بے سود خیال کیا۔ ایک دم حملے کی تیاری کی اور مانک چند کی قیام گاہ کے سامنے جہاز کھڑے کر دیے جہازوں سے گولہ باری شروع ہوئی تو مانک چند کی فوج میں بد دلی پھیل گئی اور وہ اِدھر اُدھر سر چھپانے لگے یہ دیکھ کر کلایو نے اپنی فوج اور توپ خانہ

ساحل پر اُتارا بے وقوف فوج دار یعنی دیوان مانک چند ہراساں ہو گیا اور اس ناقابلِ مقابلہ شجاعت و جاں بازی کی تاب نہ لا سکا اور اس نے بھاگ جانا ہی مناسب خیال کیا یہ دیکھ کر کلائیو نے کوٹھی اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ جب یہ خبر سراج الدولہ کو ملی تو وہ لڑائی پر تیار ہو گیا کیوں کہ اس کے دماغ میں تکبّر اور غرور تھا جہالت اس پر چھائی ہوئی تھی (اسے چاہیے تھا کہ منصور گنج کی چابیاں صاحب سیر کے ہاتھ کلائیو کے پاس بھیج دیتا۔ مؤلّف) آخر وہ انگریزوں کے مقابلے کے لیے کلکتے کو روانہ ہوا، خدا کی شان کہ پورینہ کی لڑائی کو بائیس دن ہوئے تھے کہ سراج الدولہ کی سزا کا وقت آ پہنچا (کس جرم کی علّت میں ؟) اور صاف نظر آنے لگا کہ اس کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ اس نے فوج جرار کو کیل کانٹے سے درست کر کے ہگلی نگر کی طرف کوچ کیا۔ کلکتے کے قریب پہنچ کر اس نے ایک مناسب جگہ پر ڈیرہ ڈالا اور وہاں سے کلکتے کو دوبارہ سر کرنے کی کارروائی شروع کی اور اس کے پہلو بہ پہلو صلح کی گفتگو بھی جاری رکھنے میں دریغ نہ کیا۔ کمپنی کے آدمی صلح کی جست جو سے زیادہ فوج اور کیمپ کا بھید لینے آئے تھے (کیوں کہ وہ صلح جو نہ تھے مکّار اور دغا باز نخے جاسوس تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی نے کھلی جنگ میں مقابلے کی سکت نہ دیکھی تو نواب کے کیمپ پر شب خون مارنے پر اُتر آئے جو لڑائی کی بدترین قسم ہے۔ مؤلّف) انھوں نے پچھلے پہر حملہ کیا جس کے لیے نواب کی فوج تیار نہ تھی توپ خانہ سرگرم ہوا کشتیوں سے گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی بے حد خوں ریزی ہوئی اور سراج الدولہ کا ایک نام ور سپہ سالار زخمی ہوا۔ یہ حملہ اس ارادے سے

کیا گیا تھا کہ نواب کی زندگی یا آزادی کا خاتمہ کیا جائے۔ اتفاق سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دے سکا اس لیے وہ سراج الدولہ کے کیمپ تک نہ پہنچ سکے اور وہ موت کے منھ سے بال بال بچ گیا۔ انگریزی فوج نہایت بہادری سے حملہ آور ہوئی ان کا ہر ایک اقدام مستقل تھا، فوج میں نظام قائم تھا اور ہر ایک حرکت بہت سوچ بچار کے بعد کی جاتی تھی انگریزوں کا ایک آدمی بھی کام نہ آیا اور وہ فتح کے شادیانے بجاتے قلعے کو لوٹ گئے۔ اس عجیب حملے سے سراج الدولہ اور اس کی بزدل اور غیر منظم فوج کے چھکے چھوٹ گئے اب دشمن کے نزدیک قیام رکھنا خطرناک خیال کیا گیا آخر مشورے کے بعد وہ کیمپ قلعے سے بہت فاصلے پر لے گئے لیکن اب انگریزوں نے طرز کلام بدلا کیوں کہ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ سراج الدولہ کے ملک میں غدار پیدا ہو گئے ہیں اور انھوں نے مطالبہ کیا کہ اخراجات جنگ ادا کیے جائیں جس کی تعداد کروڑوں تک پہنچی تھی۔ آخر بہت سی ملاقاتوں بہت سے نامہ و پیام کے بعد یہ تصفیہ ہوا کہ سراج الدولہ کمپنی کے نقصان کو نقد نہ دے کر پورا کریں۔ کلکتے کے نواح میں چھ پرگنے کمپنی کو دیے جائیں جس کی آمدنی سے نقصان پورا ہونے کے بعد وہ واپس کیے جائیں گے۔ ان شرائط پر معاہدہ مرتب ہوا اور جنگ ختم ہو گئی اس صلح کا سہرا مسٹر واٹسن کے سر رہا۔

اس صلح نامے کے بین السطور سے بہت سی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ سراج الدولہ نے انگریزوں سے منوا لیا کہ وہ قلعہ بندی نہ کریں گے

مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ ملک کو ایک غیر ضروری جنگ کی آگ میں جھونک دے۔ انگریز ایک امن پسند کی طرح رہنا چاہیں تو انھیں واجب مراعات دینے سے انکار نہ تھا۔ سراج الدولہ جیسے نوجوان سے اس متانت اور تحمل کا اظہار کرامات میں داخل ہونے کے قابل ہے۔ اس پر جو اسے ناعاقبت اندیش، غفلت پسند، آتش مزاج کہیں انھیں بتائیے کیا کہا جائے ؟

کرنل مالسن (G. B. MALLESON) کی تاریخ ہند میں یہ واقعہ اس رنگ میں سامنے آتا ہے: "کلکتے کے حادثے کے سلسلے میں چند جہازوں پر واٹسن کے زیر قیادت کلائیو کو کمک بھیجی گئی۔ ۱۱ دسمبر ۱۷۵۶ء کو اس فوج کے جہاز بنگالے کے نزدیک پہنچے۔ ۱۷ دسمبر کو واٹسن نے سراج الدولہ سے نقصانات کی تلافی کا مطالبہ کیا لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ واٹسن نے پھر لکھا کہ اب وہ قانون کو ہاتھ میں لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ۲۹ دسمبر کو واٹسن بج بج کے قلعے کے پاس لنگر انداز ہوا مقصد اس قلعے کو تسخیر کرنا تھا۔ تھکی ماندی فوج سونے کے لیے لیٹ گئی ادھر دیوان مانک چند فوجدار اسی صبح کو دو ہزار سپاہیوں اور پندرہ سو سواروں کے ساتھ بج بج کے قلعے میں پہنچ چکا تھا اس نے رات کو شب خون مارا اور انگریزی فوج کو پراگندہ کر دیا۔ یہ بڑی کڑی گھڑی تھی مگر کلائیو نے گرتی دیوار کو تھام لیا نقصان تو بہت ہوا۔ مگر اتفاق سے ایک گولی دیوان مانک چند کی پگڑی کو چھوتی ہوئی نکل گئی (غالباً اسے بدشگونی خیال کرکے) دیوان نے فوج کو واپسی کا حکم دیا رات کو

بج بج کا قلعہ فتح ہوگیا مگر وہ غیر آباد تھا۔ ۲؍جنوری ۱۷۵۷ء کو کلکتے کا قلعہ بھی تسخیر ہوگیا اور وہی ڈریک جو سراج الدولہ کے مقابلے سے بھاگ گیا تھا حاکم مقرر ہوا۔ اس کے تین دن بعد کلائیو نے قلعہ ہگلی پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس عرصے میں نواب سپاہیوں کی چالیس ہزار فوج لے کر آگیا۔ ۳؍فروری تک نواب کی فوج نے مرہٹہ خندق کے باہر باقاعدہ کیمپ لگا لیا کلائیو نے دو سفیر شرائط صلح طے کرنے کے لیے بھیجے مگر جب ان کی کسی نے بات نہ پوچھی تو کلائیو نے فوراً حملہ کرنے کا قصد کیا۔ ۴؍فروری کو صبح کاذب کے وقت کلائیو نے نواب کے کیمپ پر شب خون مارا اور کلائیو کی فوج کیمپ میں داخل ہوگئی اس سے کلائیو خود گھیرے میں آگیا۔ کہر کے باعث کچھ نہ سوجھتا تھا جب کہر کھلا تو کلائیو کو معلوم ہوا کہ نواب کے سوار پرا جمائے کھڑے ہیں دونوں جانب سے گولی چل رہی تھی کہ پھر کہر نے آگھیرا، کلائیو اور اس کی فوج پریشان ہوگئی اور اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں بھگدڑ نہ پڑ جائے مگر اس نے حوصلے سے کام لیا اور جب آٹھ بجے کے قریب کہر سے مطلع صاف ہوا اور اس نے اپنے آپ کو نواب کے کیمپ کے عین درمیان میں پایا تو حملہ کر کے نہ صرف اپنی فوج کو نرغے سے نکال لیا بلکہ نواب کو ایسا متاثر کیا کہ ۹؍فروری کو اس نے معاہدے پر دستخط کر دیے اور وعدہ کیا کہ وہ تمام مال واپس کر دے گا جو کلکتے کی تسخیر کے وقت ضبط کیا گیا تھا۔ سراج الدولہ پر کلائیو کا ایسا رعب بیٹھا کہ وہ اس کی ہر بات کو تسلیم کرنے کا خوگر ہوگیا۔ چناں چہ ۲۳؍مارچ کو کلائیو نے نواب کی منشا کے خلاف

فرانسیسیوں کی بستی چندر نگر پر قبضہ کر لیا۔ کلائیو کے اثر کا یہ بھی مظہر ہے کہ اس نے فرانسیسی جنرل لا کو کلائیو کے ایما پر بلا [illegible] سے علاحدہ کر دیا اور پلاسی میں جو فوج جمع کر رکھی تھی اسے واپس بلا لیا (یعنی نواب جہاں تک ممکن تھا لڑائی سے محترز رہا) مگر کلائیو کی تمام مساعی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بنگالے کی حکومت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا چاہتا تھا (نواب کے ساتھ وہ ریاکاری سے وہ کام لے رہا تھا اور اپنے رفقا کو جن میں کہ واٹسن جیسے دیانت دار اور شرفا شامل تھے نواب کے خلاف ابھارنے کی کوشش کرتا تھا)؛ اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ نواب پھر انتقام پر آمادہ نہ ہوگا۔ اس کا واحد علاج یہی تھا کہ کمپنی کو مستحکم اور طاقتور بنایا جائے اور یہ استحکام صرف اسی وقت ممکن تھا جب سراج الدولہ کا قدم بیچ میں نہ رہے"

کلائیو خوب جانتا تھا کہ کھلے بندوں نواب سے مقابلہ محال ہے۔ سپاہ داری کے لحاظ سے اس کا پلہ ہر پہلو سے بھاری ہے۔ اس لیے اس نے دربار مرشد آباد میں غدار پیدا کرنا اور ان کے ساتھ شامل ہو کر نواب کو تباہ کرنا اپنی مشکلات کا بہترین حل خیال کیا۔

غداروں کی مساعی

جب سراج الدولہ مرشد آباد کو واپس آیا تو اس نے صورتِ حالات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اسے بہ خوبی علم تھا کہ میر جعفر اور رائے راج رام اس کے خلاف سازش میں سرگرم حصہ لے رہے ہیں۔ اس کا مداوا

یہی تھا انھیں ایک دم عبرت ناک سزا دی جاتی مگر اس نے اسے مصلحت
کے خلاف سمجھا جب کہ انگریزوں کی شرارت کا ہر وقت خطرہ تھا اور کلائیو
سے کسی دیانت داری کی توقع نہ تھی میر جعفر نے ڈر کے مارے دربار جانا
ترک کر دیا تھا۔ راجا ولبھ رام کو صرف یہ جلن تھی کہ مہاراجا موہن لال
کو اس پر کیوں ترجیح دی گئی لیکن اس نے اپنے ماضی کا خیال نہ کیا جس
میں وہ بدترین سپہ سالار اور ناکام منتظم ثابت ہو چکا تھا اس کی بزدلی
اور نااہلی کی مثالیں اس سے قبل بیان ہو چکی ہیں۔ یہ بھی چند روز
سے تجربے سے ثابت ہو گیا کہ مہاراجا موہن لال کو وزیر منتخب کرنے
میں سراج الدولہ نے کس غائر نظر سے کام لیا تھا۔ موہن لال جیسا
سپہ سالار، کارداں، وفاشعار اور جاں نثار اہل کار ڈھونڈے
نہیں مل سکتا تھا جس نے قتل ہونا قبول کیا مگر مالک کی لاش تک
سے غدّاری گوارا نہ کی اور اس شمع پر پروانہ وار قربان ہو گیا۔ رہا
میر جعفر تو اس کی کچھ نہ پوچھیے دن رات افیون پینا، پینک میں پڑے
رہنا، رنڈیوں کی صحبت میں عمر بسر کرنی، رشوت غبن میں تامل نہ کرنا،
فرائض کی بجا آوری میں قاصر رہنا، میدانِ جنگ میں بزدلی کا
اظہار، انتظامِ ملک میں انتشار اس کے خصائل تھے جن کی مثالوں
سے سیر المتاخرین کے صفحات بھرے پڑے ہیں اور صاحب سیر کو
بھی رنج ہوتا ہے کہ سراج الدولہ نے کیوں اسے گردن زدنی قرار دے
کر سزا نہ دی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ علی وردی خاں کا تحمل بھی میر جعفر
کی نااہلیت کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے سرِ دربار اس کی بے عزتی
کی۔ سراج الدولہ کے تدبر سے یہ توقع تھی کہ میر مدن جیسے آزمودہ کار

کو میر جعفر جیسے بے اصولے افیونی پر ترجیح دیتا۔ میر مدن نے بھی اپنے مالک پر جاں نثار کی اور آخری سانس تک اس کی خدمت کا دم بھرتا رہا۔ آخر آہستہ آہستہ غداری کے چہرے سے نقاب اُٹھ گیا اور میر جعفر، ولب رام، راجا سروپ چند، رائے رایاں مہتاب رائے، جگت سیٹھ اور گھسیٹی بیگم کی نسبت ساری دنیا کو معلوم ہو گیا کہ یہ سب احسان فراموش سراج الدولہ کی جان کے لاگو ہو رہے ہیں مگر بہ قول صاحب سیر ان میں اتنی ہمت اور دل گردہ نہ تھا کہ وہ سراج الدولہ کے خلاف بغاوت کر سکیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ رعایا نواب کے ساتھ تھی اور اس کے امرا اس پر جان چھڑکتے تھے کیوں کہ ان میں سے کسی نے غداروں کی حمایت نہ کی۔ گھسیٹی بیگم کے رونے بین کرنے اور ٹسوے بہانے سے غداروں نے اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہا۔ اسی کے بل بوتے پر میر جعفر نے خفیہ طور پر ایک فوج جمع کر لی مگر آخر کار قرعۂ فال کلائیو پر پڑا اور قرار پایا کہ اس کی شرکت کے بغیر یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ جگت سیٹھ اس تجویز کا بہت بڑا حامی تھا اور وہی اسے کام یاب کرنے کے وسائل رکھتا تھا۔ اس وقت کلکتے میں ایک پنجابی مہاجن امی چند جگت سیٹھ کا گماشتہ تھا اور کلائیو کے پاس اس کی آمد و رفت تھی اس نے جگت سیٹھ کے ایما پر کلائیو کو سراج الدولہ کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ ولب رام نے اس کام کے لیے اپنا معتبر آدمی مامور کیا اور میر جعفر نے میرزا امیر بیگ کو روانہ کیا جس کی انگریزوں کے ساتھ مدت سے راہ و رسم تھی۔ ان سب نے کلائیو کو یقین دلایا کہ سارا مرشد آباد سراج الدولہ کے مظالم

سے تنگ آکر اس کی جان لینے کے درپے ہو بلکہ ان اشخاص نے ان سب کی تحریر دکھائی جس میں انھوں نے نواب کے خلاف عہد کیا تھا۔ کلائیو تو خدا سے چاہتا تھا کہ ایسا ہو۔ اس نے جواب دیا کہ پہلے آپ سراج الدولہ کی مخالفت کو عملی جامہ پہنائیے اس سے لڑائی چھیڑیں پھر ہم سنبھال لیں گے۔ آپ کی چھوٹی سی حرکت سے ہم اس کے استیصال میں حق بہ جانب ہو جائیں گے۔ میر جعفر نے کلائیو کو حسن خدمت کے صلے میں تین کروڑ روپے دینے کا وعدہ کیا جس کی ضمانت جگت سیٹھ نے دی (یہاں پہنچ کر صاحب سیر کو انگریزوں کی مدح یاد آتی ہے اور کہتے ہیں) یہ قوم جس کی طاقت بہادری اور حوصلہ لاجواب ہے مگر بے حد حریص واقع ہوئی ہے۔" اس بارے میں ڈریک نے مجلسِ شوریٰ منعقد کی جس نے یہ تجویز کی کہ میر جعفر اور دلب رام کی دعوت قبول ہو اور سراج الدولہ پر فوج کشی کی جائے اور اس کے جواز کے لیے یہ بہانہ تراشا گیا کہ کلکتے کے نقصان کی تلافی حسب معاہدہ نہیں کی گئی۔ ایک کروڑ روپیہ فوراً ادا کیا جائے۔

میلسن[۵۱] کہتے ہیں کہ جب کلائیو نے سراج الدولہ کو جڑ اور بنیاد کے اکھیڑ دینے کی ٹھانی اور غداروں اور منافقوں کی جستجو میں پڑ گیا تو سب سے پہلے یار لطف خاں نے جو مرشد آباد کا سر برآوردہ امیر اور فوج کا سردار تھا واٹس کے ذریعے اتحاد کی پیش کش اس شرط پر کی کہ سراج الدولہ کے بعد اسے صوبے دار بنایا جائے۔ اس کے بعد میر جعفر کا پیغام آیا جس کے ساتھ دلب رام شامل تھا

---

۵۱ MALLESUN LARD CHIAE P 86

اور اسے کلائیو نے منظور کیا۔ اب سازش کی تفصیلات طے ہونے لگیں تو ایک ایسی بات درمیان میں آگئی جس کے کلنگ کا ٹیکہ کلائیو کے ماتھے پر ہے۔ معاہدین کے درمیان بات چیت امی چند مہاجن کے ذریعے ہو رہی تھی جو اپنی دولت، وضع قطع، مکاری چالاکی اور بے اصولے پن کے لیے مشہور تھا۔ جب سازش پورے زور پر آگئی تو اس شخص نے جو سراج الدولہ سے منافقت کر رہا تھا واٹس کے ذریعے اطلاع دی کہ معاہدے میں اگر بیس لاکھ روپے میرے لیے مقرر نہ کیے گئے تو وہ تمام حالات صوبے دار پر منکشف کر دے گا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو سازشیوں کی جان کی خیر نہ تھی۔ ایسے مکار کو دھوکا دینے کی غرض سے کلائیو نے دو معاہدے تیار کرائے جن میں سے ایک میں امی چند کا ذکر نہ تھا مگر دوسرے میں اسے بیس لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ امی چند کو جھوٹا معاہدہ دکھا کر اس کا منھ بند کیا گیا۔ امیر البحر واٹسن نے اس حرکت کو از بس ناپسند کیا اور جب اس نے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کیا تو کلائیو نے اس کے جعلی دستخط بنا لیے۔

غداروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ نواب کو جنگ جوئی پر آمادہ کریں۔ انھوں نے یہ فرض ادا کرنے کے لیے دربار میں آنا جانا شروع کر دیا۔ حلف وفاداری اٹھانے اور لڑائی میں حق نمک ادا کرنے کے وعدے کیے لیکن سراج الدولہ نے ٹالنے کی کوشش کی۔ وہ غداروں کی طرف سے کچھ بدظن سا ہو گیا مگر اس نے فرانسیسیوں، مرہٹوں اور دلی دربار سے خط و کتابت جاری رکھی تاکہ انگریزوں

کی دست برد سے ملک کو نجات دینے میں وہ اس کا ہاتھ بٹائیں۔ اب سراج الدولہ نے پلاسی کی جانب فوج کو چلنے کا حکم دیا۔

کلائیو نے میر جعفر کے بھروسے پر یہ جنگ شروع کی تھی مگر اسے راستے ہی میں میر جعفر کا ایک خط ملا جس کی عبارت یہ تھی کہ "میں نے بناوٹ سے صوبے دار سے صلح صفائی کر لی ہے اور انگریزوں کے خلاف لڑنے کا حلف لیا ہے لیکن جو معاہدہ میں نے انگریزوں سے کیا ہے اس پر پورا عمل کروں گا۔" یہ خط پڑھ کر کلائیو حیران رہ گیا اور اسے یہ خدشہ دامن گیر ہوا کہ مبادا میر جعفر اس کے ساتھ بھی غداری کرے۔ اپنے مقام سے ۱۵۰ میل کے فاصلے پر دریا عبور کر کے ایک عظیم الشان فوج سے مقابلہ کرنا بلاشبہ ایک خوفناک مہم تھی۔ اگر میر جعفر اس سے بھی ایسی ہی غداری کرے جو اس نے اپنے مالک سے کی ہے تو انگریزوں کی شکست میں کوئی شک نہیں رہتا اس لیے اس نے کوچ بند کیا اور مزید اطلاعات کا انتظار کرنے لگا۔ دوسرے دن (۲۰ تاریخ) کو واٹسن کی رپورٹ آئی کہ مرشد آباد سے آنے سے پہلے وہ میر جعفر اور اس کے بیٹے سے ملا۔ جب صوبے دار کے چند آدمی آ گئے تو ان کے سامنے میر جعفر نے کہا کہ واٹسن جاسوس ہے اور اگر انگریزوں نے بھاگیرتی کو عبور کیا تو وہ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔" کلائیو مذبذب سا ہو گیا اور اس نے جنگی کمیٹی کے روبرو معاملہ پیش کیا اور اس بات کا تصفیہ چاہا کہ آیا ان حالات میں حملہ کرنا مناسب ہے یا نہیں۔

ایک میجر کونٹ نے کے سوا سب نے کلائیو کی تائید کی کہ سردست لڑائی ملتوی ہونی چاہیے ۔ کلائیو نے بعد میں کہا کہ اگر اس وقت لڑائی التوا میں پڑ جاتی تو ہندوستان میں کمپنی کا نام نشان تک باقی نہ رہتا ۔ یہ بالکل درست ہے کیونکہ وقفہ ملنے پر سراج الدولہ غداروں کا قلع قمع کر دیتا اور انگریزوں کے پاؤں اس کے سامنے نہ جم سکتے) کلائیو امید و بیم کا شکار ہو رہا تھا کہ میر جعفر کا ایک اور خط آ گیا جس میں اس نے اپنی وطن فروشی کا یقین دلایا ۔ کلائیو پھر حملہ کرنے پر تیار ہو گیا ۔

پلاسی کی جنگ ۔ ہندوستان کی غلامی کا آغاز

اس ناقابل فراموش جنگ کے متعلق

طباطبائی کہتا ہے (سیر المتاخرین جلد ۲ صفحہ ۲۳۰) ۔ جب کلائیو کی آمد کی خبر پہنچی تو نواب نے اپنی فوج کا تھوڑا سا حصہ راجا ولب رام کی کمان میں پلاسی روانہ کیا اور حکم دیا کہ ایک کیمپ بنایا جائے جس کے گرد خندق ہو ۔ ولب رام گیا مگر ظاہرہ تو تعمیل حکم کرتا رہا در اصل کوئی خندق تیار نہ کرائی وہ انگریزوں سے سازش کر چکا تھا بلکہ میر جعفر کے معاہدے میں بھی شریک تھا اور فوج میں نواب کے خلاف جوڑ توڑ کر رہا تھا میر جعفر نے ادھر نواب کو دھوکا دینے کے لیے دربار میں حاضر ہونا شروع کیا تھا ۔ آخر بادل ناخواستہ نواب بھی منصور گنج کی طرف ہانپتا کانپتا روانہ ہوا ۔ اب اس کے ہم رکاب وہ فوجیں تھیں جن پر اسے پورا اعتماد تھا جن کی کمان میر مدن اور مہاراجا موہن لال اور چند ایک اور سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھی ۔ وہ پلاسی پہنچا تو دوسری طرف کلائیو انگریزوں کے ساتھ جن کی تعداد تین ہزار تھی ،

پڑا جائے کھڑا تھا۔ جمعرات کا دن اور ۵ شوال ۱۱۷۰ھ تاریخ تھی۔ جب خوں ریزی اور قتلِ عام کی آگ بھڑکی لیکن چوں کہ فرنگی آتش بازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اس لیے انھوں نے ایسی شدید گولہ باری کی کہ سب دنگ رہ گئے۔ اس تمام عرصے میں میر جعفر جو اس تمام تباہی کا باعث تھا ٹس سے مس نہ ہوا اور اپنی فوج کے ساتھ ایک طرف میدانِ جنگ سے کچھ فاصلے پر سے لڑائی کا تماشا دیکھتا رہا۔ وہ صرف سراج الدولہ کے خاتمے کا خواہاں تھا لیکن میر مدن اور چند اور افسروں کی حالت اس کے برعکس تھی وہ ہمہ تن جنگ فتح کرنے کی کوشش میں تھے اور جعفر کے سکوت کو تعجب کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے گولیوں کی بوچھاڑ جاری تھی مگر میر مدن اور موہن لال آہستہ آہستہ بڑھتے آموں کے جھنڈ کے پاس پہنچ گئے جہاں انگریزی توپ خانہ برسرِ کار تھا یہ ۳ بجے شام کا وقت تھا۔ نقشہ جنگ دیکھ کر کلائیو آپے سے باہر ہو گیا اور میر جعفر کے نمائندے پر برس پڑا اور کہا "تمھارے آقا نے تو کہا تھا کہ فوج اور سپہ سالار سب سراج الدولہ سے بگڑ گئے ہیں اور لڑائی شروع ہوتے ہی اس کا کام تمام کر دیں گے مجھے تو سب کچھ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔" نمائندے نے جواب دیا کہ جو فوجیں حملہ کر رہی ہیں یہ نواب کی وفادار ہیں اور جوں ہی انھیں شکست ملتی ہے، میر جعفر اپنی رفاقت کا ثبوت دے گا۔ بدقسمتی سے میر مدن جیسے وفاشعار اور قابلِ قدر کمانڈر کے توپ کا ایک گولہ عین اس وقت جب وہ اور اس کی بہادر فوج انگریزوں کے سر پر پہنچ چکی تھی، لگا جس سے اس کی ایک ٹانگ اڑ گئی اور بہ ظاہر

ایسا معلوم ہوا کہ اس کی زندگی ختم ہو چکی۔ دہم واپس تھا جب اسے سراج الدولہ کے پاس لے گئے۔ میر مدن نے اس حالت میں دعائیں دیں، آداب بجالایا اور چل بسا۔ نواب کو اس کا بہت صدمہ ہوا وہ پریشان ہو گیا بلکہ اس کے اوسان جاتے رہے اس نے میر جعفر کو بلایا اور اسے بہت مشکل سے حاضر کیا گیا جب وہ آیا تو اس کے ساتھ اس کا بیٹا میرن، خادم حسین اور مسلح دستہ سپاہیوں کا تھا سراج الدولہ نے اسے نہایت لجاجت اور عجز بلکہ بعض تو یہ افواہ تک بیان کرتے ہیں کہ پگڑی اس کے پانو پر رکھ کر کہا کہ "جو کچھ میں نے کیا اس کا افسوس ہے آپ میرے رشتے دار ہیں علی وردی خاں نے آپ پر بے انتہا نوازشیں کی ہیں اور مجھے امید ہے کہ میری غلطیاں کو معاف کر کے ایسا طرز عمل اختیار کریں گے جو ایک سید کو زیب دیتا ہے میں اپنے آپ کو آپ کے سپرد کرتا ہوں میری عزت اور زندگی آپ کے ہاتھ ہے[۱] میر جعفر جو اپنے نواب بننے کا خواب دیکھ رہا تھا اس سے متاثر ہوا اور جواب دیا کہ سورج غروب ہو رہا ہے اب حملے کا وقت نہیں رہا اب فوجیں واپس بلالیں صبح کو انشاء اللہ میں جنگ شروع کر دوں گا۔ سراج الدولہ نے کہا اگر دشمن نے رات کو شب خون مارا؟ میر جعفر نے کہا اس کی فکر نہ کیجیے میں ذمے دار ہوں۔ اس وقت موہن لال دشمن سے گھمسان کی جنگ کر رہا تھا اس کا توپ خانہ قہر کی گولہ باری کر رہا تھا۔ سپاہیوں کی گولیوں کی

---

۱ ایسی تقریر نہ کوئی مجذوب کر سکتا ہے نہ حاکم (نوٹ ٹا مانس)

نوٹ ۱۲۲ جلد دوم ص ۲۳۲ —

بارش ہو رہی تھی عین اس وقت اسے جنگ بند کر کے لوٹ آنے کا حکم ملا اس نے جواب دیا کہ یہ وقت واپسی کا نہیں۔ جنگ اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ جو ہونا ہے ابھی ہو جائے گا اور اگر اس نے واپسی کا قدم اٹھایا تو بھگدڑ مچ جائے گی۔ نواب نے میر جعفر سے پوچھا تو اس نے کہا۔ "میں نے صحیح مشورہ دیا ہے آگے جو حضور کی مرضی"۔ سراج الدولہ اس ہراسانی اور میر جعفر کی طرف سے مایوس ہو کر موہن لال کو حکم پر حکم بھیجنے لگا کہ وہ واپس آجائے۔ آخر مجبور ہو کر موہن لال نے حکم کی تعمیل کی موہن لال کی پسپائی کا اس کی فوج پر بہت برا اثر پڑا جہاں جس کے سینگ سمائے نکل گیا اور کیمپ بالکل خالی ہو گیا۔ نواب نے یہ منظر تو حیران رہ گیا اسے نہ صرف انگریزوں کا ڈر تھا بلکہ وہ غداروں سے بھی خوف زدہ تھا اس لیے اس نے بھی راہ فرار اختیار کی اس نے راتوں رات سفر کیا اور صبح آٹھ بجے اپنے محل میں پہنچ گیا کوئی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھا یہاں تک کہ خود اس کے خسر ایرج خاں نے روگردانی کی۔ سراج الدولہ نے خزانے کھول دیئے اور جس نے جو مانگا اسے دے دیا۔

نواب کی ہجرت لاکھوں روپیہ بانٹ دیئے جب تمام دن کوئی اس کے پاس نہ آیا تو آدھی رات کے وقت اس نے اپنی بیگم لطیف النساء بیگم کو مع چند اور عورتوں کے رتھوں میں سوار کیا اور جس قدر زر و جواہر ہاتھ لے جا سکتے تھے ہمراہ لیے اور تین بجے کے قریب محل سے روانہ ہوا یہ شوال کی ساتویں

تھی۔ وہ راستہ بھول گیا اور بجائے راج محل کی طرف جانے کے وہ بھگوان گولا کی طرف نکل گیا جہاں سے وہ کشتیوں میں سوار ہوئے اگر وہ خشکی کا راستہ اختیار کرتا تو اسے بے حد امداد پہنچ سکتی تھی بیسوں سردار اور ہزاروں سپاہی حاضر ہو جاتے۔

میر جعفر نے دیکھا کہ سراج الدولہ کے میدان سے ہٹ جانے سے ہوا اس کے موافق چل رہی ہے۔ وہ ایک دن پلاسی ٹھیرا اور کلائیو وغیرہ سے ملاقات کی، معاہدوں کی تجدید ہوئی۔ پھر انگریزی فوج ساتھ لے کر مرشد آباد پہنچا شہر میں داخل ہو کر منصور گنج میں قیام کیا اور اپنی صوبے داری کا اعلان کیا۔ یہ سن کر دونوں غدّار ولب رام اور جگت سیٹھ مع اپنے رفقا کے اور دیگر ابن الوقت مبارک باد دینے کو دوڑے دوڑے آئے۔ ان کے علاوہ وہ بھی دل پر ہاتھ رکھ کر حاضر ہوئے جن کے دلوں میں ہنوز سراج الدولہ بس رہا تھا جنھیں یہ انقلاب ناگوار تھا مگر اپنی جان بچانے کے لیے بادلِ ناخواستہ حاضر ہونے پر مجبور تھے۔ جعفر نے راجا دلب رام کو وزارت کا خلعت دیا اور خود اس کوشش میں مصروف ہوا کہ لوگوں کے دلوں سے سراج الدولہ کی جدائی کا داغ دور کرے لیکن خزانوں پر قبضہ کرنے کے لیے بھی بے قرار تھا تاکہ اسے انگریزوں کے ساتھ بانٹ لے اور عہد نامے کی شرائط پوری ہو جائیں۔

اسے علی وردی خاں کا خطاب مہابت جنگ بہت پسند تھا اس لیے اس نے شجاع الملک حسام الدولہ میر جعفر علی خاں مہابت جنگ کی مہر کندہ کرائی۔ اپنے بیٹے میرن کو شہامت جنگ کا خطاب

دیا جو پہلے نوازش محمد خاں کا خطاب تھا اور اپنے بھائی میر محمد کاظم خاں کو ہیبت جنگ کا خطاب دیا جو نواب زین الدین خاں کا خطاب تھا۔ تمام ملازموں کی بحالی کے پروانے جاری کیے۔ اس سے پہلے اس نے اپنے داماد میر محمد قاسم خاں کو سراج الدولہ کو گرفتار کرنے کے لیے بھیج دیا تھا۔

سراج الدولہ کی گرفتاری

سفر ور نواب پریشان حالی میں راج محل کے دوسرے کنارے پر پہنچا اور ایک گھنٹے کے لیے وہاں قیام کیا تاکہ تھوڑی سی کھچڑی پکالی جائے کیوں کہ تین دن سے کسی کے منھ میں کھیل تک اُڑ کر نہ گئی تھی۔ وہاں ایک فقیر رہتا تھا اس نے انعام کے لالچ میں ایک آدمی روانہ کیا جو دشمنوں کو اس کی خبر دے۔ میر قاسم اور میر داد دونوں فوراً پہنچ گئے اور نواب، اس کے کنبے اور اسباب کو حراست میں لے لیا۔ نواب نے بہت منت سماجت کی مگر کچھ نہ بنا اس نے کہا کہ اسے تھوڑا گزارا اور تھوڑی زمین دلوادو مگر کسی نے پروا نہ کی۔ میر قاسم نے لطیف النسا بیگم کے بدن سے لاکھوں رُپے کے زیورات اُتار لیے۔ میر داد نے دیگر خواتین پر ہاتھ صاف کیا اور جو جس کے ہاتھ پڑا، لے اُڑا اور یہ لُٹا ہوا قافلہ پابہ زنجیر مُرشد آباد کو روانہ ہوا۔

مہاراجا موہن لال

اس عرصے میں وفادار مہاراجا موہن لال گرفتار ہوا۔ اس نے میر جعفر کی اطاعت سے صاف انکار کیا اسے راجا ولب رام کی حراست میں دیا گیا راجا موہن لال کے کُل بیش بہا مال و منال پر قبضہ کیا اور راجا موہن لال کو جان

سے مار ڈالا۔ روایت یہ ہے کہ میر جعفر نے اسے گرز برداروں سے ہلاک کروایا اور بعض یہ کہتے ہیں کہ راجا ولبھ رام نے اسے زہر دے کر مارا۔ (نوٹامانس)

سراج الدولہ کی شہادت

خدا کی شان نواب خود اپنے نوکروں کا قیدی بن گیا اور اس حالت میں اسے مرشد آباد لائے (یعنی یہاں سے جانے کے پورے آٹھ دن بعد ۱۵ رشوال ۱۱۷۰ھ) وہ ابھی بُری حالت میں تھا کہ جس نے اس کی یہ گت دیکھی کانپ اٹھا اور سب اس کا جاہ وحشم یاد کر کے سر پیٹنے لگے اور ان کے دلی جذبات ترحم اور ہمدردی سے معمور ہو گئے اور اس کی بدمزاجی اور بے رحمی کو بھول گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب اسے چند فوجی سپاہیوں کے ڈیرے کے سامنے لے گئے تو وہ اس دل خراش منظر کو برداشت نہ کر سکے اور سراج الدولہ کو بچانے پر کمربستہ ہو گئے نگران افسروں نے انھیں باتوں میں لگا کر باز رکھا۔

یہ بیان ہو چکا ہے کہ میر جعفر نے منصور گنج محل پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کے مکان میں میرن آباد ہوا تھا، میرن میر جعفر کا بیٹا شاہ خانم کے بطن سے تھا جو علی وردی خاں کی ہمشیرہ تھی[1]۔ یہ میرن باپ کا ہم پلّہ نہ تھا بلکہ ہر بات میں اس سے دو قدم آگے تھا ظلم وجفا

---

[1] ترجمے میں یہ مبہم لفظ (HALF SIRTER) استعمال کیا ہے جس کے بہت سے معنی ہیں جو دایہ، بوڑھی، ماما سے لے کر اس کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کسی عورت اور مرد کی ماں ایک ہو اور باپ دو ہوں مگر ایسا کوئی بیان نہیں کرتا اس لیے شاہ خانم علی وردی خاں کی بہن قطعاً نہیں ممکن ہے ماما زاد ہو تو ہو۔ مولّف

اس کی فطرت ثانی میں داخل تھے لوگوں کی جان لینا، قتل و غارت گری ہر فعلِ زبوں کو قابلِ فخر خیال کرنا اس کا شعار تھا اس کے عندیے میں رحم و انصاف صرف معاملے کو بگاڑ دیتے ہیں اور کسی مصرف کے نہیں۔ ایسے جذبات اس کی نگاہ میں قابلِ نفرت تھے باوصف ان باتوں کے وہ اپنے آپ کو بہت فہمیدہ، مدبر اور علی وردی خان ثانی خیال کرتا تھا۔

جب سراج الدولہ پہنچا میر جعفر اس وقت سوتا تھا اس لیے وہ میرن کے ہاتھ پڑا اس نے اسے اپنے کمرے کے نزدیک بند کیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے فوراً شہید کر دیں مگر ایک آدمی بھی خونِ ناحق کرنے پر رضامند نہ ہوا اور سب نے صاف انکار کر دیا بلکہ اس خیال پر نفرین کہی آخر بڑی جدوجہد کے بعد ایک شخص محمدی بیگ نے یہ لعنتی فعل گوارا کیا جسے کسی نے پسند نہ کیا یہ شخص نواب زین الدین احمد والد نواب سراج الدولہ اور علی وردی خان کا نمک پروردہ تھا اور اس کی شادی خود علی وردی خان کی بیگم اشرف النسا بیگم نے کی تھی۔ اس شخص نے یہ لعنت کا طوق اپنے گلے میں ڈالنا پسند کیا اور سراج الدولہ کے پہنچنے کے دو تین گھنٹے بعد یہ جلاد اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگانے چلا۔ سراج الدولہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا کہ کیا وہ اسے ہلاک کرنے آیا ہے اس نے اثبات میں جواب دیا۔ نواب نے خدا کے سامنے سر جھکایا، اپنے گناہوں کی معافی چاہی اور پھر قاتل سے کچھ کہنا شروع کیا ہی تھا کہ اس نے متواتر ضربات لگانی شروع کیں۔ چند ضربات

اس کے خوب صورت چہرے پر پڑیں جو حسن و جمال کے باعث بنگالے میں ضرب المثل تھا نواب مجروح ہو کر سر کے بل زمین پر گر پڑا اور اس کی پاک روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون ۔

بیٹے کی لاش ماں کی گود میں

سراج الدولہ کو بے شمار ضربات لگائی گئیں اور اس تقدس مآب لاش کو ایک ہاتھی پر ڈال کر شہر میں پھرایا گیا جس سے نئے صوبے دار کے جاہ و جلال کا اظہار مطلوب تھا چلتے چلتے ہاتھی اس مقام پر پہنچتا ہی جہاں مقتول کی والدہ امینہ بیگم دُنیا و مافیہا سے بے خبر رہتی تھی (معلوم ہوتا ہی کہ وہ عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتی اور دُنیاوی امور کی خبر اس کے کانوں تک نہ پہنچتی تھی) اسے اس انقلاب کا جو بنگالے میں آیا ذرہ بھر علم نہ تھا ۔ لاش کے ساتھ لوگوں کی آہ و زاری نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا، بالکل محرم کا نمونہ تھا یہ شور و غل سن کر امینہ بیگم خواب غفلت سے بیدار ہوئی اور دریافت کرنے پر جب اس سانحہ جاں گداز کا علم ہوا تو بیگم پردے اور تہذیب کو بھول گئی ننگے پاؤں ننگے سر محل سے باہر نکل آئی ماں تا کے وفور میں لاش سے لپٹ کر اسے بوسے دینے لگی اور وقف ماتم ہو گئی ۔ لوگ یہ کربلا کا نقشہ دیکھ کر اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اگر جعفر کا مصاحب خادم حسین مداخلت نہ کرتا تو یقین ہی کہ انقلاب کے اندر انقلاب ہو جاتا ۔ خادم حسین نے جب دیکھا لوگ اس منظر سے متاثر ہو کر شورش پر آمادہ ہیں تو اس نے چند آدمی

بھیج دیے جنھوں نے ہجوم کو مار مار کر پراگندہ کر دیا اور بیگم کو دھکیل کر محل میں بند کر دیا۔ صاحب سیر لکھتے ہیں کہ بیگم کو بھی زدوکوب کیا گیا اور اس کے ساتھ نہایت غیر مہذبانہ برتاؤ کیا گیا۔ مگر اسے ہوش نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ دیگر مخدرات جنھوں نے اس کی رفاقت کی اس وحشیانہ طرزِ عمل سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ انّیس سالہ مجسمہ جمال و جوانی کی لاش اور بوڑھی ماں کے سامنے قیامت ہے۔ بڑے دل گُردے کا انسان بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا۔

صاحب سیر سراج الدولہ کی شہادت کی ذمّہ داری میرن کے سر اس لیے منڈھ رہے ہیں تاکہ میر جعفر کے سر یہ خون نہ چڑھے۔ اس سے انھیں جعفر کی حمایت منظور نہ تھی بلکہ اصل میں کلائیو کو اس بدنامی سے بچانا تھا اس بارے میں فرماتے ہیں۔

(جلد دوم صفحہ ۲۴۴)

"جب سراج الدولہ کو مُرشد آباد لایا گیا تو جعفر گہری نیند سو رہا تھا اس نے کثرت سے بھنگ پی تھی اور کوئی اسے بیدار نہ کر سکتا تھا اسے جاگنے کے بعد بھی بڑی دیر کے بعد بتایا گیا"

کرنل میلسن کا بیان یہ ہے:۔ ^ل۱^

"سراج الدولہ اسی رات کو پلاسی سے مُرشد آباد پہنچ گیا صبح کو اسے اطلاع ملی کہ اس کی تمام فوج پراگندہ ہو چکی ہے۔ وہ شام تک اپنے محل میں رہا اور پھر اپنی بیگم کو ہمراہ لے کر ایک کشتی میں سوار ہو کر لالہ تک پہنچنے

ل۱ LORD CLIVE BY MALLESON P 78

کے لیے روانہ ہوا جو بھاگل پور کی طرف سے آرہا تھا۔
لیکن راج محل پہنچ کر اس کے ملاح تھکاوٹ کے باعث
چپّو چلانے سے معذور ہو گئے اور نواب نے ایک
اُجڑے باغ میں رات بسر کی۔ صبح کو وہ گرفتار ہوا اور
اسے میر جعفر کے سامنے حاضر کیا گیا سراج الدولہ نے
جان بخشی چاہی جس سے جعفر نے انکار کیا اور اسی رات
کو وہ قید خانے کے ایک حجرے میں شہید کیا گیا۔"

اس بیان کے مطابق میر جعفر ہی قتل کا ذمہ دار ہے۔ میرن کو گنہ گار ٹھرانا محض مصلحت کوشی ہے۔ بیجر باسو اپنے سیر حاصل انداز میں یوں رقم طراز ہیں :-

جنگ پلاسی

واٹس کو جرأت نہ ہوئی کہ کھلے بندوں میر جعفر کے محل میں شرائط سازش طے کرنے جاتا اس لیے وہ عورتوں کی طرح پردہ پالکی میں سوار ہو کر گیا اور معاہدے پر دستخط کرائے۔ نواب کو انگریز دھوکے پر دھوکا دیتے چلے گئے۔ اسے اس قدر اطمینان ہو گیا کہ اس نے اپنی آدھی فوج کم کر دی۔ آخر وقت آگیا کہ انگریزوں کو در پردہ کام کرنے کی ضرورت نہ رہی لیکن واٹس اور چند اور انگریز ابھی مرشد آباد میں تھے اور جب تک وہ وہاں تھے انگریز اپنے مکارانہ ارادوں کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ ۱۲ جون کی شام کو یہ اشخاص شکار کھیلنے کی اجازت حاصل کر کے مرشد آباد سے باہر گئے دوسرے دن نواب کو بھاگ جانے کی اطلاع ملی تب اسے انگریزوں کے فریب و دغا میں کوئی شک نہ رہا اور

اس نے کلائیو کے نام حسب ذیل پروانہ لکھا:-

"جو قول و قرار ہمارے درمیان ہوئے تھے ان کے مطابق میں نے واٹس کی تسکین کرادی اور مانک چند کا تنازعہ بھی ختم کردیا مگر باوصف اس کے واٹس اور اس کے دیگر رفقا ہوا خوری کا بہانہ کرکے بھاگ گئے - یہ صاف دغابازی ہے اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کا ارادہ معاہدہ فسخ کرنے کا ہے مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ آپ کے علم سے ہوا بلکہ محض آپ کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے ہمیشہ ایسا ہونے کی توقع رہی اور دغابازی ہی کے خیال سے میں نے پلاسی سے فوج واپس طلب نہ کی۔ معاہدہ شکنی میری طرف سے نہیں ہوئی - خدا اور رسول ہمارے معاہدے کے گواہ تھے اور جو اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ سزا اور عذاب کا مستوجب ہوگا۔"

بہ ایں ہمہ سراج الدولہ کو سازش کی نوعیت اور وسعت کا علم نہ تھا۔ اس نے بہ حیثیت ایک ایمان دار لیکن ناتجربہ کار نوجوان کے ان اشخاص سے امداد کی توقع کی جو سب سے بڑے سازشی تھے۔ علی وردی خاں کا قاعدہ تھا کہ وہ جب کسی امیر سے بدظن ہوتا تو اسے حلف دے کر فرماں بردار رہنے کا اقرار کراتا سراج الدولہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ خود میر جعفر کے مکان پر گیا اسے صلح صفائی کی دعوت دی اور میر جعفر نے قرآن اٹھا کر حلف وفاداری لیا۔ مگر پھر اسی میر جعفر نے کلائیو کو پلاسی پر حملہ کرنے کا ایما کیا اور کہا کہ

وہاں سب کچھ موجود ہوگا۔ چناں چہ اوِیس (iVAS) لکھتا ہے کہ :۔

" ۱۲ جون کو میر جعفر اور دیگر غداروں نے اطلاع دی کہ وہ سب کام درست کرچکے ہیں۔ قرعہ ٹھیک پڑے گا اور ۱۳ جون کو تمام فوج نے کوچ کیا ۔۔۔۔" اسی دن کلائیو نے نواب کو ایک چٹھی لکھی جس میں نواب پہ معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام لگایا اور اس پر یہ ستم زاد کیا کہ کیا وہ تیار ہے کہ معاملہ ثالثوں کے سپرد کیا جائے اور نواب ہی کے اہلِ دربار میر جعفر راجا دلبھ رام، جگت سیٹھ وغیرہ ثالث مقرر کیے جائیں اور وہ طے کریں کہ کرنل نے یا نواب نے معاہدے سے انحراف کیا ہے؟ چوں کہ جواب میں بہت دن لگ جائیں گے اس لیے وہ خود جلد حاضر ہو رہا ہے تاکہ اس جھگڑے کا جلد فیصلہ ہو جائے۔"

پھر وہ پلاسی کو روانہ ہوا جہاں ۲۳ جون کو وہ جنگ ہوئی جو انگریزوں کے لیے بھی کچھ قابلِ فخر نہیں ہو سکتی نہ کلائیو سا جعل ساز اس پر ناز کرسکتا ہے۔ نواب کی فوج درغلائی گئی۔ اسے روپے سے خریدا گیا۔ اس کا دربار غداروں سے بھرا پڑا تھا جن میں سب سے زیادہ رسوائے عالم میر جعفر تھا۔ ان سب باتوں کو مدِنظر رکھ کر دیکھیں تو پلاسی میں سراج الدولہ کا شکست کھا جانا تعجب انگیز معلوم نہیں ہوتا کرنل ملیسن نے اپنی دوسری کتاب " ہندستان کی فیصلہ کن جنگیں " میں لکھا ہے کہ کلائیو پلاسی کے میدان میں اس وقت نکلا جب سازش مکمل ہو چکی تھی اور اسے بالکل خطرہ نہ رہا تھا۔ اسی

لیے گو پلاسی کی جنگ فیصلہ کن تھی مگر کوئی جنگ شمار نہیں ہو سکتی۔

خود کلائیو پارلیمنٹ کمیٹی کے روبرو تسلیم کرتا ہے کہ: اس جنگ میں کیوں اس قدر کم خوں ریزی ہوئی اس کے دو اسباب تھے، اوّل یہ کہ فوج اس قدر بلند مقام پر تھی کہ وہاں تک دشمن کی گولی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ دوم یہ کہ سراج الدولہ کو فوج پر اور فوج کو اس پر اعتبار نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنا فرض ادا نہ کیا۔ لیکن کلایو یہ چھپا گیا کہ نواب کی فوج کو خود اس نے گم راہ کیا۔ قسمت کی بات ہے کہ اس کے وفا شعار سپہ سالار میر مدن کی شہادت نے اسے فتح سے مایوس کر دیا۔ مسٹر بی ورڈ یلڈ کلکتہ ریویو اپریل ۱۸۹۲ء صفحہ ۳۴۳ میں لکھتے ہیں:۔

"پلاسی کا حقیقی مسلمان ہیرو میر مدن تھا۔۔۔۔ وہ اس وقت توپ کا نشانہ بنا جب وہ باغ کے قریب پہنچ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ پلاسی کے باشندے کہتے ہیں کہ میر جعفر نے دغا بازی کی اور میر مدن نے شجاعت کے جوہر دکھائے۔ ایک آدمی نے کہا کہ میر مدن کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔"

محبتوں میں ہیجان

سراج الدولہ اس لیے مُرشد آباد سے چلا تھا کہ فرانسیسی سردار لا سے مدد اور فوج حاصل کرے۔ وہ ۳ جون سے نواب کے حکم کا منتظر تھا۔ ۲۲ جون کو اسے خبر ملی کہ واٹس وغیرہ مُرشد آباد سے بھاگ گئے ہیں چوں کہ اب جنگ کے شروع ہونے میں کوئی کسر باقی نہ تھی اس لیے اس

نے فوراً نواب کو لکھا کہ اس کا انتظار کرے اور اسی وقت کئی کئی منزلیں کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ لیکن آندھی اور طوفان نے حائل ہو کر حسب منشا تیزی سے اسے سفر نہ کرنے دیا۔ راستے میں جب اسے پلاسی کی تباہی اور نواب کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا تو وہ پٹنہ کو واپس چلا گیا کیوں کہ اب وہ نواب کی کوئی خدمت بجا نہ لا سکتا تھا۔

ریاض السلاطین (ص۳۷۴) میں لکھا ہے کہ سراج الدولہ کو انگریز افسروں اور جگت سیٹھ کے ایما پر شہید کیا گیا۔ ڈاکٹر باسو کو اصرار ہے کہ سراج الدولہ کو کلائیو کی تحریک پر شہید کیا گیا۔ اسٹورٹ اپنی تاریخ بنگال کے آخری صفحے کے حاشیے میں لکھتے ہیں:۔

"کوئی بھی ہندستانی مورخ سراج الدولہ کی موت کو کلائیو سے منسوب نہیں کرتا۔ بلکہ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ نواب کی گرفتاری کو کلائیو سے پوشیدہ رکھا گیا تھا اور اسے اس وقت علم ہوا جب وہ شہید ہو چکا تھا۔"

یہ بیان صداقت کے سراسر خلاف ہے جب کہ یہ مصنف خود کہتا ہے کہ میر جعفر کو لوگ "کلائیو کا گدھا" کہتے تھے اور مرتے دم تک وہ اسی نام سے یاد کیا گیا تو ایسے شخص سے کس طرح توقع ہو سکتی ہے کہ وہ کلائیو کی اجازت کے بغیر اتنا بڑا فعل کرنے کی جرأت کرتا۔ اس نے سراج الدولہ کی گرفتاری کی اطلاع راتوں رات کلائیو کو دی۔ مزید براں کلائیو کی ایک چٹھی مورخہ ۲ر جولائی ۱۷۵۷ء میں اس نے خود فورٹ ولیم کے انگریز عمال کو لکھا ہے کہ:۔

سراج الدولہ شام کو شہر (مرشد آباد) میں پہنچ جائے گا۔ چوں کہ

نواب (میر جعفر) رحم دل فیاض اور دیانت دار ہے اس لیے اس کا ارادہ ہے کہ صرف اسے قید میں رکھا جائے اور اسے تمام مراعات دی جائیں جن کا قید خانہ روادار ہو سکتا ہے۔ پارلی منٹری کمیٹی کے روبرو کلائیو نے حلفیہ بیان دیا۔

میں نے سُنا ہے کہ سراج الدولہ جب مرشد آباد پہنچا تو میرن نے اُسے فوراً قتل کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے باپ کو بھی علم نہ تھا اور مجھے تو قتل کے دوسرے دن پتا لگا جب نواب نے اطلاع بھیجی اور اپنے فعل کی معافی مانگی اور یہ عذر پیش کیا کہ سراج الدولہ نے فوج میں باغیانہ ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں۔ مزید براں کلائیو نے اپنی چٹھی مورخہ ۲ جولائی میں حسب ذیل "ٹکرے آں کہ" ایزاد کیا۔

سراج الدولہ ۲ تاریخ کی رات کو شہر میں پہنچا اور فوراً قتل کیا گیا کیوں کہ راستے میں اس نے چند جمع داروں کو چٹھیاں لکھیں جن سے فوج میں کھل بلی مچ گئی تھی"۔ اس سلسلے میں یہ بات غور کے قابل ہے کہ کلائیو نے اپنی کسی ایک چٹھی میں سراج الدولہ کے قتل پر رنج یا افسوس کا اظہار نہیں کیا یہ جملہ قرائن اس شبہ کو یقینی بنا دیتے ہیں کہ قتل میں کلائیو شریک غالب تھا۔

ریاض السلاطین کا جو ٹکڑا پیش کیا گیا ہے اس سے معلوم ہو گا کہ مرشد آباد کے باشندے سراج الدولہ کے قتل کی سازش میں انگریزوں کو شامل سمجھتے ہیں اور اغلب یہی ہے کہ یہ کارروائی کلائیو کے ایما پر عمل میں آیا۔

کلائیو کی مذکورہ بالا تحریرات کے پیش نظر یہ کہنا پڑتا ہے کہ جب

اس نے پارلی منٹری کمیٹی کے روبرو کہا کہ اسے کوئی علم نہ تھا کہ سراج الدولہ کو گرفتار کر کے مرشد آباد لایا گیا تو اس نے صریح جھوٹ بولا۔ اس کے بعد کلائیو نے جو چٹھی کمپنی فورٹ ولیم کو ۲۴ جولائی کو لکھی اس سے صاف نظر آتا ہے کہ کلائیو نے اس معصوم نواب کے قتل کا مشورہ دیا۔ کلائیو کہتا ہے :۔

"صاحبان! سراج الدولہ چل بسا۔ نواب (میر جعفر) اس کی جان بخشی کرتا لیکن اس کے بیٹے میرن اور دیگر اکابر دربار نے آئندہ کے لیے اس کی موت کو ضروری خیال کیا کیونکہ اس کے شہر میں پہنچنے پر جمع داروں میں بغاوت کے آثار پائے جاتے تھے"

یہ ہیں انگریزوں کے کلائیو اعظم !!!

مندرجہ بالا سطور یہ کہنے پر مجبور کرتی ہیں کہ لارڈ کلائیو کو اندھا دھند جھوٹ بولنے میں باک نہ تھا۔ جیسا کہ اس کی تحریر سے ظاہر ہے کہ اسے بخوبی علم تھا کہ سراج الدولہ کب گرفتار ہوا اور عقلِ سلیم اسے قبول نہیں کرتی کہ میر جعفر یا اس کا کوئی ماتحت سراج الدولہ کو قتل کرنے کے وحشیانہ فعل کی کلائیو سے اجازت لیے بغیر جرات کرتا خاص کر جب کہ جعفر اور اس کے خاندان کی قسمت کی باگ ڈور کلائیو کے ہاتھ میں تھی چناں چہ ویلر کہتا ہے:[۵۱]

"سردست مرشد آباد کے امرا کلائیو کو طاقت کا مجسمہ خیال کرتے ہیں جو ان کی قسمت کا مالک ایک ہمہ گیر ہستی ہے اور

---

۵۱ WHELERS EARLY RECORDS OF INDIA. P26P

وہی انھیں بچا سکتا ہے، وہی برباد بھی کر سکتا ہے۔"

اگر بحث کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ سراج الدولہ کے قتل میں کلائیو کا ہاتھ نہ تھا، تو اس نے کیوں اس فعل پر انھیں سرزنش اور ملزموں کو سزا دینے کے متعلق کوئی کارروائی نہ کی؟ بینڈ بلیک ہول کی کہانی پر بے قرار ہو جانے والے سراج الدولہ کے قتل کے بارے میں گھنٹی سادھ لیتے ہیں اور اسے ذرا بھی قابلِ نفرت خیال نہیں کرتے۔

اصل یہ ہے کہ سراج الدولہ ایک غیور نوجوان تھا اور باوصف اس کے کہ انگریزوں نے اسے بڑا بھلا کہا، اس کی قابلیت میں شک نہیں ہو سکتا۔ اس لیے سیاسی نقطۂ نگاہ سے اس کا قتل عین انگریز کی مصلحت میں داخل تھا ورنہ وہ کسی وقت انگریزوں کی تکلیف کا موجب ہوتا۔

بہرحال انگریزوں نے اس کے ساتھ دغا کی اور ان کا عذر یہی ہے کہ وقت کا تقاضا یہی تھا۔ بولٹ (CONSIDENATINS BY (BSIT . P. 40 لکھتا ہے:-

"ضرورت ایسی چیز ہے کہ جو حلف، معاہدے، عہدنامے وغیرہ کو روند کر نکل جاتی ہے یہی ضرورت تھی جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمایندوں کو سراج الدولہ کو معزول کر کے کسی اور کو نواب بنانے پر آمادہ کیا اور تین مہینے کی عمر کا معاہدہ منھ دیکھتا رہ گیا۔"

مشہور تھا کہ سراج الدولہ بڑا صاحبِ مال و زر ہے اور اس کا خزانہ بھرپور بلکہ لبریز۔ اس لیے کچھ شک نہیں کہ اس پر دانت رکھ کر وہ

سراج الدولہ کی جان کے لاگو ہو گئے۔ صرف یہی ایک بات انگریزوں کے دھوکا فریب کرنے کا راز فاش کر دیتی ہے۔ کرنل میلے سن لکھتے ہیں کہ:-

"خواہ اس میں کچھ بھی نقائص و معائب ہوں مگر سراج الدولہ نے نہ تو اپنے مالک سے نمک حرامی کی اور نہ اپنے وطن کو فروخت کیا نہ کوئی انصاف پسند انگریز ان واقعات کا فیصلہ کرتے وقت جو ۹ فروری سے ۲۳ جون کے درمیان ظہور میں آئے اس امر سے انکار کر سکتا ہے کہ عزت کی ترازو میں کلایو سے سراج الدولہ کا پلڑا زیادہ بھاری ہے۔"

اس المیہ میں وہ واحد کردار ہے جس نے دھوکا دینے کا اقدام نہیں کیا کرنل میلسن کا دوسرا بیان ان کی دوسری کتاب CHINE. P. 94 سے منقول ہے:-

"۲ جون کو ۴ بجے انگریزوں نے دریا عبور کیا تو میر جعفر کی چٹھی پہنچی کہ نواب حملے کے لیے پر تول رہا ہے۔ کلایو نے جواب دیا کہ پلاسی کی طرف قدم زن ہوں گے اور صبح تک دارا پور پہنچ جائیں گے۔ اگر وہاں میر جعفر حاضر نہ ہوا تو میں نواب سے صلح کر لوں گا۔" اس کے دو گھنٹے بعد موسلا دھار بارش میں وہ روانہ ہوا اور ۲۳ جون ایک بجے دن کے پلاسی پہنچ گیا۔ نواب اس سے بارہ گھنٹے پہلے آ گیا تھا۔ اس کی فوج کا بہترین جز و پچاس فرانسیسی تھے جن کا سردار ایم سان فریز تھا۔ اس جماعت کے پاس چار توپیں تھیں۔ ۲۲ جون کو علی الصبح نواب نے اپنی ساری فوج سے حملہ کیا سب سے آگے فریز تھا اس کے پیچھے

---

ol DECINIUE BATTES OF INDIA BY MALLESUN P. 71

توپ خانہ اور توپ خانے کے عقب میں نواب کا وفادار جرنیل میر مدن تھا۔ انگریزوں کے نزدیک میر جعفر، لطف یار خاں اور راجا دلب رام کی فوج تھی اور انگریز دشمن اور دریا کے گھیرے میں تھے۔ مگر میر جعفر کی معہود دغا بازی کی وجہ سے انگریزوں کو صرف فریز کا خوف تھا۔ اگر نواب کے سپہ سالار وفادار ہوتے تو انگریز ختم ہو چکے تھے۔ کلائیو نے کمپنی کی کمیٹی کو لکھا کہ :-

نواب کے توپ خانے کا مقابلہ ناممکن تھا اس لیے ہم خاموش تھے اور ارادہ تھا کہ رات کو شب خون ماریں گے۔ لیکن دوپہر کے قریب دشمن نے توپ خانہ ہٹا لیا اور واپس چلے گئے۔

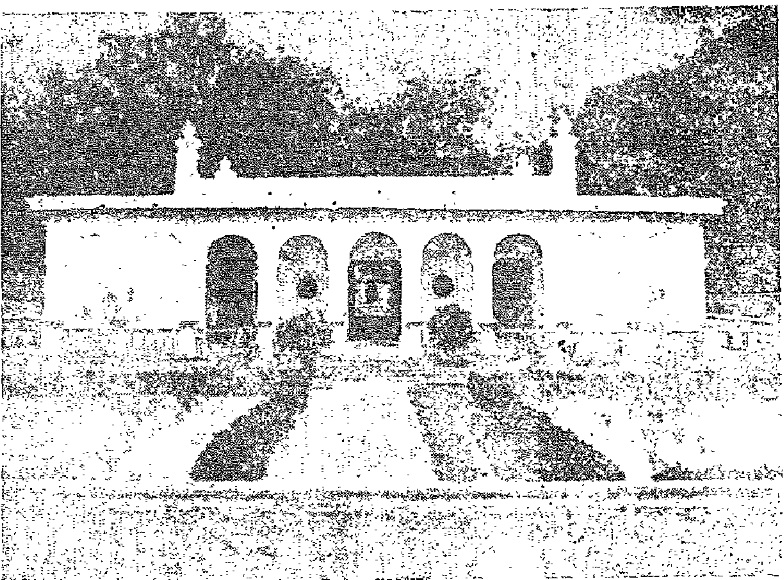
جنگ کا آغاز فریز نے ایک توپ چلا کر کیا جس کے بعد سارا توپ خانہ گولہ باری کرنے لگا لیکن ان سے چنداں نقصان نہ پہنچا انگریزوں نے بھی جواب دیا آدھے گھنٹے کے بعد کلائیو فوج کو واپس لے گیا اور شکار خانے کی پناہ لی جس سے دشمن کے حوصلے بڑھ گئے۔ وہ اپنی توپیں اور نزدیک لے آئے۔ آخر کلائیو نے مشورہ کیا اور طے پایا کہ سپاہی اپنے مورچوں پر قائم رہیں اور رات کے وقت حملہ کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ مشورہ ہو رہا تھا نواب نے فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ اسی عرصے میں بارش شروع ہو گئی اور دشمن کا توپ خانہ سست ہو گیا اور سامانِ جنگ اور بارود بے کار ہو گئے۔ کلائیو نے تو اپنے سامان کو بچانے کا انتظام کر رکھا تھا دشمن نے سمجھا کہ انگریزی توپ خانہ بھی بے کار ہو گیا ہو گا اس لیے وہ بڑھتے گئے لیکن انگریزی توپ خانے نے گولہ باری شروع کر دی۔ اس

حملے میں میر مدن مارا گیا۔ اس بہادر اور وفادار سپاہی کی موت نے سراج الدولہ کا حوصلہ پست کر دیا اس نے میر جعفر کو بلا کر کہا "میر جعفر اس پگڑی کی لاج تمھارے ہاتھ ہے"

میر جعفر نے وعدہ کیا مگر ساتھ ہی کلائیو کو اسی وقت اطلاع دے کر فوراً حملے کا مشورہ دیا۔ نوجوان نواب سے ہمدردی نہ کرنا ناممکن ہے جس کا بہترین جرنیل مارا گیا اور جس کے چاروں طرف غدّار ہی غدّار تھے۔ میر جعفر کے جانے کے بعد راجا دلب رام بھی آگیا۔ اس نے اپنے مالک کو پریشان پایا۔ انگریز میدان میں ڈٹے ہوئے تھے اس کی فوج میں گڑ بڑ پڑ گئی تھی ناامیدی اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ دلب رام نے بھی بجائے حوصلہ دینے کے یہ مشورہ دیا کہ مرشد آباد کو نکل جائیے۔ سراج الدولہ نے بدقسمتی سے اس کا مشورہ قبول کیا فوج کو واپسی کا حکم دیا اور دو ہزار سواروں کے جھرمٹ میں سانڈنی پر سوار ہو کر مرشد آباد کو چلا گیا۔ اس پریشانی کے باوصف فریز کی وفاداری اور بہادری میں فرق نہ آیا اور کئی گھنٹے تک خوب لڑتا رہا جب کوئی میدان میں نہ رہا تو اسے بادلِ ناخواستہ واپس ہونا پڑا۔

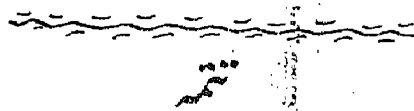
مورزم دار لکھتے ہیں:۔

"جب سراج الدولہ گرفتار ہو کر مرشد آباد پہنچا تو اسے ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند کیا گیا۔ جب چند بدمعاش وحشیوں کی طرح دوڑتے آئے تو وہ سمجھ گیا کہ آخری وقت آگیا۔ اس نے ان سے وضو کے لیے پانی مانگا تاکہ وہ مرنے سے پہلے نماز ادا کرلے ایک لوٹا



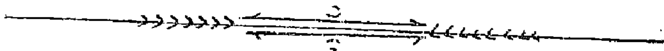
مقبرہ سراج الدولہ

پاس پڑا تھا کسی نے اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔
وہ سجدے میں گرا تو محمدی بیگ نے تلوار سے اس پر
وار کیے کہ اس نے سجدے سے سر نہ اُٹھایا۔ یہ تمام
واقعہ مُرشد آباد پہنچنے کے تین گھنٹے کے اندر ہوا۔"
سراج الدولہ نواب علی وردی خاں کے قبرستان خوش باغ
میں مدفون ہے۔
قاموس المشاہیر جلد دوم صفحہ ۲۴۷ پر تحریر ہے کہ میرن نے
سراج الدولہ اور اس کی بیگمات کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔



تتمہ

خدا کے فضل و کرم سے یہ فرض ادا ہوا۔ تصویر کے دونوں رُخ
آپ کے سامنے ہیں جو چاہیں رائے قائم کریں۔ میری نگاہ میں حضرت
نواب شہید رحمۃ اللہ علیہ جیسا انسان بلکہ نوجوان صدیوں کے بعد پیدا
ہوگا۔ ۱۹ سال کی عمر میں یہ اتقا، پرہیزگاری، پاک بازی، شجاعت
حلم، بردباری، صلح رحمی، شان و شوکت، رعب داب، ذوق جمالیات،
علم و ہنر کی قدر، جمیّت، غیرت، تعصّب سے دور، کمینی حرکات مثل غدّاری سے
بالا، مکمل مذہبی، مساوات اور دیگر محاسن مجموعہ قدرت کا شاہ کار تھا۔
اورنگ زیب کی خامیوں کو نکال دو تو نواب شہید اورنگ زیب ثانی
بن جاتا ہے۔



باب ششم

کیفرِ کردار

"اس سے قبل کسی غدّاری نے اپنی سزا خود اپنے ہاتھوں اس تیقّن کے ساتھ نہیں پائی جیسی میر جعفر کی غداری کو نصیب ہوئی" (کرنل میلسن)

حضرت سراج الدولہ کی داستانِ حیات ختم ہو چکی اور اس کے ساتھ ہی ان اوراق کو ختم ہو جانا چاہیے۔ مگر قدرت نے جو انتقام ان غدّاروں سے لیا، وہ اس قدر عبرت انگیز ہے کہ اس کے بیان کرنے کے بغیر یہ کتاب درجۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی۔ کرنل میلسن نے اپنے مندرجۂ بالا جملے میں دریا بہ حباب اندر کر دیا ہے مگر یہ صرف غدّارِ اعظم میر جعفر تک محدود ہے۔ راجا ولب رام، نواب میرن، گھسیٹی بیگم، جگت سیٹھ، سروپ چند، امی چند، نندکمار، راج بلب، میر قاسم اور دیگر غداروں کا جو حشر ہوا وہ میر جعفر کی عاقبت خرابی سے کم سبق آموز نہیں۔

میر جعفر نے جس نمک حرامی، منافقت، حلف دروغی، غدّاری، وطن فروشی اور ایمان کُشی سے کام لیا اس کی مثال روئے زمین کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اس نے نہ صرف حضرت شہید سے غدّاری کی بلکہ شہنشاہِ ہند کے ساتھ غدّاری سے باز نہ آیا اور اپنے مُلک و قوم کو

آیندہ غلام بنانے کی شیطانی خدمت انجام دی۔ اس کا کردار تقاضا کرتا ہے کہ اس کا بھی دسہرے کی طرح تہوار منایا جائے اور ہر سال اس کا بت مع میرن کے بت کے راون کی طرح سے جلایا جائے۔ یہ اخلاق اور مادر وطن کا انتقام ہے اب قدرت کا انتقام ملاحظہ ہو۔

صاحب سیر المتاخرین لکھتا ہے[1]

میر جعفر کے مسند نشین ہوتے ہی ملک میں بے چینی کی روح دوڑ گئی۔ راجا رام نراین صوبے دار عظیم آباد کو نواب شہید سے اس قدر خلوص و عقیدت تھی جو عشق کی منزل تک پہنچتی ہے۔ اس نے اندر ہی اندر راجا سندر سنگھ، راجا بلوان سنگھ اور دیگر زمین داروں کو انتقام پر آمادہ کیا۔ میر جعفر نے اسے قابو میں لانے کے لیے میر مشرف الدین اور گوبندل کو بھیجا مگر راجا رام نراین جہاں دیدہ اہل کار تھا۔ اس نے انھیں باتوں میں ٹال دیا یہ اسی انتقام کی دُھن میں لگا رہا حتیٰ کہ میر قاسم نے اس وفا شعار زندگی کا خاتمہ کردیا۔ راجا رام نراین مدت العمر میر جعفر کے پہلو کا خار ثابت ہوا جس نے اس کی نیند حرام کردی۔ ادھر حضور علی نے پورنیہ میں بغاوت کردی اور راجا اچھل سنگھ اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ حضور علی مسند نشین ہوا اور راجا اچھل سنگھ دیوان مقرر ہوا۔ جعفر کی حکومت کا پانچواں سال تھا کہ یہ مصیبت آپڑی وہ فیصلہ نہیں کرسکتا تھا کہ پہلے کس پر حملہ کرے۔ بہرصورت یہ بچارا افیونی، بھنگڑ، طوائفوں کے جھرمٹ سے نکلا اور عظیم آباد کی طرف روانہ ہوا اور مرشد آباد میرن کے سپرد کر گیا۔

---

[1] سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۱۵

نفرت انگیز سفاکی

یہ فساد ہو رہے تھے کہ میر جعفر اور راجا رام ولب میں تنازعہ برپا ہو گیا۔ دونوں غدار ایک دوسرے کی دیانت داری سے بدظن ہو گئے نوبت یہاں تک پہنچی کہ میل ملاقات بند ہو گئی بلکہ ایک دوسرے کی جان کے بیری بن گئے۔ بات یہ تھی کہ راجا ولب رام میر جعفر سے بہت بلند مرتبہ کا مالک تھا بلکہ میر جعفر اس کا پروردہ تھا وہ اس کا تحکمانہ لہجہ برداشت نہ کرسکا اور اب راجا میر جعفر کو معزول کرانے کی فکر میں ہوا اور تجویز کی کہ سراج الدولہ کے چھوٹے بھائی میرزا مہدی کو قید خانے سے نکال کر صوبے دار بنایا جائے۔ اس نے محافظوں سے ساز باز کر لی تھی کسی نہ کسی طرح میر جعفر کے کان میں بھنک پڑ گئی اور اس نے بلا سوچے سمجھے میرزا مہدی کے قتل کا حکم میرن کو دیا۔ میرن نے اسے تختوں میں دبا کر ہلاک کر دیا۔ ایک نوخیز پیارے پیارے معصوم لڑکے کی لاش دیکھ کر کون سی آنکھ تھی جو پُرنم نہ ہوئی اور کون سا جگر تھا جو شگاف نہ ہوا اور کون سی زبان تھی جس نے میرن اور میر جعفر پر لعنت نہ بھیجی۔

یہ حکم میر جعفر نے عظیم آباد جاتے ہوئے دیا۔ راجا رام نرائن نے میر جعفر کے حملے کی خبر سنی تو اسی کے حربے سے مقابلہ کرنے کا اہتمام کیا۔ یعنی انگریزوں سے ساز باز کر لی۔ میر جعفر نے بہت حلف اٹھائے تحریریں روانہ کیں لیکن راجا نے اس کی ہر بات کو ساقط الاعتبار سمجھا۔ اس غرض کے لیے راجا نے گو بند مل کی خدمات حاصل کیں، حالاں کہ میر جعفر نے رام نرائن کو دھوکا دینے کو بھیجا تھا وہ

سبحان اللہ ہمہ خانہ آفتاب است) گوبند مل میر جعفر کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ راجا انگریزوں کی ضمانت مانگتا ہے۔ میر جعفر نے کہا اسے کوئی اعتراض نہیں۔ گوبند مل نے میر جعفر کے منشی کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور حسب منشا چٹھی کلائیو کو لکھوا کر میر جعفر کے پاس لے گیا۔ گوبند مل کو معلوم تھا کہ میر جعفر لکھنے پڑھنے سے عاری ہے اور بھنگ پینے کے بعد اس کے ہوش بجا نہیں ہوتے اور کام سے عاجز ہوتا ہے اس لیے منشی اور گوبند مل نے اسی وقت وہ دستخط کے لیے پیش کی۔ منشی جی نے چٹھی پڑھ کر سنائی اور وہ باتیں بیان کیں جن کو میر جعفر پسند کرتا تھا مگر اس چٹھی میں درج نہ تھیں۔ میر جعفر نے چٹھی کے اجرا کا حکم دیا اور گوبند مل نے کلائیو سے مل کر رام نراین کو میر جعفر کی دست رس سے آزاد کرا لیا اور میر جعفر تڑپتا رہ گیا۔

امرا پر اس کا کوئی رعب داب نہ تھا وہ اسے منھ پر کھری کھری سنا جاتے تھے۔ چناں چہ ایک دن میرزا شمس الدین سے بھرے دربار میں میر جعفر نے کہا:-

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ملازموں نے کرنل کے ملازموں سے کچھ جھگڑا کیا ہے شاید آپ کو معلوم نہیں کہ کرنل کلائیو کس قدر جلیل القدر انسان ہے۔" میرزا نے کہا" عالی جاہ! میں اور کلائیو کی شان میں گستاخی کروں میں تو ہر صبح اٹھ کر اس کے گدھے کو کورنش بجالاتا ہوں۔ حضور اندازہ لگائیں میں یہ جرأت کر سکتا ہوں کہ اس گدھے کے سوار کو کچھ کہوں۔ میر جعفر کو کلائیو کا گدھا کہنا اس لیے موزوں معلوم ہوتا ہے کہ میر جعفر کلائیو کے سامنے دم نہ مار سکتا تھا۔

اس نے اپنے بھائی میر کاظم خاں کو عظیم آباد کا صوبے دار رام نراین کی جگہ بنایا لیکن رام نراین نے وہ چٹھی دکھائی جو نواب کی چٹھی کے جواب میں گوبند ل نے لکھائی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ جعل سازی ہر مگر دم نہ مار سکا۔

میر جعفر میں جاہ و جلال نام کو نہ تھا بلکہ اس کی حرکات سے شہدا پن ٹپکتا تھا وہ نواب نہیں بلکہ ایک بازاری لُچّہ معلوم ہوتا تھا چنانچہ اس نے عظیم آباد کی رنڈیوں، بھانڈوں کے ساتھ ہولی منائی اور ایک دوسرے پر رنگ عبیر اور راکھ اچھالی تو لوگ اسے اس حالت میں دیکھ کر لاحول پڑھنے لگے۔ اس پر یہ غضب کہ شاہی جلوس میں رنڈیاں ہاتھی پر سوار ہوتی تھیں اور جب میر جعفر چاہتا راستے ہی میں مجرا شروع ہو جاتا۔

اس عرصے میں راجا شتاب رائے بادشاہ کا حکم لے کر پہنچا جس کی رو سے اسے عظیم آباد کا دیوان اور قلعہ رہتاس کا فوج دار مقرر کیا گیا تھا اور صمصام الدولہ کی جاگیریں اس کے سپرد کی گئی تھیں۔ راجا رام نراین کی وساطت سے وہ میر جعفر کے دربار میں پیش ہوا۔ میر جعفر کو دیکھتے ہی تاڑ گیا کہ ایسے مست کاہل آرام طلب سے کام ہونا مشکل ہے اس لیے اس نے کلائیو سے رجوع کیا اور اس کی سفارش لے کر میر جعفر کے پاس آیا اور اسے دیوان بنانا پڑا۔

ملک کے انتظام کی طرف اس نے کبھی توجہ نہ کی۔ اس میں انتظام کی قابلیت ہی نہ تھی وہ ناچ رنگ کے مزے لیتا مرشد آباد آیا اور دن رات دھمر وٗد، رنگ رلیوں، بھنگ، افیون اور دیگر

منشّیات میں زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کی اور میرن کی خدمت کے لیے شاہ جہاں آباد کے چار ہزار اشخاص جن میں رنڈیاں، بھانڈ، ہیجڑے، کتھک شامل تھے، نوکر رکھے گئے۔ فوج بھوکوں مر رہی تھی۔ سپاہی اپنے گھوڑے کھیتوں میں چرا کر پیداوار کو تباہ کرتے تھے کیوں کہ جو رُپیہ آتا وہ رنڈیوں اور بھانڈوں کے لیے بھی کافی نہ ہوتا تھا۔ اس زرخیز زمین کی آمدنی چونی لال اور منی لال اور دیگر محاسب مزے سے کھا رہے تھے۔ عہدنامے کے مطابق میر جعفر کو انگریزوں سے ½ ۱ کروڑ رُپے ادا کرنے تھے جن کی ادائی کی کوئی سبیل نہ بنی تو میر جعفر نے بردوان اور چند دیگر اضلاع انگریزوں کے پاس رہن رکھے عظیم آباد سوا راجا رام نراین کے کسی کو حاکم نہ مانتا تھا اور پورینہ کی آمدنی صرف خادم حسین خاں صوبے دار کے لیے وقف تھی۔ فوج تو فاقے کر رہی تھی اور افسر قرض دام سے تنگ آگئے تھے۔ رعایا اس فاسق فاجر ظالم اور بے اصولے کی حکومت سے تنگ تھی آخر لطف خاں اور دلیر خاں سپہ سالاروں نے فوج سے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ میر جعفر کا قصّہ ہی پاک کر دیا جائے۔ قاضی ہادی سپہ سالار نے بھی اس تجویز پر صاد کیا اور اس نے سمجھا کہ اسے اپنے محسن ولی نعمت کے خونِ ناحق کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا حلف اٹھائے گئے وعدے وعید ہوئے بلکہ تحریری عہد نامہ ہو گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جعفر کا بھائی میر کاظم بخشی بھی اس سازش میں شریک تھا اور اس میں شک نہیں اس کی مہر اور دستخط عہد نامے پر ثبت تھے لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میر کاظم خاں کو اس کا کوئی علم نہ تھا بلکہ مولوی مرتضٰی خاں نے

اس کی مہر ثبت کی تھی جو کاظم خاں کے محل کا داروغہ تھا۔ بہر حال میر کاظم نے اس سازش کی اطلاع میر جعفر تک پہنچائی وہ یہ خبر سن کر کانپنے لگا مگر اس میں اتنی ہمّت اور طاقت نہ تھی کہ اکابرِ دربار کا کھلا مقابلہ کرتا۔ طے یہ پایا کہ جب عشرہ محرم کے دن میر جعفر امام باڑے کو جائے تو اسے ہلاک کر دیں آخر وہ دن آگیا اور میر جعفر پالکی میں سوار ہو کر چلا گیا۔ حملہ نہ ہو سکا میر جعفر نے خطرے کو محسوس کیا اور ڈر کے مارے امام باڑے جانا چھوڑ دیا۔ مولوی مصطفٰے خاں نے تمام سازش کو کھلے بندوں منکشف کر دیا اور سازشیوں کی تحریریں پیش کر دیں۔ ہادی خاں ایک بہادر سپاہی تھا اس نے نہ انکار کیا نہ اقرار اور اپنے محل میں مسلح ہو کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف فوج تعیّن کر دی۔ میر کاظم ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں بچّے کی انگلی پکڑ کر لایا اور اپنی بے گناہی کی قسم کھائی اور ساتھ ہی استعفا پیش کر دیا۔ ہادی خاں کو حکم ملا کہ میر جعفر کے ملک سے فوراً نکل جائے۔ وہ چلا گیا اور اسے راستے میں ہلاک کیا گیا۔ میر کاظم خاں کو میران نے دوست بنا لیا اور اس دھوکے میں قتل کرا دیا۔ اب انسان کشی کی عادت پوری کرنے کے لیے بیگم علی وردی خاں (اشرف النسا بیگم) گھسیٹی بیگم، امینہ بیگم، لطیف النسا بیگم اور اس کی چار سالہ لڑکی پر نظر پڑی۔ ان عزّت دار بدنصیب اور بے کس خواتین کو ایک بدبُو دار کمرے میں قید کیا گیا۔ ان کے میر جعفر پر بے شمار احسانات تھے اس وقت جب سراج الدولہ میر جعفر کے قتل کے درپے تھا گھسیٹی بیگم نے اپنی جان پر کھیل کر اس کی جان بچائی تھی مگر میر جعفر

کو شریفانہ جذبات سے کیا واسطہ، کچھ عرصے کی قید کے بعد اپنی گندی اور بدترین کشتیوں میں بٹھا کر جہاں گیر آباد (ڈھاکہ) غیر شریفانہ انداز سے روانہ کیا۔ وہ ہر شخص کو قتل کرنا چاہتا تھا جس سے کہ اسے ذرا بھی خطرہ ہوا۔ ان واقعات کے دو ایک ماہ بعد شہزادہ عالی گوہر نے بنگالے کی طرف رُخ کیا اور اب باپ بیٹا مجبور ہوئے کہ فوج کے مطالبات پورے کریں انھوں نے کچھ بقایا ادا کی۔ عالی گوہر عظیم آباد کے پاس آکر خیمہ زن ہوا۔ راجا رام نرائن اس سے راہ ورسم پیدا کرنے لگا۔ میر جعفر کے تو وہ نام سے بیزار تھا مگر انگریزوں کے خلاف قدم اٹھانے کی جرأت نہ تھی۔

اب چاروں طرف سراج الدولہ کے عہد حکومت کا چرچا تھا۔ لوگ اسے یاد کرکر کے تڑپتے اور کہتر و مہتر سب یکساں اس کی تعریف وثنا میں رطب اللساں تھے۔ شہزادہ عالی گوہر کی مہم کا تذکرہ ہم سے تعلق نہیں رکھتا جس قدر لکھا ہے اس سے مقصد صرف میر جعفر کے کردار کو اجاگر کرتا ہے۔ ہاں اتنا اور بیان کرنا لازم آتا ہے کہ جب رام نراین کے شہزادے سے ملنے کی خبر آئی تو میر جعفر جھجک رہ گیا۔ اس نے کلائیو سے استمداد کی پہلے تو اس نے انکار کیا مگر جب منت سماجت کی حد ہو گئی تو وہ رضا مند ہو گیا اور دونوں فوجیں عظیم آباد کو روانہ ہوئیں۔ جب فوجیں عظیم آباد سے لوٹیں تو روانگی کے وقت میر جعفر نے میرن کو حکم دیا تھا کہ چپکے سے نہایت احتیاط کے ساتھ امانت خاں اور دلیر خاں کو قتل کرے وہ قتل تو نہ کر سکا مگر راجا رام نراین کے ذریعے ملک بدر کرا دیا۔ دلیر خاں

راجا کامران خاں کو ساتھ لے کر شہزادے کی خدمت میں حاضر ہو گیا دلیر خاں نے مرشد آباد پر حملہ کیا مگر کامیاب نہ ہوا۔ اس وقت میر جعفر نے شاہ عبدالوہاب کو جو کہ مشہور سپہ سالار تھا اور گزشتہ عہد میں اس نے نمایاں خدمات انجام دی تھیں، توپ دم کر دیا۔ ادھر خادم حسین خاں صوبے دار پورینہ شہزادے سے مل گیا کیوں کہ وہ اپنے دوست میرن کے باپ کی بے ہودگیوں کو برداشت نہ کر سکا اس کے علاوہ راجا ولب رام نے سنیاسیوں کے ذریعے شہزادے کی مالی امداد وسیع پیمانے پر شروع کر دی اور میر افضل کشمیری نے بھی بہت بڑی رقم بھیجی صرف اس لیے کہ میر جعفر سے نجات ملے۔ یہ دوسری غداری کا ثمر تھا جو میر جعفر کو ملا۔

میرن کا حشر

میرن کو دوبارہ خادم حسین خاں کے مقابلے کے لیے کلائیو کے ہم راہ عظیم آباد جانا پڑا جب یہ فوجیں پہنچیں تو خادم حسین خاں بھاگ گیا۔ دوسرے دن بہت بارش ہوئی اور فوج کا کوچ رک گیا۔ اب وقت آگیا تھا کہ قدرت خون آشام میرن سے انتقام لیتی اور اس کی بے آواز لاٹھی بروئے کار آتی۔ دس بجے رات کا وقت تھا بارش پورے زور پر تھی اس کے دو مصاحب ہمت خاں اور سید محمد خاں ابھی ابھی اس کے پاس سے گئے تھے ان کے جانے کے آدھ گھنٹے کے بعد جب میرن نے دیکھا کہ بارش شدت کی ہے تو وہ اپنے بڑے خیمے کو چھوڑ کر ایک دوسرے خیمے میں چلا گیا اس کا ارادہ اس خیمے میں رات بسر کرنے کا تھا اس لیے اس کی دو کنچنیاں جو سفر میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی تھیں،

اس کے پلنگ کی پائنتی آکر کھڑی ہوگئیں۔ داستان گو اور چپی کرنے والے حاضر ہوگئے اور میرن سونے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے کنچنیوں کو تو رخصت کر دیا اور باقی اس کے پاس رہے اور اپنے اپنے فرض کی انجام دہی میں مشغول ہو گئے۔ نہ جانے میرن سو گیا تھا یا جاگتا تھا کہ بجلی شدت سے کوندی اور ایک خوف ناک کڑک کے ساتھ آسمان سے میرن کے سر پر پڑی اور وہ فوراً مر گیا۔ اس کی لاش بستر پر پائی گئی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ذرہ بھر حرکت نہ کر سکا اس طرح میرن قدرت کے انتقام کا شکار ہوا۔ جب بارش تھمی اور دیگر ملازم جن کی اب باری تھی، اندر آئے تو میرن اور اس کے دونوں جوان نوکروں کو مردہ پایا۔ یہ عالم دیکھ کر انھوں نے چپکے سے افسروں کو جگایا اور اس حادثے کی اطلاع دی وہ دوڑے دوڑے آئے اور انھوں نے میرن کی لاش کو بہ غور دیکھا، سر میں چھ شگاف پشت اور پیٹ پر سات ضربات تھیں جو ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے کسی نے غصے میں آکر چابک سے لگائی ہیں۔ جو تلوار میرن کے سرہانے پڑی تھی، اس میں بھی شگاف ہو گئے تھے اور پلنگ چھلنی ہو گیا تھا جب اس عجیب واقعے کی اطلاع شاہ محمد علی حزیں کو پہنچی تو انھوں نے فرمایا " دیکھو بجلی کی جست ہوئے کس صفائی سے اپنا آدمی چھوٹے سے خیمے سے ڈھونڈ نکالا "۔

میرن کے مظالم کی فہرست بہت طویل ہے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے اس نے جسارت خاں حاکم ڈھاکہ کو لکھا کہ وہ ان دو بدنصیب بے کس اور بوڑھی خواتین کو ہلاک کر دے جن کے

خوانِ نعمت سے اس نے اور اس کے باپ نے پرورش پائی تھی اور جن کے قدموں کے طفیل وہ اس منزلت کو پہنچے تھے۔ یہ خواتین گھسیٹی بیگم اور امینہ بیگم دخترانِ علی وردی خاں تھیں۔ ان میں اب کیا باقی تھا دو دن کی مہمان قسمت کی ماری بوڑھیاں جن کا نام تک کسی کو یاد نہ رہا تھا۔

اس نیک نہاد امیر نے جو نواب علی وردی خاں کے خاندان کا نمک خوار تھا اس حکم کی بجا آوری سے معافی چاہی اور عرض کی کہ اس جگہ کسی اور کو مقرر کیا جائے۔ یہ عرضی اس وقت پہنچی جب میرن خادم حسین خاں کے خلاف اپنی زندگی کی آخری مہم پر جانے کے لیے پابہ رکاب تھا اس نے اپنے ایک معتبر کو اس ہدایت کے ساتھ ڈھاکہ روانہ کیا کہ وہ ان خواتین کو کشتی میں سوار کرے اور مرشد آباد لانے کے حیلے سے کسی ویران جگہ میں کشتی کو غرق کر دے۔ اس جلاد نے ان خواتین کو کشتی پر سوار کیا اور ایک سنسان مقام پر لے جا کر انھیں کہا کہ وضو کر کے نماز ادا کر لو۔ گھسیٹی بیگم خوف زدہ ہو کر رونے چلانے لگی مگر بہادر سراج الدولہ کی بہادر ماں امینہ بیگم نے اپنی بہن کو مخاطب کر کے کہا:

"بہن کیسا خوف اور کس بات کا رونا آخر ایک دن مرنا پڑا تھا وہ دن آج آ گیا تو کیا ہوا۔ بہن ہم گنہ گار ہیں ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہماری موت کے لیے یہ طریق عنایت کیا اور ہم اپنا بوجھ میرن کی گردن پر ڈال کر دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں" اس کے بعد دونوں بہنوں نے وضو کیا کپڑے بدلے

خاک کربلا اپنے ماتھے سے ملی، خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور جلاد سے کہا کہ اپنا کام کرے۔ جلاد کچھ مذبذب سا ہوگیا تو کہا جاتا ہے کہ وہ خود دریا میں کود پڑیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسی رات کو میرن پر بجلی گری۔ بعض کہتے ہیں کہ اس واقعے کے ایک ماہ بعد میرن ہلاک ہوا۔ لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ بیگمات آخر شوال یا اوّل ذیقعد ۱۱۷۳ھ کو ہلاک ہوئیں اور اسی مہینے کی ۹ تاریخ کو میرن پر بجلی گری۔

کہتے ہیں کہ جب وہ اپنی آخری مہم کو روانہ ہوا تو اس کے پاس ایک بیاض تھی جس میں تین سو اشخاص کے نام درج تھے۔ میرن کہتا تھا کہ خادم حسین اور شہزادے کو شکست دے کر مرشدآباد آئے گا تو ان میں سے ایک ایک کو قتل کرے گا۔ میرن کی موت کی اطلاع صبح کو کلائیو کو دی گئی اس نے حکم دیا کہ میرن کی موت کی خبر عام نہ ہونے پائے اور اس کا شکم چاک کر کے انتڑیاں وغیرہ نکال دی جائیں اور انھیں دفن کیا جائے اور لاش اس طرح اٹھائی بٹھائی جائے گویا میرن زندہ ہے۔ دوسرے دن کلائیو نے کوچ کیا میرن کی لاش ہاتھی پر رکھی گئی اس کے پاؤں ہودے سے باہر تھے گویا وہ بیمار ہے لیکن اسی وقت مشہور ہو گیا کہ میرن کی لاش ہاتھی پر آ رہی ہے اور سب کے دلوں میں اس واقعے کی یاد تازہ ہوگئی جب سراج الدولہ کی لاش کو ہاتھی پر رکھ کر سر بازار پھرایا گیا تھا۔ اور سب نے تسلیم کیا کہ میرن کو اس کے کیے کا پھل ملا ہے۔ کلائیو نے میرن کی لاش کو کفن میں بند کیا اور کشتی میں ڈال کر

کر راج محل پہنچایا۔ چوں کہ لاش میں سخت بو تھی اس لیے اسے فوراً دفن کیا گیا جس مقام پر وہ دفن ہوا وہاں اب تک لوگ عبرت حاصل کرتے ہیں۔

میرن کی موت کی خبر مرشد آباد پہنچی تو میر جعفر کے رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے اور فوج اور ملک کا انتظام خدا کے حوالے ہو گیا لیکن ابھی اس کا ایک داماد بھی تھا۔ ان میں کبھی نہ بنی اور ہمیشہ کشیدہ رہے۔ میرن نے اس جلتی پر ہمیشہ تیل ڈالا مگر میرن کی وفات نے میر جعفر کو مجبور کیا کہ اپنے رشتے داروں سے رابطۂ اتحاد قائم کرے۔ اس نے میر قاسم کو پورنیہ کا صوبے دار مقرر کیا اور اسی کو انگریزوں سے بات چیت کرنے پر مامور کیا۔ میر قاسم نے اس سفارت کے فرائض بجا لانے کے دوران میں انگریزوں کو جتا دیا کہ وہ میر جعفر سے بہتر طریق پر صوبے داری کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ ادھر میر جعفر کا کام میر قاسم نے اس کی مرضی کے مطابق انجام دیا جس سے وہ بہت خوش ہوا چوں کہ میر جعفر کی اولاد میں کوئی اس قدر بڑی عمر کا نہ تھا کہ ملک کے معاملات سنبھالتا اس لیے میر قاسم ہی سب کام انجام دینے لگا۔ میرن کے بعد فوج کو کچھ نہ ملا اور سپاہیوں نے تقاضا شروع کیا۔ یہاں تک کہ بھوک سے تنگ آ کر انھوں نے میر جعفر کے محل کا محاصرہ کر لیا اور آخر میر قاسم کی ذمے داری پر بڑی مشکل سے یہ شورش رکی۔ میر قاسم کو پھر کلکتے جانا پڑا اس کے دل میں کوئی امنگ مچل رہی تھی چناں چہ کلکتے جانے سے پہلے اس نے

علی ابراہیم خاں بہادر کو یہ ہدایت کی وہ لوگوں کو اپنی طرف مائل کرے۔
علی ابراہیم خاں پرانا درباری تھا جس نے علی وردی خاں کی آنکھیں
دیکھی تھیں اور سراج الدولہ کی موت کا رنج اسے اندر ہی اندر کھائے
جاتا تھا اور میر جعفر کو کیفر کردار تک پہنچانا وہ اپنا فرض تھا۔ اس
نے میر قاسم کی سازش کا خیر مقدم کیا کلکتے میں میر قاسم نے مسٹر
وانس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ میر جعفر کو معزول کر کے اسے
صوبے دار بنایا جائے۔ چناں چہ وانس اس تجویز کو سرے چڑھانے
کے لیے مُرشد آباد گیا علی ابراہیم خاں نے شاہانہ شان و شوکت
سے اس کا استقبال کیا۔ دوسرے دن ۹ بجے صبح میر جعفر اس
کی خدمت میں حاضر ہوا وانس بڑے تپاک سے پیش آیا اور پھر
اسے اپنا مدعا بتایا۔ میر جعفر نے حکومت چھوڑنے سے انکار کیا اور
بہت گرجا برسا۔ وانس نے میر قاسم کو بلایا اور میر قاسم بگڑ کر چلا
آیا۔ یاد رہے کہ اب مہتاب رائے اور راجا سروپ چند جگت سیٹھ
میر جعفر سے منحرف ہو کر میر قاسم سے مل گئے تھے۔ بہت بحث کے
بعد یہ قرار پایا کہ کل وہ میر جعفر کے محل میں اس بات کا فیصلہ کریں گے۔
دوسرے دن صبح کو انگریزوں نے میر جعفر کے محل کا محاصرہ کر لیا
اور میر قاسم کی فوج بھی نقار خانے کے سامنے صف بستہ ہو گئی۔
آخر انگریزی فوج کے تلنگوں نے پھاٹک پر قبضہ کر لیا اور توپ خانہ
گولے برسانے پر تیار ہو گیا۔ میر جعفر کے سپاہی بھاگ گئے وانس
نے مزید گفتگو بے سود خیال کی اور میر قاسم کو مسند نشین کر دیا۔
نقارے پر چوٹ پڑی اور میر قاسم کی صوبے داری کا اعلان ہو گیا۔

نذریں پیش ہوئیں۔ میر جعفر سے متنفر لوگوں نے شادیانے بجائے۔ دوسرے دن میر قاسم نے میر جعفر کو اطلاع دی کہ وہ اگر مرشد آباد میں رہنا چاہے تو کوئی اس کے ساتھ مزاحمت نہ کرے گا اور وہ اپنی مرضی سے جس محل میں رہنا چاہے رہے۔ کلکتے جانا چاہے تو بھی سکونت کا انتخاب اس کی مرضی پر ہے۔ میر جعفر بے بہا زر و جواہر ہمراہ لے کر کشتیوں میں سوار ہو کر کلکتے روانہ ہو گیا۔ اس کے چار پانچ لڑکے اور چند لڑکیاں تھیں۔ میر جعفر بہ حفاظت تمام کلکتے پہنچا وہاں اس نے ایک نیا محل تعمیر کرایا اور اس میں اقامت اختیار کی۔ مرشد آباد سے ایک متنفس بھی اس کے ساتھ نہ آیا البتہ غلام علی بیگ نے رفاقت کی وہ بھی اس لیے کہ اس کا اور کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اب میر قاسم نصیر الملک میر محمد قاسم علی خاں نصرت جنگ عالی جاہ کے خطاب سے صوبے دار ہوا۔ معاہدوں کی تکمیل کے بعد قاسم نے حساب فہمی کا حکم دیا اور بڑے بڑے غبن ظاہر ہوئے اور یہ دیکھ کر قاسم کے ہوش اڑ گئے کہ کروڑوں روپے کی بقایا اسے ادا کرنی ہو گی اس لیے اس نے اپنے ذاتی اخراجات کم کر دیے اور محصولات اور مالیے کی وصولی پر کڑی نگرانی لگائی۔

میر قاسم کا راجا رام نرائن سے بگاڑ ہو گیا اور قاسم نے رام نرائن کو قید کر کے مرشد آباد بھیج دیا۔ راجا ہتاب رائے عظیم آباد سے چلا گیا۔ سیتا رام فوج دار ترہٹ قاسم کے خلاف بغاوت میں مارا گیا۔ شاہ سعد اللہ اور راجا سیتا رام بغاوت

سے شبہے میں قتل کیے گئے۔ راجا راج بلب قید ہوا۔ اس کے بعد اس نے مرشد آباد کی بجائے مونگیر کو دارالخلافہ بنایا اور میر قاسم کا انگریزوں سے محصول کے بارے میں تنازعہ برپا ہوا۔ کلکتے میں مخالفت شروع ہوگئی اور جگت سیٹھ انگریزوں سے مل گیا۔ میر قاسم نے اسے بھی گرفتار کرا کے مونگیر بلایا اور وہیں نگرانی میں رکھا۔ ہندستان بھر میں جگت سیٹھ کے مقابلے کا دولت مند نہ تھا۔ مرہٹے اس کا دو کروڑ روپیہ اٹھا کر لے گئے مگر اس نے پروا نہ کی۔

اب میر قاسم کی انگریزوں سے علانیہ لڑائی چھڑ گئی۔ انھوں نے میر جعفر کو پھر نواب بنا دیا۔

میر قاسم نے اُن سازشی غداروں کو جو پہلے سراج الدولہ کی تباہی کے باعث ہوئے تھے اور اب بھی برابر انگریزوں سے ساز باز کیے جاتے تھے، قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ چناں چہ راجا رام نرائن، راجا راج بلب، رائے رایاں امید رائے، شاہ عبداللہ وغیرہ پتھر باندھ کر غرق کر دیے گئے۔ اس کے چند دن بعد جگت سیٹھ بھی اسی طرح ہلاک ہوا۔ مگر میر قاسم بھی انگریزی فوجوں اور سازش کے ہتھیاروں کا مقابلہ نہ کر سکا اور آخر بنگال چھوڑ کر نکل گیا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی میر جعفر بیمار ہوگیا اور اس کی حالت دن بدن خراب ہونے لگی۔ آخر ۱۴ رمضان بہ روز جمعرات ۱۱۷۸ھ کو مر گیا۔ نوٹا مانس لکھتے ہیں کہ مرنے کے وقت میر جعفر کی عمر ۷۴ سال کی تھی اور وہ جذام کے مرض میں مبتلا ہو کر مرا۔

بنگالے کی لوٹ

کرنل مالسن اپنی کتاب لارڈ کلائیو صفحہ ۱۰۷ میں ہماری معلومات میں حسب ذیل اضافہ کرتے ہیں :۔

کلائیو نے جعفر کو صوبے دار بنانے کے عوض یہ مطالبہ کیا کہ :

(۱) سراج الدولہ نے جو کچھ دینا کیا تھا ادا کیا جائے۔
(۲) کلکتے کے جنوب میں جس قدر زمین ہے کمپنی کو دی جائے۔
(۳) صوبے میں جس قدر فرانسیسی کوٹھیاں ہیں، وہ کمپنی کو دی جائیں۔
(۴) ہگلی کے پاس کوئی خندق نہ کھودی جائے۔
(۵) بہ وقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کی جائے۔
(۶) بہ طور تاوانِ جنگ ایک کروڑ پچاس لاکھ رُپیہ کمپنی کو ادا کیا جائے۔
(۷) دس لاکھ رُپیہ کلکتے کے دیسی باشندوں کو ملے۔
(۸) مندرجہ ذیل رقوم افسروں کو بہ طور انعام عطا ہوں :۔

فوج اور توپ خانہ	۵۰۰۰۰۰
مسٹر ڈریک	۲۸۰۰۰۰
کلائیو	۲۸۰۰۰۰
واٹس اور	۲۴۰۰۰۰
میجر اور کونسل کا ہر ایک ممبر	۲۴۰۰۰۰

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل رقوم دی گئیں :۔

کلائیو	۱۶۰۰۰۰۰

واٹس	۲۰۰۰۰۰
واٹس	۵۰۰۰۰۰
سک رافٹن	۲۰۰۰۰۰
لاشنگٹن	۵۰۰۰۰
کونسل کے ممبروں میں سے ہر ایک کو	۱۰۰۰۰۰
گرانٹ	۱۰۰۰۰۰

کلائیو نے میر جعفر کے عقب میں واٹس اور واٹس کو بھیجا کہ یہ رقوم وصول کی جائیں مگر جب دیکھا کہ خزانے میں اس قدر روپیہ نہیں ہے تو اس بات پر فیصلہ ہوا کہ نصف رقم ادا کی جائے اور باقی رقم تین سالانہ اقساط میں ادا ہو جائے۔ ۲۹ جولائی کو کلائیو مرشد آباد میں داخل ہوا اور میر جعفر کو علانیہ مسند نشین کیا اور ایک سو اشرفی کی نذر پیش کی۔ اس کے بعد کلائیو نے ترجمان کے ذریعے لوگوں کو مبارک باد دی اور نئے نواب کا وفادار رہنے کی تلقین کی۔

۳ جولائی کو امیں چند کا قصہ چھڑا۔ اسٹیفن نے اسے بتایا کہ جس عہد نامے میں اس کا نام درج تھا وہ جعلی تھا اس صدمے سے اس کا دماغ چل گیا مگر دماغی توازن میں یہ فرق چند ماہ رہا اس کے بعد وہ یاترا پر مالدہ چلا گیا لیکن سرکاری کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کاروبار جاری رہا۔

چند دنوں ہی میں صوبے دار کو معلوم ہو گیا کہ مسند پھولوں کی سیج نہیں، انگریزوں کے مطالبات پورا کرنے کے لیے اسے اپنی رعایا کا گلا گھونٹنا پڑا اور اس کے رفقا بھی اس کی گرفت

سے نہ بچ سکے۔ راجا دلبھ رام اس کا وزیرِ اعظم عہدے کو سلام کر کے اپنے محل کو چلا گیا۔ راجا پورنیہ خادم حسین خاں اور صوبے دار بہادر عظیم آباد نے بغاوت کر دی، بغاوت کی ہوا ڈھاکے تک جا پہنچی۔ میر جعفر نے انگریزوں سے مدد مانگی گو وہ جانتا تھا کہ اس کے عوض اسے کیا ادا کرنا پڑے گا۔ انگریز پہلے ہی اس کی توقع کر رہے تھے وہ جانتے تھے کہ مشرق میں طاقت کا انحصار جیب پر ہے جو میر جعفر خالی کر چکا تھا۔ آخر بہت ردّ و بدل کے بعد کلائیو فوج لے کر چل پڑا اور دونوں فوجیں راج محل پہنچیں تو کلائیو نے میر جعفر سے کہا کہ ہمارا حساب چکا دو نہیں تو ہم کوئی امداد نہ کریں گے۔ میر جعفر کے خزانے میں رُپیہ چیل کے گھونسلے میں ماس بن رہا تھا۔ طے پایا کہ خزانہ مرشد آباد ۱۲ ½ لاکھ رُپیہ تو نقد ادا کرے اور باقی بردوان کشن گڑھ اور ہگلی کے اضلاع کے مالیے سے پورا کیا جائے۔ انّیس لاکھ رُپے کا بار بھی انھی اضلاع پر ڈالا گیا کلکتے کے جنوب کی اراضیات بھی جو تا حال انگریزوں کے حوالے نہ کی گئی تھیں ان کا قبضہ بھی انگریزوں نے لیا جس کا سالانہ لگان ۲۲۲۹۵۱ رُپے تھا۔ کلائیو کو فرمان شاہی کا انتظار تھا اور وہ قلمی شورے کی تجارت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ کلائیو نے نواب سے اس کا ذکر کیا میر جعفر نے سمجھا کہ اس سودے میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے انگریزوں سے ایک پیسے کی امید نہیں لیکن بچارے میں انکار کی ہمت نہ تھی وہ مُرغ بہ قفس اندر تھا اس لیے اسے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ آخر ۱۴ اپریل کو شاہی فرمان شرف صدور لایا اور میر جعفر مرشد آباد اور

کلائیو کلکتے کو روانہ ہو گئے کلائیو ۲۴ مئی کو کلکتے پہنچا وہ جانتا تھا کہ رفقائے مشرق میں کسی غاصب کی زندگی محفوظ نہیں ہو سکتی۔ وہ بھانپ گیا کہ امرا نے اس انقلاب کو پسند نہیں کیا اور خاص کر میرن اور قاسم کی نیت اچھی نہیں اس لیے اس نے قاسم بازار میں ایک چھوٹی سی چھاونی ڈال دی اور کلکتے میں فورٹ ولیم تعمیر کرنے لگا۔ اسی زمانے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مطلع پر لڑائی کے بادل منڈلانے لگے اور کلائیو کو اندیشہ ہوا کہ کہیں بنگالے کے امرا مع میر جعفر کے یا اس کے بغیر بنگالے کو آزاد کرنے کی سعی نہ کریں میر جعفر کا خزانہ فوارہ کا خزانہ بن رہا تھا اس کے امیر برسر پرخاش تھے۔ ساہوکاروں کی روش معاندانہ تھی کلائیو کو ایک دفعہ پھر میر جعفر کی امداد کو جانا پڑا۔ معاوضے میں کلائیو نے میر جعفر سے کلکتے کا تمام جنوبی علاقہ جاگیر لے لیا کلائیو ان الجھنوں میں پھنسا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ میر جعفر نے ولندیزیوں سے سازش شروع کی اور عہد و پیمان ہوا ہے۔ یہ سازش نامہ ۱۷۵۸ء میں مکمل ہو گیا اور میر جعفر اور ولندیزیوں نے انگریزوں کو بنگال سے نکال دینے کا تہیہ کیا۔ جون ۱۷۵۹ء کو ولندیزیوں نے اطلاع دی کہ لڑائی کے لیے بالکل تیار ہیں اکتوبر میں ولندیزیوں کے چار ہیبت ناک جہاز چن سواں میں آکر لنگر انداز ہوئے جن کے ساتھ زبردست فوج تھی اور پشت پر میر جعفر تھا۔ کلائیو خطرے میں کھیل رہا تھا مگر اس پر بھی اس نے میر جعفر کو ولندیزیوں سے ملاقی ہونے کی اجازت دے دی جب کہ اسے میر جعفر کی بے ایمانی

کا یقین واثق ہو چکا تھا۔ ولندیزیوں کو شکست ہوئی تو میرن نے حاضر ہو کر سلامی اتاری اور بیان کیا کہ وہ کلائیو کی مدد کو آیا ہے۔ کلائیو مسکرا کر خاموش ہو گیا اور اس مُردے کو مارنا عبث خیال کیا۔

اس سے انکار نہیں کہ میر جعفر کی زندگی گدی نشینی سے لے کر تادمِ مرگ زندہ رہنے کے قابل نہ تھی۔ کلائیو نے صرف سراج الدولہ کو معزول نہ کیا بلکہ اس کے جانشینوں کو بھی حکومت کرنے کے قابل نہ چھوڑا۔ اس کی زر طلبی، اس کے قلمی شورا پر قبضہ کرنے نے میر جعفر کو شاہ بے زر بنا دیا تھا۔

۲ جولائی ۱۷۶۰ء کو میرن بجلی گرنے سے مر گیا اور اس واقع نے بنگالے کی حکومت کو بدل ڈالا اور اس کے داماد میر قاسم نے انگریزوں سے سازش کر کے میر جعفر کو معزول کرایا اور خود گدی نشین ہوا۔ میر جعفر ۱۹ ستمبر کو کلکتے چلا گیا، ۱۰ نومبر کو میر قاسم بھی بھاگ کر لکھنؤ چلا گیا اور ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بکسر کی لڑائی میں شکست کھائی۔ میر جعفر خود اپنی نگاہوں میں گر گیا تھا اسے لوگ کمپنی کے ملازموں کا بنک کہتے تھے جو اس سے جس قدر روپیہ چاہیں اور جب چاہیں، لے سکتے تھے۔

ڈاکٹر باسو (جلد اوّل صفحہ ۲۰۷) یوں کہتے ہیں: پلاسی کی جنگ ایک فریب کاری کو کامیاب کرنے کے لیے کی گئی جس میں انگریزی فوجوں نے شامل ہو کر بدنامی حاصل کی۔ ان کا مدّعا بنگالے پر قبضہ کرنے کا نہ تھا بلکہ کسبِ زر کے لیے یہ سب کچھ ہوا اس لیے کلائیو کوئی فاتح نہ تھا بلکہ ہندستانی اسے اپنی سادہ لوحی کی

وجہ سے اپنا دوست سمجھتے تھے۔ کلائیو کو سمجھنے کا جسے موقع ملا وہ صرف میر جعفر تھا۔ اپنے آخری دنوں میں وہ اس دن کو روتا تھا جب وہ عنکبوت کے اس جالے میں پھنسنے پر رضامند ہوا جو انگریزوں نے اس کے گرد تن دیا اور جس میں وہ ایک نادان مکھی کی طرح جا پڑا۔ غدار ہمیشہ قابلِ نفرت ہوتے ہیں۔ ان میں اخلاق کی کمزوری نمایاں ہوتی ہے اور ذہنی قوت کم زور، اس لیے وہ کبھی مدبر نہیں ہو سکتے۔ انسانی ہمدردی کی ان پر چھاؤں تک نہیں پڑتی اور ان کی زندگی کا مقصد صرف ذاتی اغراض کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس قسم کا انسان میر جعفر تھا اور اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر ملک داری سے مطلق آگاہ نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ اس نے حکم رانی کی تربیت ہی حاصل نہ کی تھی۔

۱۷۵۸ء میں کلائیو نے میر جعفر اور رام نراین کی صلح کرائی اور سات لاکھ روپیہ حقِ خدمت وصول کیا۔ عظیم آباد سے کلائیو مئی ۱۷۵۸ء کو کلکتے چلا گیا اور میر جعفر چند دن بعد واپس ہوا مگر میر جعفر کا دل خوش نہ تھا۔ اس نے ایک عفریت کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا جو اب اس کا خون پی رہا تھا۔ جب اس نے انگریزوں سے سازش کی، درحقیقت اسے معلوم نہ تھا کہ مرشد آباد کے خزانے میں کس قدر روپیہ تھا۔ اس نے رقومِ کثیر دینے کے وعدے تو کر لیے لیکن مسند نشین ہونے پر اسے معلوم ہوا کہ خزانے میں اس کے اندازے سے بہت کم روپیہ ہے اور وہ انگریزوں کو موعودہ رقوم ادا نہیں کر سکتا۔ اسے یقین تھا کہ خزانے کی اس

حالت کے پیشِ نظر کلائیو اور اس کے رفقا بقایا سے درگزر کریں گے۔ مگر انھوں نے قلمی شورہ کی تجارت پر قبضہ کرکے اور محصولات معاف کرا کے میر جعفر کو اور کنگال کر دیا۔ وہ یہ رقوم کہاں سے ادا کرتا لیکن انگریز ہندستان میں تفریحِ طبع یا جاترا کو نہیں آئے تھے۔ وہ زر پرست تھے اور روپیہ پیدا کرنے کے لیے وہ اس مصیبت کو جھیلتے تھے اس لیے اس کی منت و سماجت اس کی دلائل و منطق سب بے کار گئے اور انگریزوں کا مطالبہ جاری رہا۔ شائی لاک کی طرح وہ اپنے مطالبے پر قائم رہے اس لیے میر جعفر کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ لگان کی وصولی کے پروانے لکھ دیتا۔

رعایا نے اس قدر روپے کا خزانے سے نکل جانا پسند نہ کیا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ جو روپیہ انھوں نے ٹیکس ادا کرکے کئی سال میں جمع کیا اور جو انھی میں صرف ہونا تھا اسے ایک بیرونی قوم لے جا رہی ہے۔

آورمی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے (جلد دوم صفحہ ۱۸۷)

۲۶ جولائی ۱۷۵۷ء کو ۷۲۷۱۶۶۶ روپیہ کمپنی کو وصول ہوا۔ یہ روپیہ سات سو صندوقوں میں بند تھا اور ایک سو کشتیوں پر لد کر آیا۔ انگریزوں نے اس قدر روپیہ کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا.....

یعنی انگریزوں نے اس کا خزانہ خالی کر دیا۔

یہ تھی میر جعفر کی مالی حالت۔ جہاں تک آزادیٔ عمل کا تعلق تھا اسے انگلی تک ہلانے کی اجازت نہ تھی۔

میر جعفر اپنے عزیزوں کو فوج میں عہدے دینے کے لیے

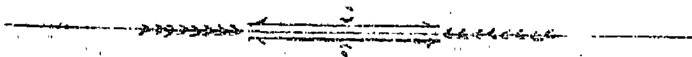
کچھ ردوبدل کرنا چاہتا تھا لیکن کلائیو نے روک دیا کہ اس سے امنِ عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ یہی باتیں تھیں جو اسے انگریزوں سے قطع تعلقات پر آمادہ کرتی تھیں، فوج کو کئی مہینے سے تنخواہ نہ ملی تھی سپاہیوں میں بے چینی پھیل رہی تھی مگر وہ بے بس تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر فرانسیسیوں میں کچھ بل بوتا ہوتا تو میر جعفر ضرور انگریزوں سے بغاوت کر دیتا۔ اس زرستانی کے علاوہ میر جعفر سے کلائیو نے ایک جاگیر حاصل کی جس کی سالانہ آمدنی ۰۰۰ ، ۱۹۵ روپے تھی۔ ڈاکٹر باسو کہتے ہیں کہ کلائیو نے میر جعفر کو مجبور کر کے یہ جاگیر لی۔ ۳ جولائی کو میرن مر گیا۔ کلائیو میرن کے سخت خلاف تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ یہ آدمی خوف ناک ہے اور اسے ہرگز میر جعفر کا جانشین تسلیم نہ کیا جائے گا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ میرن انگریزوں کے سخت خلاف تھا مگر میر جعفر کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور اس کے بعد صوبے داری کا مستحق تھا۔ اگرچہ یہ انقلاب رونما ہونے کے وقت میرن زندہ ہوتا تو اس کا حق صوبے داری کے لیے فائق تھا۔ ان حالات میں میرن کا ایک حادثے کی نذر ہونا لازماً یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ اسے کسی طریق سے ہلاک کیا گیا تھا۔ عام روایت یہ ہے کہ اس پر بجلی گری۔ لیکن ڈاکٹر باسو اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ میرن کو قتل کیا گیا اور اس میں کرنل کلائیو کا ہاتھ تھا۔ جب میرن کے ناگہانی مر جانے سے میر قاسم کو مسند نشین کرنے کا موقع ہاتھ آیا تو اس انقلاب کے عوض بھی انگریزوں کو بیس لاکھ روپے اور ٹکسال کھولنے کی اجازت ملی۔ اس ٹکسال میں سے پہلا روپیہ ۱۹ اگست ۱۷۵۷ء کو

نکلا۔ مگر یہ روپیہ رواج میں نہ آسکا۔

میر جعفر کے آخری دن

کوئی غدار کبھی خوش حال نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ان لوگوں کی نظروں سے بھی گر جاتے ہیں جن کی خاطر بے ایمانی کرتے ہیں۔ یہی حالت میر جعفر کی تھی اس کی زندگی قابل رحم تھی۔ انگریزوں نے اس سے سیڑھی کا کام لیا اور جب دوسری منزل پر پہنچ گئے تو انھوں نے اس سیڑھی کو ٹھوکر مار کر پرے گرا دیا۔ وہ نہایت ذلت کے ساتھ ان کی فرماں برداری کرتا رہا اور انھوں نے اس کی زندگی کے آخری لمحے اجیرن کر دیے۔ اس کے آخری دنوں میں جب اس کے پاس کچھ نہ رہا تھا بنیے کی طرح پانچ لاکھ کی فوری ادائگی کا سخت مطالبہ کیا اور ایلچیوں نے اس کا ناک میں دم کر دیا۔ سر ولیم ہنٹر (STATISTICUL ACIOUNT OF BENGAL VAL. P. 191) میں لکھتے ہیں: "اس کی موت جنوری سنہ ۱۷۶۵ء کو مرشد آباد میں واقع ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انگریزوں کے اس مطالبے نے جلد در گور کیا جو وہ اپنے بقایا کے لیے نہایت سختی سے کرتے تھے۔"

اس کے دم واپسیں پر کسی مسلمان نے اس کے ساتھ کسی ہم دردی یا افسوس کا اظہار نہیں کیا صرف نند کمار اس کے پاس رہا اور کہتے ہیں اس نے میر جعفر کو مرنا شت پلایا اور اسی سے اس کو غسل دیا۔ جس پر غلام حسین خاں اپنی کتاب میں میر جعفر پر کفر کا فتوا صادر کرتا ہے۔



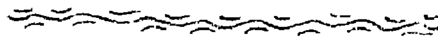
متعلّقات

متعلقات

یاد نہیں بلکہ اب تو سولہ سال ہونے کو آئے جب یہ کتاب لکھنا شروع ہوئی، اس عرصے میں معلومات میں اضافہ ہوتا رہا۔ جو متن میں سما سکے انھیں اس طرح ٹھکانے لگایا مگر جن کا اضافہ کتاب کو از سرِ نو لکھنے کی دعوت دیتا تھا انھیں یک جا جمع کر کے بہ طور ضمیمہ شامل کر دیا۔

شامل تو ہیں مگر سولہ برس کی محنت بھی تو کوئی معنی رکھتی ہے اسے نئے سانچے میں ڈھالنا کئی سال چاہتا ہے اور اتنی ہمت نہیں

محمد عمر (نور الٰہی)



(۱) راجا رام نراین کا حسنِ عقیدت

جب نواب شہید کی شہادت کی خبر پہنچی تو عظیم آباد میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ سارا شہر ماتم کدہ بن گیا راجا رام نراین صوبے دار عظیم آباد و پٹنہ نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے سر اور داڑھی پر راکھ ڈالی اور ننگے پانو ننگے سر دیوانہ وار بازاروں میں روتا پھرتا تھا۔ اس کے پیچھے ایک بے پناہ ہجوم نے کہرام مچا رکھا تھا۔ کوئی آنسو بہاتا کوئی سینہ کوبی کرتا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محرم کا تعزیہ نکل رہا ہے۔ راجا رام نراین روتے روتے اپنا یہ شعر پڑھتا تھا جسے اب تک اہل عظیم آباد نے فراموش نہیں کیا ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری

(تذکرہ میر حسن ص ۱۷۳)

اب بنگالے کی اس عظیم الشان شخصیت کی اس عقیدت کو مہاراجا موہن لال کی عدیم المثال جاں نثاری کے ساتھ ملا کر دیکھیے تو آپ اندازہ لگائیں گے کہ نواب شہید کی کس قدر محبت اور عزت ہندوؤں کے دل میں تھی۔

(۲) نواب اشرف النسا بیگم

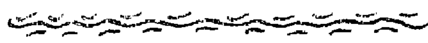
نواب علی وردی خاں کی واحد محل ایک بیدار مغز، مدبرہ

منتظم اور فنِ حرب کی ماہر خاتون تھی، حکومت کی سیاسی اُلجھنوں کو کھولنا اسی کے ناخنِ تدبیر کا مرہونِ منت تھا۔ بالاسوری جنگ میں اس بیگم نے برسرِ میدان دادِ شجاعت دی اور متوقع شکست کو فتح میں بدل دیا۔ ایک دفعہ بڑھتے بڑھتے دشمنوں کے نرغے میں پھنس گئی اور مصاحب خاں کی ہمت سے وہاں سے نکلی۔ نواب شہید کی تربیت، تعلیم اور حکمرانی کی مشق اسی خاتون کی کڑی نگرانی میں ہوئی جو ایک منٹ کے لیے بھی اسے نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔ علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ ایک ضخیم دیوان فارسی کا تیار کیا کہ اس وقت اظہارِ قابلیت کا یہی واحد آلہ کار تھا۔ حال میں پروفیسر منظور الحق اسے منصۂ شہود پہ لائے ہیں۔

ایسی نگہداشت میں کس طرح ان سوقیانہ حرکات کا ارتکاب ہو سکتا ہو جو کوتاہ نظری ان سے منسوب کرتی ہو جن کا اظہار ایک بنگالی ڈراما نگار رائے بہادر بنکم چندر چیٹرجی نے اپنے رسوائے عالم بنگالی ناول "ان کیرشیش" میں کیا ہو۔ ناول میں تضاد کو اس قدر دخل حاصل ہو کہ ساری کہانی بلکہ مصنف سے گھن آتی ہو۔

میر جعفر نے نواب شہید کی وفات کے بعد آپ کو ڈھاکہ زندان میں قید کر کے بہت اذیت پہنچائی اور اپنے نمک حرامانہ گناہوں میں اور اضافہ کیا۔ بیگم نے ایک طویل عرصہ بندی خانے میں گزارا اور نواب شہید کی اکلوتی بچی اور ان کی وفاشعار بیوہ کا دل بہلاتی رہیں جو کہ ان کے ہمراہ قید تھیں۔ جب کلائیو کے کان میں یہ بھنک پڑی کہ لوگ اس ناروا سلوک پر بگڑ رہے ہیں اور کمپنی پر حرف

آرہا ہے تو اس نے اپنے گدھے کا ٹینٹوا دبایا۔ وہ قید سے چھوٹیں اور مرشد آباد گئیں۔ ان کے گزارے کے لیے تین سو روپے کی رقم مقرر ہوئی جو کبھی ان کا جاروب کش لیتا تھا۔ (نیرنگ خیال جولائی سنہ ۱۹۳۴ء)



(۳) جگت سیٹھ

ریاست جے پور کے ایک غیر معروف گاؤں "ٹوگو" میں ایک مارواڑی جینی مسمی ہیرانند ساہو آٹے دال کی ایک چھوٹی سی دکان کرتا تھا۔ اس کی بکری اس کی شکم پری کے لیے کافی نہ تھی۔ جب فاقہ کشی کی نوبت آگئی تو وہ سنہ ۱۶۵۰ء میں پٹنہ چلا گیا اور وہاں دکان داری کرنے لگا۔ اس کے سات بیٹے تھے ان میں سب سے بڑا مانک چند پٹنہ سے ڈھاکہ گیا جہاں اس وقت صوبے کا ناظم رہتا تھا۔ جب نواب مرشد قلی خاں نے مرشد آباد میں سکونت اختیار کی تو مانک چند بھی نقل مکان کر گیا۔ یہاں اس نے ساہوکاری شروع کی، اور نواب اس کی پرورش کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ خزانے کا اہتمام، خراج کی ادائی اور ٹکسال کی نگرانی اس کے سپرد ہوئی وہ ذرّے سے آفتاب بن گیا۔ سنہ ۱۷۱۵ء میں نواب کی سفارش پر فرخ سیر بادشاہ دہلی نے اسے سیٹھ کا خطاب دیا اور سنہ ۱۷۲۴ء میں بادشاہ محمد شاہ نے اسے جگت سیٹھ کے خطاب سے نوازا۔ اور بعد میں یہ خطاب ان کی خاندانی وراثت بن گیا۔ نواب علی وردی خاں نے مانک چند کے بیٹے فتح چند کو "رائے رایاں" اور اس کے

دوسرے بیٹے کے بیٹے دیا چند کے بیٹے سروپ چند کو مہاراجا کے خطابات سے سرفراز کیا۔ ان کی سرمایہ داری کا یہ حال تھا کہ ۱۷۴۷ء میں انھوں نے انگریزوں کو بارہ لاکھ روپیہ بطور قرض دیا۔ اس سے تین سال قبل مرہٹے ان کے محل سے دو کروڑ روپے لوٹ کر لے گئے لیکن ان کو پروا تک نہ ہوئی۔ وہ سونے کی تجارت کے اجارہ دار تھے۔ انگریزوں میں ان کا بہت رسوخ تھا ۱۷۵۹ء میں مہتاب رائے جگت سیٹھ کلکتے گیا تو کمپنی نے اس کی خاطر مدارات پر سترہ ہزار روپیہ صرف کیا۔ نواب شہید کے خلاف سازش میں دونوں بھائیوں نے نمایاں حصّہ لیا اور غدّاری کا داغ ان کے ماتھے پر لگا۔ ۲۱ اپریل ۱۷۶۳ء کو میر قاسم صوبے دار وقت نے جگت سیٹھ مہتاب رائے اور راجا سروپ چند کو نظر بند کر لیا اور پھر دونوں بھائیوں کی گٹھری بنا کر قلعہ سینگر کی فصیل سے دریا میں پھینک کر غرق کر دیا۔ (موزمدار ص ۱۵۳)

ڈاکٹر باسو کہتے ہیں کہ اس سے قبل بھی ان کی سازش کا انکشاف ہوا تھا۔ نواب کو لازم تھا کہ اسی وقت انھیں قید کر لیتا مگر اس نے درگزر کیا۔ (باسو جلد اوّل ص ۳۴۵)

جگت سیٹھ کا ایک نوکر تھا جسے چونی لال کہتے تھے۔ جب اسے دریا میں پھینکنے لگے تو چونی لال نے ہاتھ جوڑے، پاؤں پڑا کہ اسے بھی سیٹھ کے ساتھ باندھ کر پھینک دیا جائے یا پہلے اسے غرق کر دیا جائے لیکن کسی نے نہ مانا تو وہ خود دریا میں کود کر مر گیا۔

(نوٹا بانس جلد دوم ص ۴۹۳)

اچھے نمک حرام کا ایسا نمک حلال نوکر؟

(۴) ہردل عزیزی

جب نواب شہید کے جام شہادت پینے کی خبر نواب بدیع الزماں (زمین دار و جاگیردار) بیربھوم کو پہنچی تو وہ اسی وقت فقیرانہ لباس پہن کر تارک الدنیا ہوگیا۔ اس نے علاقہ اپنے بیٹے اسد زماں خاں کے حوالے کیا جو اس کی ہندو رانی کے بطن سے تھا اور آپ جنگل کو نکل گیا۔

(۵) ہماں خانہ شہید

لغوی تعریف اور فقہ کے مطابق وہ آدمی شہید کہلاتا جو امر حق کی حمایت میں راہِ خدا میں جان دے یا بے قصور مارا جائے۔ نواب شہید کا سارا خاندان اور وہ خود اس تعریف کی ذیل میں آتے ہیں :۔

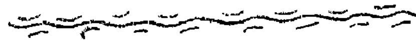
(۱) نواب شہید کے والد = نواب زین الدین احمد خاں عظیم آباد میں۔
(۲) ” ” کی والدہ = امینہ بیگم ڈھاکہ کے دریا میں۔
(۳) ” ” کا بھائی = مرزا مہدی مرشدآباد میں۔
(۴) ” ” خالہ گھسیٹی بیگم = ڈھاکہ کے دریا میں۔

(۶) مکافات

”آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے“ (غالب)

جن نمک حراموں نے نواب شہید سے غداری کی ان کی دنیا ہی میں عاقبت خراب ہوئی۔

(۱) غدارِ اعظم میر جعفر مرضِ جذام میں مبتلا ہو کر بڑی ذلت سے مرا۔
(۲) میرن پر بجلی گری اور اسے روسیاہ کرکے ہلاک کیا۔ عین اسی دن جس دن امینہ بیگم کو ڈھاکہ دریا میں غرق کیا گیا۔
(۳) مہاراجا سروپ چند اور مہتاب رائے جگت سیٹھ کو میر قاسم
(۴) راجا راج بلب : میر قاسم نے غرق کیا۔
(۵) مہاراجا ننہ کمار : پھانسی دیا گیا۔
(۶) لارڈ کلائیو : خودکشی کی۔
(۷) شمشیر خاں قاتل زین الدین خاں : ہلاک ہوا۔
(۸) امین چند دیوانہ ہو گیا۔



(۷) قبرستان

(الف) خوش باغ

یہ نواب علی وردی خاں کا خاندانی قبرستان تھا۔ دریائے بھاگیرتی کے کنارے مرشدآباد میں واقع ہے۔ یہاں نواب شہید نواب علی وردی خاں کے پہلو میں آسودہ ہیں، دونوں قبریں سنگ مرمر کی ہیں۔ اس قبرستان کے ساتھ کچھ زمین وقف ہے جس کی آمدنی سے مرمت وغیرہ ہوتی رہتی ہے۔ اس قبرستان کے احاطے میں نواب شہید کی بنا کردہ ایک خوبصورت مسجد ہے اس میں اس ترتیب سے مندرجہ ذیل قبریں ہیں :-

مرزا مہدی — سراج الدولہ | لطیف النسا بیگم — علی وردی خاں | اشرف النسا بیگم

(ب) روشنی باغ

مرشدآباد میں بھاگیرتی کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ اس میں نواب شجاع خاں کی قبر ہے۔ یہ مقبرہ شجاع نے مع ایک مسجد کے خود تعمیر کرایا تھا۔ یہ دہلی کی رسم کی پیروی تھی۔ اس مسجد میں قرآن شریف کی ایک جلد ہے جس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ یہ حضرت علیؓ کے قلم مبارک کا تحریر ہے۔

(ج) جعفر گنج

اس قبرستان میں میر جعفر اور اس کا خاندان سوا میرن کے دفن ہے۔ بیگمات کی قبریں ایک چار دیواری کے اندر ہیں۔

(د) موتی محل

یہ نواب نوازش محمد خاں کا محل ہے۔ اس میں شہامت جنگ اور اکرام الدولہ کی قبریں ہیں سنگ مرمر کی ایک مسجد بھی ہے جس میں نواب شہامت جنگ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن موجود ہے۔

میرن کی قبر

میرن کی قبر راج محل میں اس مقام کے محاذی واقع ہے جہاں

نواب شہید گرفتار ہوئے تھے۔

میر مدن شہید رحمۃ اللہ علیہ

یہ وفا کا مجسمہ پلاسی کے قریب موضع فرید پور میں بابا فرید کی خانقاہ میں دفن ہے۔ (موزمدار صفحہ ۲۴)

(۸) مُرشد آباد

وثوق سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مُرشد آباد کا ڈھول کس نے ڈالا۔ روایت ہے کہ عہدِ اکبری میں اس کی بنیاد پڑی اور اس کا نام مکوسا آباد رکھا گیا۔ چوں کہ یہ مقام آب و ہوا اور انتظامِ مُلک کے لحاظ سے ڈھاکہ سے بہتر تھا اس لیے مُرشد قلی خاں نے اسے اپنا مستقر بنایا اور اس کا نام مُرشد آباد قرار پایا۔ اس سے پہلے اسے مقصود آباد بھی کہتے رہے۔ یہ شہر سری نگر کشمیر کی طرح دریائے بھاگیرتی کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ بہ قول کلائیو یہ شہر آبادیٔ وسعت اور دولت کے لحاظ سے لندن کا جواب ہے۔ اس شہر کے ایک محل کی نسبت وہ کہتا ہے کہ اس میں یورپ کے تین بادشاہ مزے سے رہ سکتے ہیں۔ جب کلائیو اس شہر میں داخل ہوا تو اس کی آبادی دیکھ کر دنگ رہ گیا اور اس نے کہا کہ اس شہر کی آبادی اس قدر ہے کہ اگر اس کے باشندے چاہیں تو اینٹ پتھر مار کر ہمیں بنگالے سے نکال باہر کر دیں۔ اس کی چونگی کی آمدنی ۳۱۱۶۰۰ روپے سالانہ تھی۔

اس سے تجارت کا اندازہ لگالیں۔ ٹکسال کی فیس تین لاکھ دس ہزار رُپے سالانہ تھی، مالیے کا ذکر ہی کیا ہے بے شمار تھا۔ اس شہر میں ہر فن کے ماہر موجود تھے جو دہلی میں تھا وہ یہاں بھی موجود تھا صرف کایستوں کے سات سو گھر آباد تھے۔ سات سو مسجدیں، سراج الدولہ کی زندگی تک آباد رہیں۔ اس کی آبادی کئی لاکھ تھی سنہ ۱۸۰۵ء میں اس کی آبادی ایک لاکھ پینسٹھ ہزار رہ گئی اور سنہ ۱۹۰۲ء کی مردم شماری نے بتایا کہ اب پندرہ ہزار ہے، شہر کی وسعت ۹ میل ہے۔

(موزمدار ص ۷)

(۹) شجرے

(الف) مرشد قلی خاں

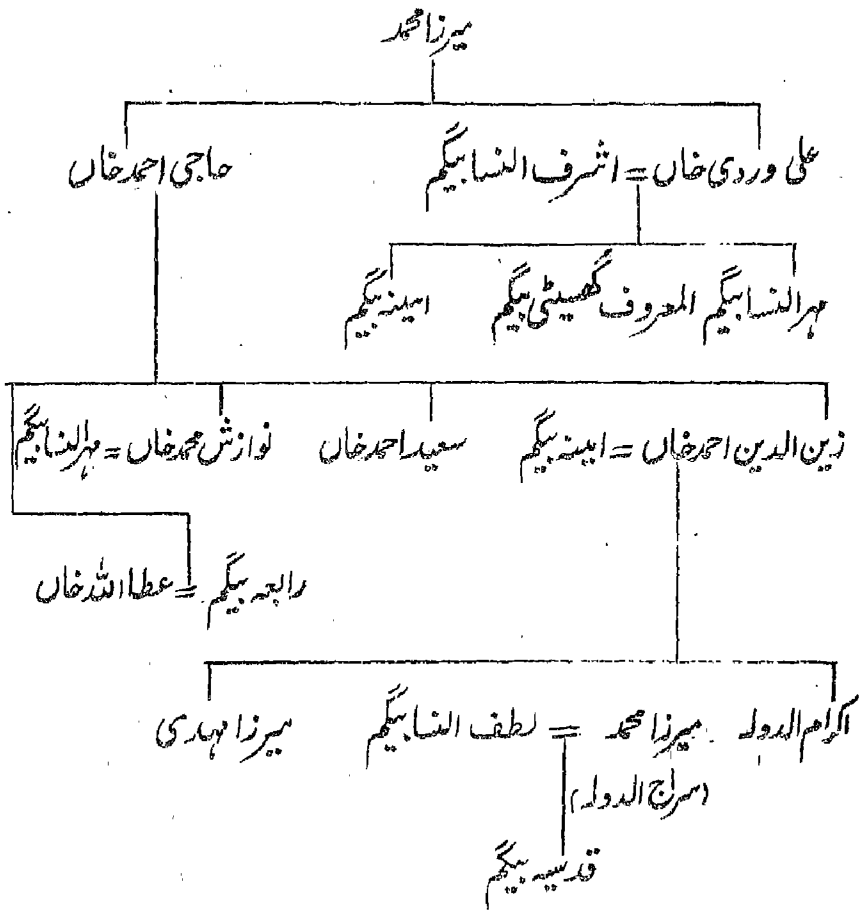
مرشد قلی خاں = نوروز بانو بیگم

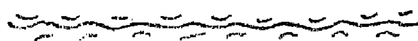
عظمت النساء بیگم = شجاع خاں

- سرفراز خاں
  - آغا میرن
  - میرزا ابرہان
  - میرن امانی
  - میرزا مغل
  - حفیظ اللہ
    - نادرہ بیگم = فیض اللہ خاں
  - شکر اللہ
- نفیسہ بیگم = رضی خاں ۔ د

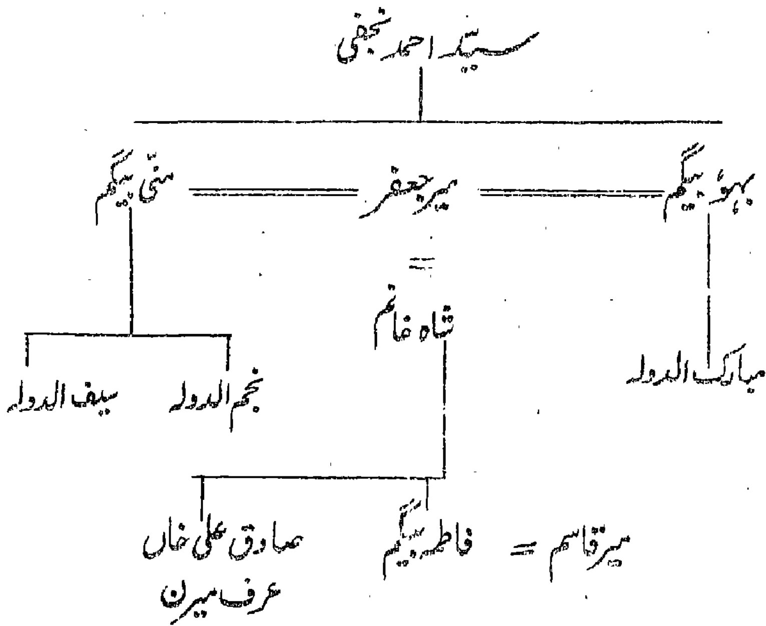
(موزمدار ضمیمہ)

(ب) علی وردی خاں

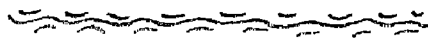




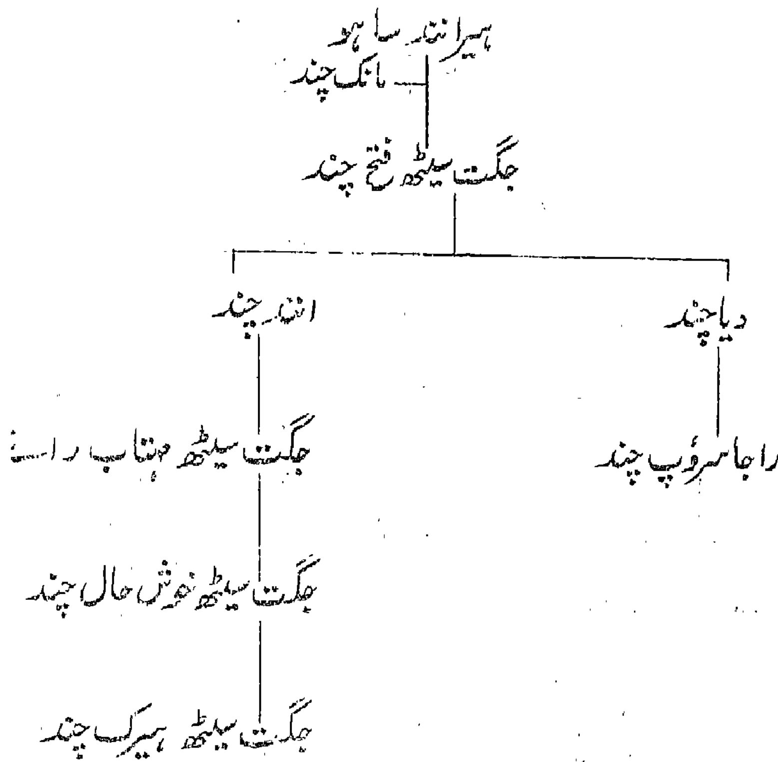
(ج) میر جعفر



(موزمدار)



(د) جگت سیٹھ



اس کے بعد جگت سیٹھ کوئی نہ بنا۔

(موزم دار صـ۱۵۶)



(۱۰) سیر المتاخرین

یہ کتاب فارسی میں ایک شخص مسمیٰ سید غلام حسین طباطبائی (میر جعفر بھی طباطبائی تھا) نے انگریز افسروں کی سرپرستی میں ۱۷۸۰ء میں لکھی۔ یہ دعوا سراسر باطل ہے کہ اسے نوابان صوبہ بنگالہ کے دربار میں رسوخ حاصل تھا وہ تو اپنی بے ایمانیوں کی بدولت ہر نواب کے دربار میں سے بہ یک بینی و دوگوش بدر ہوا جس کا اسے خود اعتراف ہے البتہ انگریزوں کی ناک کا بال تھا اور ان سے اس کے ایمان کا سودا ہو گیا۔ اس وقت کے انگریز چاہتے تھے کہ سراج الدولہ کو خوب بدنام و رسوا کیا جائے تاکہ اس سے کسی کو ہمدردی نہ رہے اور جو بدسلوکی اس سے کی گئی کسی کی آنکھ میں نہ کھٹکے۔ دراصل اس کتاب کی تدوین ہیسٹنگز کی سرپرستی میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب تک ہندستان میں رہا اسی دھن میں رہا کہ کسی طرح اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے۔ اس کتاب کے ان حصوں کو دیکھیے جن کا تعلق سراج الدولہ سے ہے تو آپ کو معلوم ہو کہ اس غدار مورخ نے انگریزوں کی مدح اور سراج الدولہ اور اس کے خاندان کی قدح میں مبالغے سے کس قدر دل کھول کر کام لیا ہے اور جس "کا کھائیں اس کا گائیں" پر کس مستعدی سے عمل کیا ہے اور ستم ظریفی یہ کہ خود ہی اپنی تردید میں واقعات پیش کر دیے ہیں۔ ایک طرف اثر و رسوخ کا دعوا ہے دوسری طرف آپ ہی اس بات کا رونا روتے ہیں کہ نواب زین الدین خاں، نواب شہامت جنگ یہاں تک کہ نواب شوکت جنگ نے اس کی کیا

اس کے رشتے داروں کی رفاقت گوارا نہ کی۔ وہ خود تسلیم کرتا ہو کہ سراج الدولہ نے اسے اور اس کے رشتے داروں کو مرشد آباد سے بدر کیا۔ عدم اعتماد کا یہ عالم ہو کہ میر جعفر اور میرن تک اس کی ریشہ دوانیوں کی تاب نہ لا سکے۔ سچ تو یہ ہو کہ طباطبائی دوسرے طباطبائی (جعفر) سے بھی غدّاری میں آگے نکل گیا۔ اس نے بہ یک وقت شہزادہ عظیم الشان راجا رام نرائن کے حق میں اور ساتھ ہی ان کے خلاف سازش میں حصّہ لینا شروع کیا۔ مقصد یہ تھا کہ تینوں میں سے جو کام یاب ہو اس سے فائدہ اٹھایا جائے اس لیے اِدھر کی بات اُدھر۔ اُدھر کی اِدھر پہنچاتا تھا۔ اگر ہندستانی غدّاروں کی تاریخ لکھی جائے تو عجب نہیں اُس کا افتتاح اس مورّخ کے نام سے ہو۔ یہ سب کچھ خود اس کی تحریر سے ثابت ہوتا ہو اور نوٹا مانس نے آپ کی شان میں صرف اتنا کہا ہو کہ غلام حسین خاں نے محمد امین خاں پر جو سیّد کشی کا الزام لگایا ہو اسی سے وہ ساقط الاعتبار ہو گیا اور اس میں مکّاری دغابازی اور کمینگی کی جھلک نظر آنے لگی۔



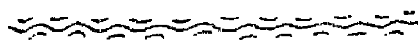
(۱۱) نوٹا مانس

وارن ہیسٹنگز کو جب سیر المتاخرین کا ترجمہ کرنے کے لیے کوئی انگریز یا بنگالی نہ ملا تو آخر اس کام کا بیڑا ایک فرانسیسی (RAYMOND) نے اٹھایا جس نے ۱۷۸۹ء میں اس ترجمے کو چار جلدوں میں ختم کیا۔ یہ کتاب ہیسٹنگز کے نام سے منسوب کی گئی۔ اشاعت سے پہلے اس کی جلدیں فروخت ہو گئیں۔ ریمانڈ نے یہ کتاب نوٹا مانس

نے فرضی نام سے لکھی۔ وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اسے اندیشہ تھا کہ اسے بھی لوگ اس نظر سے نہ دیکھیں جس سے کہ وہ طباطبائی کو دیکھتے ہیں۔

ریمانڈ نے مذہب اسلام قبول کرکے اپنا نام مصطفےٰ رکھا تھا بلکہ دراصل وہ طباطبائی کا ہم مذہب تھا۔

ترجمے میں مصروف تھا کہ ہیسٹنگز کو واپس جانا پڑا۔ اس خبر کو سن کر اس کے اوسان جاتے رہے کیوں کہ اسی انگریز حاکم کی امداد پر اس کا گزارا تھا۔ وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ ۲۵ سال سے اس کے دوستانہ تعلقات ہیسٹنگز سے چلے آتے تھے اور اس کے تبادلے نے اس کی کمر توڑ دی۔ مدت تک کمپنی کے جاسوس کے فرائض ادا کیے۔ یہ ہے نوٹا مانس مترجم جس نے ترجمہ کیا اور بے شمار حواشی ایزاد کیے اور سراج الدولہ کو بدنام کرنے میں طباطبائی کے کان کترے ہیں۔



(۱۳) لارڈ کلائیو

رابرٹ کلائیو ۲۹ ستمبر ۱۷۲۵ء کو بہ مقام سٹائچی پیدا ہوا۔ تین سال کی عمر تھی جب اسے مانچسٹر میں تعلیم و تربیت کے لیے بھیجا گیا۔ اتنی چھوٹی عمر میں اسے خالو کے پاس کیوں بھیجا گیا اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس کے بعد کئی مدرسوں میں بھیجا گیا مگر اس کی دلیری اور نافرماں برداری ہر اسکول میں نمایاں رہی۔ وہ تعلیم سے جی چراتا تھا۔ مدرسوں میں جو لڑائی جھگڑے ہوتے تھے ان کا سرغنہ

یہی ہوتا تھا۔ اس کی دست درازی کی ایسی دھاک بیٹھی تھی کہ معلم بھی اس سے گھبراتے تھے۔ اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اس کی طبیعت کے مطابق تھی جو اس نے ۱۷۴۴ء میں اختیار کی اور وہ مدراس آ پہنچا، جب کہ اس کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ کلائیو کے آنے سے پہلے ہی دکن میں شورش شروع ہو چکی تھی جس میں فرانسیسیوں اور انگریزوں نے معاندانہ حصہ لینا ضروری خیال کیا اور اس سلسلے میں جو جنگ شروع ہوئی اس میں کلائیو نے بڑا نام پیدا کیا۔ اس لڑائی سے فارغ ہو کر اس نے ۱۹ سے شادی کی۔ مگر اس کی صحت روز بہ روز خراب ہوتی جاتی تھی اس لیے وہ ۱۷۵۳ء میں رخصت پر انگلستان چلا گیا۔ جہاں اس کی خدمات عالیہ کی بہت قدر ہوئی۔ کلائیو کافی روپیہ ہندستان سے ساتھ لے گیا اس لیے اس کا ارادہ پھر ہندستان جانے کا نہ تھا۔ اس نے پارلیمنٹ کا ممبر بننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور ڈائرکٹروں نے اسے لفٹنٹ کرنل کا منصب دیا اور اسے قلعہ سینٹ ڈیوڈ مدراس کا گورنر اور فوج دار مقرر کیا۔ ہندستان پہنچ کر پہلا کام اس نے یہ کیا کہ گھیرا کے قلعے میں ایک بحری ڈاکو انگیرا نے اودھم مچا رکھی تھی اور انگریزوں اور مرہٹوں کو سخت تنگ کیا تھا اسے ٹھکانے لگایا۔ جب مدراس پہنچا تو بنگالے میں انگریزوں کی شکست کی خبر آئی اور کلائیو کو وہاں جانا پڑا۔ وہاں جا کر اس نے جو گل کھلائے وہ بیان ہو چکا ہے۔ سراج الدولہ کے خلاف سازش، سراج الدولہ کا قتل، امین چند سے دغابازی، جعلی دستاویز کی تکمیل وہ باتیں ہیں جو گو اس کی فطرت سے بعید نہ تھیں مگر قابل نفریں ضرور ہیں۔ کلائیو کے مداحوں کو

جنگِ پلاسی میں اس کی کام یابی پر بڑا ناز ہے لیکن یہ فتح مفت کرم داشتن کے مصداق ہے کیوں کہ سازش نے جنگ کو پہلے ہی طے کر دیا تھا۔ یہ جنگ محض ایک کھیل تھا جو کھیلا گیا اور ختم ہو گیا۔ اس لڑائی کے بعد کلائیو نے میر جعفر کو نواب بنایا اور اس طرح اس کا سارا خزانہ سمیٹ لیا۔ ۱۷۶۰ء میں کلائیو مال و زر سے لدا ہوا انگلستان روانہ ہوا۔ حکومت نے خوش نودی کا اظہار نہ کیا۔ ڈائریکٹر جاگیر لینے پر معترض ہوئے۔ عوام نے بھی کوئی مظاہرہ نہ کیا۔ ان باتوں کو کلائیو نے بہت ناپسند کیا اس کی صحت اچھی نہ تھی۔ بنگالے کی آب و ہوا نے اسے گنٹھیا کا مرض عطا کیا۔ اس سے نجات ملی تو وہ اس خفیہ مرض میں مبتلا ہوا جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔ (وہ کیا بیماری تھی ؟ مرض کا نام نہیں لیا جاتا۔ یہاں تک کہ کرنل ملن بھی اسے چبا گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شرم ناک بیماری ہو گی)۔ اس وقت اس کی عمر ۳۵ سال تھی اور اسے یقین تھا کہ علاج سے مرض جاتا رہے گا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ساحل انگلستان پر قدم رکھتے ہی اسے انگلستان کا بیرن بنایا جائے گا۔ مگر اسے صرف پلاسی کا بیرن بنایا گیا۔ دارالامرا میں شریک نہ ہو سکا مگر بڑی کوشش کے بعد دارالعوام کا رکن ہو گیا۔

مسٹر لارنس سلیوان (SULIVAN) نے ہندستان میں قابلِ قدر کام کیا تھا جسے انگلستان میں بہت پسند کیا گیا۔ وہ ہندستان کے واقعات کا بہترین واقف تھا اس نے کلائیو کی مخالفت بڑے پیمانے پر شروع کی اور لارڈ ہیوٹ بھی اس کے ساتھ مل گیا سلیوان نے نئے انتخاب کی درخواست دی اور اس میں اس کا مقابلہ کلائیو

سے ہوا۔ کلائیو نے مالِ حرام کو حرام کام میں استعمال کیا اور رشوت دے کر ووٹ خرید لیے مگر جب انتخاب ہوا تو کلائیو کے ووٹ بہت کم نکلے۔ اب پھر جاگیر کا شاخسانہ کھڑا ہوا۔ مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ کلکتے سے خبر آئی کہ کمپنی کے انتظام کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ بلوے ہو رہے ہیں اگر جلد توجہ نہ کی گئی تو قصّہ ختم ہے۔ اس لیے مجبوراً کلائیو کو گورنر جنرل کا عہدہ اور جاگیر لینے کی منظوری دی گئی ۱۷۶۴ء ۴ جون کو کلائیو ہندستان روانہ ہوا۔ مگر بچّوں کی تعلیم کی خاطر لیڈی کلائیو اس کے ہمراہ نہ گئی۔ (مگر یہ وجہ کچھ معقول نظر نہیں آتی۔ اس کے بچّے اس وقت تعلیم کے قابل نہ تھے)۔ بنگالے کی حالت کا اسے صرف اسی قدر علم تھا کہ میر قاسم سے جنگ ہو رہی ہے اور میر جعفر بحال کیا گیا۔

ہندستان پہنچ کر کلائیو نے فوجی اور دیوانی صیغوں میں بڑی اصلاح کی اور ۲۵ فروری کے شرم ناک معاہدے کو منسوخ کیا جس کی رو سے کمپنی کے ملازموں کو دس لاکھ روپیہ میر جعفر کے جانشین نجم الدولہ سے ملتا تھا۔ کلائیو کی سخت گیری سے ملازمانِ کمپنی بیزار ہو گئے۔ کلائیو نے محمد رضا خاں دیوان کو برطرف کرنے کے لیے راجا ولب رام اور اس وقت کے جگت سیٹھ، خوش حال چند سے سازش کی مگر کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اب کلائیو نے صوبے کا تمام انتظام اور خزانہ خود سنبھال لیا۔ اور نواب شطرنج کا مہرہ بن کر رہ گیا۔ نواب کی پنشن ۵۳ لاکھ روپے قرار پائی۔ یہاں پہنچ کر کرنل ہیلین نے کیا پتے کی بات کی کہ: "کیا اسی نتیجے کے لیے اس صوبے کے

امرا نے سراج الدولہ سے غداری کی تھی"۹۹۔ پھر کلائیو نے اپنا عنکبوتی جال دہلی کے برائے نام بادشاہ شاہ عالم پر ڈالا اور ایسے سبز باغ دکھائے کہ اس نے کلائیو کو بہترین مددگار خیال کر لیا۔ بادشاہ نے رہتاس کا قلعہ، کڑا اور الہ آباد۔ نواب وزیر اودھ کو پچاس لاکھ رُپے بخشے منظور کیے۔ کمپنی کو سارے ہندستان میں کوٹھیاں قائم کرنے اور عام تجارت کی اجازت مل گئی۔ اس آخری شرط پر نواب وزیر نے اعتراض کیا۔ اور کلائیو نے یہ شرط حذف کر دی۔ پھر بنگالہ، اڑیسہ و بہار کی صوبے داری بھی بہ عوض ۲۶ لاکھ رُپے سالانہ خراج کے انگریزوں کو دی گئی۔ نواب نجم الدولہ مر گیا اس کے جانشین کا گزارا بجائے ۵۳ لاکھ کے ۴۱ لاکھ مقرر ہوا۔ انھی دنوں میں معلوم ہوا کہ میر جعفر وصیت کر گیا ہے کہ پانچ لاکھ رُپیہ کلائیو کو دیا جائے۔ اس نے یہ رُپیہ خود نہ لیا مگر اس سے لارڈ کلائیو فنڈ کی بنیاد رکھی جس سے کمپنی کے محتاج اور ناقابل ملازموں کو وظیفے ملتے تھے۔ ۱۸۵۸ء میں یہ فنڈ حکومت کے قبضے میں چلا گیا۔ میدان جنگ میں ڈبل بھتہ الاؤنس کے تعلق میں سپاہیوں سے بگاڑ ہو گیا اور چپکے چپکے بغاوت کی کھچڑی پکنے لگی۔ کلائیو کے اپنے آدمی اس بغاوت کے سرغنہ تھے۔ ان کے پاس تمام قلعہ بند مقامات تھے۔ فوجیں اور سامان حرب ان کے قبضے میں تھا۔ ادھر سرحد سے خبر آئی کہ مرہٹوں کی ایک ٹڈی دل فوج آ رہی ہے۔ مگر کلائیو نے نہایت عقل مندی سے کام لے کر اس آفت کو دفع کر دیا۔ کلائیو کے جدید نظام کا زیادہ تر اثر ان نااہل کارندوں پر پڑا جو بلا تکلف رشوت لے کر اپنی جیب بھر رہے تھے۔ جب

یہ لوگ برطرف ہوکر انگلستان پہنچے تو انھوں نے کلائیو کے خلاف چرچا شروع کیا۔ ۱۴ جولائی ۱۷۶۶ء کو کلائیو انگلستان کے کسی ساحل پر جہاز سے اترا۔ اس کا بڑے تپاک سے استقبال کیا گیا۔ دربار شاہی میں باریاب ہوا۔ ڈائریکٹروں نے اس کی خدمات کا شکریہ ادا کیا اور میر جعفر کی عطا کردہ جاگیر مزید دس سال کے لیے جاری رکھی۔ جنوری ۱۷۶۸ء کو وہ لیڈی کلائیو کو ہمراہ لے کر پیرس کی سیر کو گیا۔ اس کی صحت اچھی نہ تھی اور تبدیلی آب و ہوا پر اطبا نے بہت زور دیا اور وہ تین مہینے فرانس رہا۔ واپس آیا تو اس کے مخالفوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سر رابرٹ فلچر نے ایک اچھی خاصی کتاب اس کی بدکاریوں پر لکھی جس پر کلائیو کو بڑا غصہ آیا۔ آخر اپریل ۱۷۷۲ء میں جنرل برگان کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی اور ہندستان کے معاملات اس کے سپرد ہوئے۔ اس کے بعد ۱۳ ممبروں کی ایک کمیٹی لارڈ نارتھ بروک نے مقرر کی جو کمپنی کی داد و ستد کی مجموعی طور پر پڑتال کرے۔ ابھی یہ کمیشن یہ رُوبے کار رانہ آئی تھیں کہ لوگوں نے کلائیو کو ہدف ملامت بنانا شروع کر دیا۔ سر سلوان نے ہوس آف کامنز میں کلائیو کے خلاف ایک طویل تقریر کی اور مئی ۱۷۷۳ء میں جنرل برگان نے ایک جامع فرد جرم کلائیو کے خلاف مرتب کی۔ لارڈ سٹال ہوپ (تاریخ انگلستان جلد ۷ صفحہ ۳۵۳) کہتے ہیں کہ لارڈ کلائیو پر مقدمہ چلانے کا باعث اس کی بے حد دولت تھی۔"

لارڈ کلائیو پر جنرل برگان نے حسب ذیل الزامات لگائے جن کی تحقیقات کا حکم دیا گیا۔

(۱) سراج الدولہ کے خلاف غدارانہ عہدنامہ کرکے اور میر جعفر کو اس کی جگہ لگاکر کمپنی کو مصیبت میں ڈال دیا اور اس کاریاہ سے بدنام کیا۔

(۲) امین چند سے بہت برا سلوک کیا اور امیر البحر واٹسن کے دستخط جعلی بنائے۔

(۳) تحائف کے نام پر میر جعفر سے بیش بہا رقوم لی گئیں۔

۲۱ مئی کو جنرل برگان نے یہ الزام مستزاد کیا جو پہلے الزاموں کو اور اجاگر کرتا تھا کہ سراج الدولہ کی معزولی اور میر جعفر کی مسند نشینی کے وقت ان اختیارات کے ذریعے جو اسے حاصل تھے دو لاکھ روپے بہ حیثیت سپہ سالار، دو لاکھ اسی ہزار بہ حیثیت رکن کمیٹی سولہ لاکھ روپے بہ طور ذاتی تحفے کے وصول کیے جن کی مجموعی تعداد بیس لاکھ اسی ہزار روپے ہے اور یہ کہ اس فعل کے ارتکاب سے اس نے اپنے اختیارات کو ناجائز طور پر استعمال کیا جس سے انگریز عمال کے لیے بری مثال پیدا کی اور حکومت کو نقصان پہنچایا۔"

اگرچہ یہ مقدمہ رفع دفع ہوگیا مگر اس کی صحت پر بہت برا اثر پڑا۔ وہ آب و ہوا تبدیل کرنے کے لیے بھی گیا مگر کچھ نہ بنا۔ بیماری نے اس قدر زور پکڑا کہ نیند آنا مطلق بند ہوگئی۔ وہ ۱۷۷۴ء میں انگلستان آیا اور اس کے چند دن بعد نومبر ۱۷۷۴ء کو اس نے خودکشی کرلی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک خاتون کلائیو کے ہاں مہمان آئی تھی اور اپنے کمرے میں کچھ لکھ رہی تھی۔ کلائیو کو گزرتے دیکھ کر اسے

آواز دی اور کہا کہ زرا اس کا قلم بنا جائیں۔ کلائیو نے چاقو نکالا اور اس کا قلم بنایا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا اس نے اسی چاقو سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا۔

جہاں لارڈ سٹال ہوپ اور سر میلکم نے اسے آسمان پر چڑھایا ہے اور اس کے ہر عیب کو ثواب بنا کر پیش کیا ہے وہیں اس کے ہم وطن یہ بھی کہتے ہیں کہ "اسے اپنی مطلب براری میں دھوکا فریب سے کام لینے میں کوئی تکلف نہ تھا۔" (مسٹر مل)

"اس کی نگاہ میں مشرقی سیاسیات ایک کھیل تھے جس میں کوئی بات ناواجب نہیں ہوسکتی"۔ (دیکھو "مضامین مکالے") مکالے یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی دو دفعہ کلائیو نے خودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن پستول نہ چلا اور اپنی بحث کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے۔ "یہ انتقام الہٰیہ اور ضمیر کا ردّ عمل ہے"۔

کلائیو کی امین چند والی جعل سازی کی نسبت کرنل میلسن کی رائے یہ ہے:

"بہر حال داغ قائم رہتا ہے دھوتے دھوتے ہوسکتا ہے کہ اخلاق کا کپڑا پھٹ جائے مگر دھبّا جو اس کو لگا ہے دور ہونے کا نہیں۔ کلائیو کی زندگی ہی میں یہ نمایاں ہوگیا اور رہتی دنیا تک رہے گا۔"

---

(۱۳) مہاراجا نند کمار رائے

نند رام حسنِ خدمات کی بہ دولت نواب شایستہ خاں ناظم بنگالہ

کا منظورِ نظر ہو گیا، ناظم نے سفارش کی اور دہلی سے اسے "لالہ رائے" کا خطاب ملا۔ اس کے بیٹے سروجت رائے نے گراں مایہ جایداد پیدا کی اس کا بیٹا جگت چند میر جعفر کی مدخولہ رنڈی منّی بیگم کا داروغہ تھا اسے رائے کا خطاب اور پنج ہزاری کا منصب ملا مگر جلد مر گیا۔ اس خاندان کی ایک اور شاخ کا رکن پدما مل بھی جلد فوت ہو گیا اس کا بیٹا نندکمار جسے سراج الدولہ کی کوشش سے فوج دار ہگلی کا عہدہ ملا گئی اور معزز عہدوں پر فائز ہوا اور سراج الدولہ کے خلاف میر جعفر کا دست راست بنا رہا اور جب وہ ناظم بنا تو یہی اس کا دیوان اور مشیر تھا۔ کلائیو سے اس کے تعلّقات دوستانہ تھے اور بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ کلائیو اسے کالا کرنل کہا کرتا تھا۔ سازش اور حرص اس کے کردار کی کمزوریاں تھیں ۱۷۶۴ء میں اسے شاہ عالم بادشاہ دہلی نے مہاراجا کا خطاب دیا۔

۶ مارچ ۱۷۷۵ء میں ایک شخص موہن پرشاد نے نندکمار پر جعلی دستاویز بنانے کا الزام لگایا اس پر اسے گرفتار کر کے فوج داری مقدمہ چلایا گیا۔ انگریزی صدر عدالت کے روبرو ۸ جون کو اس کے مقدمے کی سماعت ہوئی۔ ۱۶ جون کو اسے مجرم قرار دیا گیا اور پھانسی کی سزا ہوئی اور ۵ ستمبر کو اس ہفتاد سالہ بڈھے کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا جس نے انگریزوں کی بے حد خدمت کی تھی۔ (موزمدار ص ۲۲۹)

اس مقدمے کی کیفیت یہ ہے کہ دو ارکان نے کونسل میں ہیسٹنگز گورنر جنرل کے خلاف ایک کمیٹی بنائی تھی جو ہیسٹنگز

کی کسی تجویز کو منظور نہ ہونے دیتی تھی۔ یہ کمیٹی اندر ہی اندر ہیسٹنگز کی رشوت ستانی کا کھوج لگا رہی تھی۔ ان کے مخبروں میں نند کمار بھی شامل ہو گیا۔ بات یوں بڑھی کہ میر جعفر کی وفات کے بعد اس کا خورد سال بیٹا اس کا جانشین مقرر ہوا اور ملک کا انتظام اس کی ماں منّی بیگم کے سپرد ہوا اور رضا خاں وزیر پر غبن کا الزام لگایا گیا۔ اس کام میں نند کمار نے ہیسٹنگز کی بہت مدد کی اور اسے کامیاب کرایا لیکن نند کمار کو اس کے حسنِ خدمت کا کوئی صلہ نہ ملا تو وہ اس کے مخالفین کی جماعت سے جا ملا اور ہیسٹنگز پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے منّی بیگم سے بہت بڑی رشوت لی ہے اور کونسل نے یہ تجویز منظور کر دی کہ ہیسٹنگز یہ رقم منّی بیگم کو واپس کر دے۔ ہیسٹنگز نے یہ تجویز نہ مانی اور نہ وہ مان سکتا تھا رفتہ رفتہ یہ بات لنڈن تک جا پہنچی اور ہیسٹنگز کی رسوائی کے علاوہ تحقیقاتی کمیشن کے تقرر کی توقع ہونے لگی۔ اس تحقیقات کی پیش بندی میں ہیسٹنگز نے مخالفین کے سب سے بڑے گواہ نند کمار پر حملہ کرنا قرین مصلحت خیال کیا اور فوک نامی ایک انگریز سے سازش کر کے نند کمار پر کچھ الزام لگا دیا۔ یہ الزام ابھی زیرِ غور تھا کہ ایک غیر معروف شخص موہن پرشاد پردۂ غیب سے نمودار ہوا اور اس نے نند کمار پر ایک جعلی دستاویز بنانے کا الزام لگایا۔ استغاثہ یہ تھا کہ مرشد آباد کے ایک ساہوکار نے نند کمار سے ستّر ہزار روپیہ قرض لیا۔ ۱۷۶۹ء میں یہ ساہوکار (بلاقی داس) فوت ہو گیا اور اس کے وارثوں نے ستّر ہزار روپیہ نند کمار کو ادا کر دیا اور بہ طور رسید دستاویز کا حصّہ ظاہری چاک کر دیا۔ نند کمار نے

ایک جعلی دستاویز اسی رقم کی بابت بلاقی داس کی طرف سے بنائی۔ اس مقدّمے کو سب لوگ ناپسند کرتے تھے اور کسی کو اس کی صداقت پر یقین نہ تھا۔ بہت سی درخواستیں دی گئیں نواب مرشدآباد نے بھی سفارش کی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ نندکمار نے آخری وقت تک حوصلہ نہ ہارا جس دن پھانسی دی گئی، اس رات کسی برہمن نے اپنے گھر چراغ نہ جلایا۔ (موزمدار ص ۲۲۹)

ہچنس لکھتا ہے کہ "اس سے ہندستانی رعایا کو معلوم ہو گیا کہ برطانوی انصاف کس وقعت کا مستحق ہے۔ اس سے چند سال قبل کلائیو نے ایک ہندو ساہوکار کو جعل سازی کے ذریعے دو لاکھ پونڈ سے محروم کیا تو اسے اس کے صلے میں لارڈ بنایا گیا اور نندکمار کو ایک مبینہ جعل کی علت میں پھانسی دی گئی۔"

(THE EMPİRE OF THE NOBALES BY HUTCHİUSON) (PP.97-98.)

ڈاکٹر باسو اس بارے میں یہ نئی بات پیدا کرتے ہیں:- یہ باور کرنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ نندکمار نے بردوان اور بیربھوم کے زمین داروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ نواب مرشدآباد اور انگریزوں کی مخالفت کریں وہ محبِّ وطن اور جہاں دیدہ مدبر تھا اس کا کردار گرفت سے بالا تھا۔ اس پر صرف یہ الزام آتا ہے جو کسی کے اٹھائے نہیں اٹھ سکتا کہ اس نے امین چند کی باتوں میں آکر انگریزوں کو چندانگر سے گزرنے دیا جب ان کو روکنا بہ حیثیت فوج دار ہگلی اس کا فرض تھا۔ (باسو جلد دوم صفحہ ۲۸۷-۳۱۴)

(۱۴) میر علی اصغر کبرا

سادات سیکری سے تعلق رکھتا تھا، مضافات میوات کا باشندہ تھا اور نواب عمدۃ الملک امیر خاں کا ملازم۔ اس کے باپ کا نام میر محمد تھا بڑا عیّار، ہوشیار اور شجاع تھا۔ ابتدائے جوانی میں درویشوں کی صحبت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا رہا اور اسی طرح اسے درویشوں کے اعمال و اشغال کا علم ہو گیا۔

آخر طالب دُنیا اور شہرت کا پیاسا بن گیا۔ پیری مریدی کا جال بچھایا اور کئی جاہل اس میں پھنس گئے۔ اپنا لقب کبرا و معصوم العارفین اختیار کیا۔ مریدوں کو عجیب پیچ دار باتیں سُناتا تھا جنھیں وہ سمجھ نہ سکتے تھے۔ مُرغی کے انڈے کو حرام قرار دیا جب اس سے اس کا سبب پُوچھا تو کہا نہ میں نے حرام کیا نہ حلال، البتہ میں کھانا پسند نہیں کرتا اس سے بہت سے خرقِ عادات منسوب کیے جاتے تھے۔ آخر یہ خبر مشہور ہوئی کہ اسے کنوئیں میں پانی پر کھڑا دیکھا گیا تو چھ سو اشخاص نے اس سے بیعت کی۔ ابتدا میں بالکل جاہل تھا چند طالب علموں سے خلوت میں مبادی صرف و نحو پڑھیں، عربی کے چند الفاظ سیکھ لیے اور انھیں گفتگو میں بولنے لگا۔ کوئی علم کی نسبت پُوچھتا تو کہتا "علم لدنی در عالم معنی با حسین علیہ السلام" اخذ کیا ہے۔ باتیں اس طرح کرتا گویا سُننے والوں کی دلی باتیں کہہ رہا ہے۔ جب نواب عمدۃ الملک مارا گیا اس کے ایک مرید وزیر خاں نے اس کا ذکر عطا اللہ خاں سے کیا۔ اس نے بعد اجازت

علی وردی خاں علی اصغر کو زادراہ بھیج کر بُلایا۔ وہ جھالردار پالکی میں سوار نوبت بجاتا اور دیگر سامانِ امارت سے مزیّن ہوکر روانہ ہوا۔ سات سو سوار ہمراہ لے کر عظیم آباد پہنچا اور دو تین روز وہاں ٹھہر کر عازم مرشد آباد ہوا وہاں حاجی احمد بھی اس سے ملا اور اس نے علی وردی خاں کو لکھا کہ وہ کسی طرح سے بھی مصطفیٰ خاں سے کم نہیں۔ عطا اللہ خاں اس کا معتقد ہوگیا اور علی اصغر نے اسے اور میر جعفر کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ اس میں ناکام رہا تو عطا اللہ خاں کو یہ بشارت دی کہ ایک نہ ایک دن وہ بنگالے کا صوبے دار ہو جائے گا۔ علی وردی خاں نے پہلے علی اصغر کو اور پھر عطا اللہ خاں کو بنگالے سے بدر کر دیا۔ (سیر المتاخرین)



(۱۵) میر محمد حسین المعروف نمود و انمود

میر محمد حسین نام، مشہد کا رہنے والا، ایک نجیب الطرفین سیدزادہ تھا۔ فارسی کا عالم اور عربی کا فاضلِ اجل تھا۔ حدیث فقہ عروض معقول و منقول میں عبور حاصل تھا۔ زبان شیریں تھی۔ جو بات زبان سے نکلتی تھی سامعین کے دل میں گھر کر جاتی تھی۔ حاضر جوابی کا یہ عالم تھا کہ مجلسِ مناظرہ میں سب کا منّھ بند کر دیتا تھا، اور بڑے بڑے منطقی منّھ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ لیکن قسمت کا ایسا دھنی تھا کہ کس مپرسی نے کبھی ساتھ نہ چھوڑا اور تنگ دستی ہمیشہ قافیہ تنگ کرتی رہی۔ آخر وطنِ مالوف کو کہ عزیز و اقارب سے تہی دامن تھا،

نیرہ یا دکھی اور کابل کا رُخ کیا جہاں نواب عمدۃ الملک امیر خاں صوبہ دار کابل علوم و فنون کی سرپرستی میں ہن برسا رہے تھے۔ محمد حسین کے لیے کابل دوسرا بغداد یا دہلی ثابت ہوا اور یہاں پہنچتے ہی اس کے دن پھر گئے۔ چند دنوں میں اس کے تبحرِ علمی کی دھوم مچ گئی اور خود صوبے دار کے صاحب زادے اس کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ محمد حسین کا مسکن علمی دنیا کا مرکز بن گیا اور مذاکرۂ علمیہ میں اس کی رائے کو قولِ فیصل کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ نواب عمدۃ الملک کی بیگم "صاحب جی" کہ نواب علی مردان خاں کی دختر تھی، اولاد سے محروم تھی اور اس نے ایک ولایتی سید زادی کو گود لیا تھا۔ یہ لڑکی اب جوان ہو گئی تھی اور بیگم کو اس کے لیے ایک ایسے شوہر کی ضرورت تھی جو سید ہونے کے علاوہ ولایتی ہو اور خصائلِ حمیدہ میں ممتاز ہو۔ جب محمد حسین کی شہرت نواب کے محل کی دیواریں پھاند کر حرم سرا میں پہنچی تو بیگم کے ایما پر نواب نے محمد حسین کو بلا کر آداب، لیاقت، علم و فضل میں یکتا پایا اور اس لڑکی کی شادی محمد حسین سے ہو گئی۔ اس طرح اس کا رتبہ دنیاوی لحاظ سے بھی بلند ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد نواب نے اُسے شاہی خوشبو خانے کا داروغہ مقرر کیا اور نواب کے فرزندوں نے جو دوسری بیگم کے بطن سے تھے، اس سے مراسمِ دوستانہ بڑھائے۔ اُس نے ان نوجوانوں پر اور خاص کر ہادی علی خاں پر ایسا افسون پھونکا کہ وہ دن رات اس کا کلمہ پڑھنے لگے۔ اس کے چند ماہ بعد نواب عمدۃ الملک نے سفرِ آخرت کیا اور اس کے پس ماندگان دہلی چلے گئے۔ محمد حسین کے

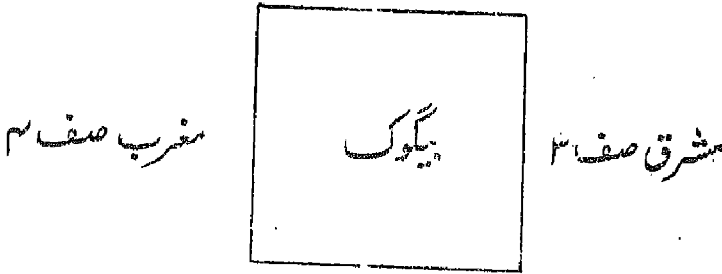
پاؤں میں ملازمت کی زنجیر پڑی تھی۔ اسے کابل ہی رہنا پڑا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ داروغۂ خوش بو خانے کی اسامی آیندہ ترقی کا پیش خیمہ ہے۔ اس نے بیگمات اور اہلِ دربار کو تحفہ و تحائف بھیج کر سب کے دل مٹھی میں کر لیے اور نوازشاتِ شاہی کی فراوانی اس حد تک پہنچی کہ اسے دہلی جاکر آستاں بوسی کی اجازت مل گئی۔ اب محمد حسین کو ایک شان دار مستقبل کے خواب آنے لگے اور وہ دو منزلہ کرتا ہوا لاہور پہنچا یہاں اسے شہنشاہ عالم گیر کی رحلت کی خبر ملی اور اس کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا اس نے عطر و عبیر کے ۷۸ ہزار روپے پر اکتفا کرکے اس رقمِ خطیر کو اپنے توکل کا سرمایہ بنایا اور فقیروں کا بانا پہن کر علائقِ حیات سے بیگانگی ظاہر کرنے لگا۔ چوں کہ حصولِ عزو جاہ کی خواہش اس کے دل پر غالب تھی اس نے بوریے سے تختِ شاہی کا کام لینے کا تہیہ کیا۔ اس کی جدّت پسند طبیعت نے عام گندم نما جو فروشوں کے پامال طریق کو پسند نہ کیا اور اس کی جولانیٔ طبع نے عام پیروں کے طریق کار کی پیروی کو پست ہمّتی پر محمول کیا۔ اس نے ایک ایسے مسلک کی طرح ڈالنے کا ارادہ کیا جس کا کسی نے نام تک نہ سُنا ہو۔ اس کے ہمراہ ایک طبّاع منشی زادہ تھا، جسے محمد حسین کے فیضانِ صحبت نے خاصا عالم بنا دیا تھا۔ محمد حسین نے اسے اپنا ہم راز بنایا اور دونوں کی سرگوشی کا نتیجہ ایک جدید مذہب کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس کے تعلق میں محمد حسین کو الہام ہونے لگا، مگر ایسی زبان میں جسے کوئی نہ سمجھ سکے۔ محمد حسین نے یہ دعوا کیا کہ اس کا مرتبہ نبوت اور امامت کے بین بین ہے۔ اس کی شان وہی ہے جو انبیاؑ و اولیا کی ہوتی ہے اور اسے "بیگو کیت" کہتے ہیں۔ اب یہ دونوں

الہامی زبان اور اس کے قواعد بنانے میں مصروف ہوئے جب اس سے فارغ ہوئے تو اس جدید زبان میں ایک الہامی کتاب کی تیاری شروع ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے عجیب و غریب فقرے اور عبارتیں درج کیں۔ جن کی تفسیر سوا ان کے اور کسی کو معلوم نہ تھی جب یہ کتاب مکمل ہوئی تو اسے "اقوزہ مقدسہ" کے نام سے موسوم کیا۔ زبان جو اختراع کی اس کے الفاظ کا ذخیرہ قدیم فارسی زبان کے غیر مانوس اور غریب الفاظ میں ترمیم و ترخیم کرکے بہم پہنچایا اور انھیں عربی کے مشابہ کر دیا۔ اس کا بیان تھا کہ ہر الوالعزم پیغمبر کے نو بیگوک ہوتے ہیں۔ اور حضرت محمد مصطفےٰ کے اول بیگوک حضرت علی ہیں اور آپ کے بعد آنے والوں میں امام رضا و امام ضامن ہیں۔ ان کے بعد "بیگوکیت" اس کے نام پر منتقل ہوئی اور وہ "خاتم البیگوکیت" ہے۔ بیگوکیوں کا یہ شمار وہ حضرات اہلِ تشیع کے روبرو کرتا تھا اور ارباب اہلِ سنّت کے سامنے خلفائے راشدین اور چار خلفائے اموی و عباسی کے نام لے کر نویں نمبر پر اپنی بیگوکیت کا مدعی تھا۔ اس کا قول تھا کہ اسے کسی مذہب سے سروکار نہیں۔ وہ ہر ملّت کا چراغ روشن کرنے والا ہے۔ اس کے مرید "فربود" کہلاتے تھے۔ مریدوں کو بتاتا تھا کہ اس پر نزولِ وحی دو طرح ہوتا ہے۔ اوّل ایک آفتاب جیسا نورانی قرص اس کی آنکھوں کے سامنے چکر کاٹتا ہوا اس کے قریب آجاتا ہے اور اس میں کلمات لکھے ہوتے ہیں جو اسے بہ یک نظر حفظ ہو جاتے ہیں اس کے بعد وہ قرص اس کے جسم کا طواف کرتا ہے اور اس پہ غشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اس عمل سے اُسے اس قدر

تکلیف ہوتی ہے کہ اس کا برداشت کرنا عام انسانی طاقت سے باہر ہے۔ دوم ایک خوف ناک آواز آتی ہے جس سے کان بولنے لگتے ہیں۔ پھر پیغامِ الٰہی سننے میں آتا ہے۔ سلام کا طریق بھی نیا ایجاد کیا اور فرہودوں کو حکم ہوا کہ بجائے السلام علیکم کے "نمود بود وال" کہا کریں۔ جس تاریخ کو اسے اوّل بار الہام ہوا اس کو مقدس قرار دے کر اسے "روزِ جشن" کہنے لگے۔ اس تیوہار کے روز اس کے مرید ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے۔ ایک دوسرے پر عطر و عبیر چھڑکتے اور ہر ممکن طریق سے اظہارِ مسرّت کرتے تھے۔ بھرے مجمع میں حضرت نمود و انمود دو علموں کے سایے میں تشریف لاتے تھے۔ جلو میں ہزاروں عقیدت مند ہوتے جو اس کے راستے کی خاک اٹھا کر اپنے دامنوں میں ڈالتے اور بہ طورِ تبرک اپنے گھروں کو لے جاتے تھے۔ ایک پرانی وضع کی ٹوپی زیبِ سر ہوتی تھی جو اماموں کے زمانے میں پہنی جاتی تھی۔ مگر اس کی دیوار قدیم ٹوپی سے زرا بلند ہوتی تھی، جس سے یہ اظہار مقصود تھا کہ وہ "خاتمِ بیگوئیت" ہے۔ جب سب مرید جمع ہو جاتے تو نمود و انمود اس لاؤ لشکر کو ساتھ لے کر اُن پہاڑیوں کی طرف نکل جاتا جہاں دھولی کے محلات کے کھنڈر ہیں اور جنھیں دھولی بھٹیاری سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کا بیان تھا کہ اسے اوّل بار الہام اسی جگہ ہوا اور اسے وہی تقدس حاصل ہے جو غارِ حرا کو ہے۔ یہ جشن ہر سال ۱۶ ذی الحجہ کو منایا جاتا تھا۔ اور نمود و انمود غرّہ ماہِ مذکور سے تا یومِ جشن روزہ رکھتا اور ان دنوں میں کسی سے ہم کلام نہ ہوتا اور بالکل خاموش رہتا تھا۔ یہ جشن کامل دو ہفتے تک ہوتا تھا اور نذر و نیازیں زر و جواہر کے ڈھیر لگ

جاتے تھے۔ دوسرا جشن "روز سولان" کہلاتا تھا، لیکن اس کی وجہ تسمیہ اور کیفیت معلوم نہیں۔

معمولی نماز پنج گانہ پر اس نے تین نمازیں اور مستزاد کیں جنھیں اس مذہب کی اصلاح میں "دید" کہتے تھے۔ پہلی "دید" کا وقت طلوع آفتاب کے بعد، دوسری کا نصف النہار اور تیسری کا غروب آفتاب کے وقت جب سرخی شفق موجود ہو۔ دید کی بجا آوری کا یہ طریق عمل تھا کہ نمود وانمود یا اس کا کوئی خلیفہ بیچ میں کھڑا ہو جاتا اور مرید اس کے گرد مربع شکل کا حلقہ مثل چار دیواری مکان باندھ لیتے یعنی



جب اس طرح صف بندی ہو جاتی تو سب ان مقدس کلمات کا ورد کرتے جو نمود وانمود نے اپنی ایجاد کردہ زبان میں ادا کیے تھے اور جن کے سمجھنے سے سب عاری تھے۔ اس عمل کے بعد سب اہل صف سروں کو جھکا دیتے اور اس طرح گھومتے کہ صف ۱ صف ۳ کی جگہ صف ۳ صف ۱ کی جگہ اور صف ۲ صف ۴ کی جگہ پہنچ جاتی۔ اس نقل مقامی کے بعد سب لوگ اپنی آنکھیں زمین کی طرف جھکا دیتے پھر آسمان

کی طرف منہ کرکے فضا میں نظر جماتے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہر نئی وضع اختیار کرنے پر نئے کلمات پڑھے جاتے تھے جنھیں لوگوں نے توتے کی طرح رٹا ہوتا تھا۔ اس طرح شش جہت میں اللہ کی عبادت کرنے پر دید ختم ہو جاتی تھی۔

خلفائے اربعہ کے مقابلے میں نمود و انمود نے بھی چار خلیفہ مقرر کیے تھے؛ خلیفہ اول اس کا شاگردِ رشید اور ہم کار منشی زادہ تھا جس کا نام "دوجی بار" اپنی زبان میں قرار دیا تھا جس کے معنی اسی کو معلوم ہوں گے۔ دوسرا خلیفہ وانمود کا سالا میر باقر تھا اور دو خلیفہ اور تھے۔ میر محمد حسین نے اپنا نام "نمود اللہ" اور "نمود و انمود" تجویز کیا تھا جس کے معنی خود اس کے مریدوں کو بھی معلوم نہ تھے۔ جب کوئی شخص اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوتا تو اسے نیا نام دیا جاتا، جسے اس کی اصطلاح میں "نشان" کہتے تھے۔ وانمود کے تین بیٹے تھے: اوّل کا نام "نما نمود" دوسرے کا "ففار" اور تیسرے کا "دید" تھا۔ دو بیٹیاں تھیں جن میں سے بڑی کا نام "نمانہ کلاں" اور چھوٹی کا "نمانہ خورد" تھا۔ بیوی کی طرف سے جو رشتہ دار مرید ہوئے ان میں سے چند ایک کے نام یہ تھے: نمایار، نمویار، نمانہ اور نموفر۔ جب مذہب کا یہ نیا فتنہ جاگا اس وقت ملک کی سیاسی حالت یہ تھی کہ بہادر شاہ لاہور میں تھا اور سلطنت میں کھلبلی پھیلی ہوئی تھی۔ میر محمد حسین نے دہلی پہنچ کر خفیہ خفیہ اپنے خیالات کی اشاعت شروع کی اور چائے کی دعوت کے پھیر میں کئی ہم نوا پیدا کر لیے۔ جب بہادر شاہ لاہور سے دہلی آیا اور لائق باپ کے نالائق بیٹوں میں خانہ جنگی کے

آثار نمودار ہونے لگے تو محمد حسین نے پردۂ خفا کو چاک کیا اور کھلے بندوں لوگوں کو اپنے مذہب کی تلقین کرنے لگا۔ اوّل تو کوئی اس سے بحثنے کا دم نہ بھرتا اور جو کوئی سامنے آ بھی گیا تو میر محمد حسین دلائل و براہین، اسناد و شواہد سے اس کا ناطقہ بند کر دیتا تھا۔ اس سے اس کا نام اور بھی چمکا اور عوام جوق در جوق بیعت کرنے لگے اور اس کے مریدوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ شہرت کا یہ عالم تھا کہ جب شہنشاہ فرخ سیر اورنگِ جہاں بانی پر متمکن ہوا تو سلطنت بھر میں میر محمد حسین سب سے بڑا عالم شمار ہوتا تھا۔ فرخ سیر ایک سادہ لوح نوجوان تھا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ فقط حسین علی خاں و عبداللہ خاں کی بساطِ حکمت کا بادشاہ تھا، اور ان "بادشاہ گروں" کو ہر وقت اپنی پڑی رہتی تھی۔ انھیں مذہبی مناقشات سے کیا دل چسپی ہو سکتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ ہادی علی خاں جیسے امیر زادے کا سارا رسوخ اس کا پشت پناہ تھا۔ اس کے علاوہ اور کئی امرا اس کے مریدوں میں داخل ہو چکے تھے۔ ان تمام حالات سے میر نمود و انمود نے کافی فائدہ اٹھایا اور اپنے مذہب کی بنیادیں محکم دیواروں پر استوار کیں۔ نمود و انمود کے اقتدار کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک شب کو فرخ سیر چند خواجہ سراؤں کے ساتھ اس کی قدم بوسی کے لیے اس کے آستانے پر چپکے سے حاضر ہوا، لیکن شہنشاہ کے پہنچتے ہی نمود و انمود نے اپنے حجرے کا دروازہ بند کر لیا اور ملاقات سے صاف انکار کیا۔ آخر فرخ سیر کی خوشامد اور و انمود کے خلیفوں کی لجاجت کے طفیل فرخ سیر کو اس کی درگاہ میں بار ملا۔ بادشاہ نے نہایت ادب سے فرشی سلام کیا۔ وانمود نے ایک

ایک مرگ چھال بادشاہ کے آگے پھینک دی۔

فرخ سیر اس کے استغنا پر لوٹ ہوگیا۔ بادشاہ نے اشرفیوں کے بدلے نذر کے طور پر پیش کیے لیکن وانمود نے ایک پیسہ بھی لینے سے انکار کرکے فرخ سیر کے دل پر قبضہ کرلیا۔ آخر ہزار منت کے بعد وانمود اس بات پر رضا مند ہوا کہ بادشاہ "اقوزہ مقدسہ" کی ایک جلد خریدے، جس کی قیمت ۵۷ رُپے تھی۔ چناں چہ بادشاہ نے کتاب مذکور خریدی اور اسے اٹھاکر سر پر رکھا اور باہر جاکر اشرفیاں درگاہ کے فقیروں میں تقسیم کردیں۔ اب کیا تھا۔ اس خبر کے عام ہوتے ہی مریدوں کی تعداد میں ہزاروں کا اضافہ ہوگیا اور دہلی میں نمود وانمود کا ڈنکا بجنے لگا۔

جب محمد شاہ کا دورِ حکومت شروع ہوا تو قلم دانِ وزارت محمد امین خاں نے سنبھالا۔ محمد امین خاں کو ایک مدّت سے دردِ گُردہ کا دورہ ہوتا تھا اور اطبا کا خیال تھا کہ اس کی زندگی معرضِ خطر میں ہے اس لیے وہ مذہب کی طرف زیادہ متوجہ رہتا تھا جب اسے نمود وانمود کی فتنہ سامانی کا علم ہوا تو اس نے چند سپاہیوں کو بھیجا کہ نمود وانمود کو باندھ لائیں۔ دو پہر کا وقت تھا جب سپاہی پہنچے ہجوم کم تھا اور وانمود دستر خوان پر بیٹھا تھا۔ یہ خبر سُن کر اس نے پورے استقلال سے کام لیا۔ خود کھانا کھاتا رہا اور اپنے بیٹے "وید" کو کہ حسن وجمال میں ثانی نہ رکھتا تھا کہا کہ جاؤ سپاہیوں کو کھانا کھلاؤ۔ میں کھانا کھاکر باہر آتا ہوں۔ سپاہی اس پیکرِ حسن اور خوش اخلاقی پر مبہوت ہوگئے، اور انھوں نے جبر و تعدی سے کام لینے کے

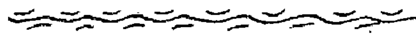
خیال کو دل سے نکال دیا۔ ادھر یہ ہو رہا تھا اُدھر محمد امین خاں کو درد گردہ
نے آدبایا۔ سپاہیوں کو یہ خبر ملی تو ان کے حواس مختل ہو گئے اور وہ
بھاگ کر وزیر اعظم کی ڈیوڑھی پر جا پہنچے۔ محمد امین خاں کو ذرا افاقہ ہوا
تو اس نے پھر سپاہیوں کو حکم دیا کہ صبح کو نمود وانمود کو ضرور حاضر کیا
جائے۔ شب کے وقت محمد امین خاں کی حالت غیر ہو گئی اور جان
کے لالے پڑ گئے۔ نمود وانمود کو ہادی علی خاں اور دیگر امرا منٹ منٹ
کی خبر پہنچا دیتے تھے اور وانمود بھاگ جانے کا تہیّہ کر رہا تھا کہ اسے
خبر ملی کہ محمد امین خاں گھڑی ساعت کا مہمان ہے۔ وہ گھر سے نکل کر
مسجد میں جا بیٹھا، اور اس کے معتقدوں نے اس کے گرد حلقہ باندھ
لیا۔ قمر الدین خاں نے جب باپ کی حالت غیر دیکھی تو بیگمات اور
دیگر اعزہ واقارب کے کہنے پر اسے یقین ہو گیا کہ محمد امین خاں نمود وانمود
کی بد دعا کا شکار ہو رہا ہے اور اس نے اپنے دیوان کو پانچ ہزار روپے
دے کر بھیجا کہ اس کی طرف سے نذر گزار کر وانمود سے خواہانِ عفو
ہو اور تعویذ ردِّ بلا طلب کرے۔ جب دیوان پہنچا تو وانمود مچل گیا اور
دون کی لینے لگا۔ اور یوں بولا کہ میں نے اس کافر کو ایسا تیر مارا ہے کہ اس
کی زندگی محال ہے۔ میں شہادت کے لیے سر بہ کف بیٹھا ہوں۔ میرے
جدِّ اعلا نے بھی مسجد میں جامِ شہادت نوش کیا تو میں اس سعادت
سے کیوں محروم ہوں۔ ایک دفعہ مر چکا ہوں اور یہ دوسری زندگی ہے۔
دیوان نے کہ بڑا چرب زبان درباری تھا بہت منت خوشامد
کی تو وانمود نے کہا کہ اگرچہ تیر کمان سے نکل چکا ہے مگر تمھارے کہنے
سے تعویذ لکھ دیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بعد از وقت ہے اور تمھارے

پہنچنے سے پہلے روح پرواز کر گئی ہوگی۔ یہ کہ کر وانمود نے اپنے خلیفۂ اعظم دوجی بار کو اشارہ کیا اور اس نے تعویذ پر یہ الفاظ لکھ کر دیے:
"وننزل من القرآن ماھو شفاء ورحمۃ للعالمین ولا یزید الظالمین الا خسارا۔"

دیوان ابھی راستے ہی میں تھا کہ محمد امین خاں عالم جاوداں کو سدھارا۔ اس واقعے نے وانمود کی شہرت اور اقتدار کو چار چاند لگا دیے۔" دو تین سال بعد تک وانمود شاہانہ جاہ و جلال سے زندگی بسر کر کے موت کی بھینٹ چڑھا اور اس کا بڑا بیٹا "نما نمود" اپنے باپ کے سجادے پر بیٹھا۔ وانمود زندگی بھر آمدنی سے دوجی بار اور دیگر محرمانِ راز کو حصہ دیا کرتا تھا، لیکن نما نمود نے اس حصے کے دینے سے انکار کیا اور کل آمدنی خود لینے لگا۔ ہر چند دوجی بار نے نشیب و فراز سمجھایا لیکن نما نمود نے ایک نہ سُنی اور دونوں میں ظاہرا بگاڑ ہو گیا۔ آخر جب معاملے نے طول کھینچا تو دوجی بار چھوٹے ہتھیاروں پر اُتر آیا اور اس نے اس مذہب کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ چناں چہ جشن کے روز کہ سب فربودے جمع تھے، دوجی بار نے ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ حضرات بہ خوبی آگاہ ہیں کہ حضرت وانمود اور اس خاکسار کے تعلقات کس قدر گہرے تھے، اور اُن کے سب راز مجھے معلوم ہوتے تھے۔ میں آج ان اسرار سے پردہ اٹھاتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ الہام و وحی کی داستان محض ڈھونگ تھی اور میں نے اور وانمود نے افوزہ مقدسہ مل کر تصنیف کی تھی۔ چناں چہ اصل مسودہ پیش کرتا ہوں جس کے کاتب

بیٹی اور روانمود ہیں اور دونوں کی حک و برید کے نشانات موجود ہیں۔
جو کتاب الہامی ہو اس میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت کس طرح لاحق
ہوسکتی ہے۔ یہ کہ کر اس نے اصل مسودہ حاضرین کے سامنے پیش کر دیا۔
یہ ایک ایسا بے پناہ وار تھا جس کا جواب نمانمود اور اس کے رفقا
کے پاس کوئی نہ تھا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعت میں ہل چل
پڑگئی اور یہ گھروندا گر پڑا۔ نمانمود نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر رنگ نہ
جما اور یہ فرقہ حقیر ہوگیا۔ نمانمود نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ میدان
چھوڑ کر عزلت گزیں ہو جائے اور وہ اس جاگیر پر چلا گیا جو ہادی علی
خاں نے اس کے باپ کو دی تھی۔ نمانمود تین سال کی گمنام زندگی کے
بعد فوت ہوا اور اس کا بھائی شاہ فقار سجادہ نشین ہوا۔ شاہ فقار
کو علوم متداولہ میں بہرۂ کافی حاصل تھا۔ اس کے علاوہ وہ زبان آور،
مقرر، خوش اخلاق اور خندہ پیشانی تھا۔ اُسے دربار شاہی میں شرفِ
باریابی حاصل تھا۔ احمد شاہ کے عہد میں نواب جاوید خاں کی سرکار
میں ملازم ہوا اور "الہاماتِ جاوید" کی تصنیف میں عمر صرف کر دی۔
شاہ دید فقار کے سامنے فوت ہوا اور شاہ فقار بھی احمد شاہ کے
عہد میں چل بسا۔ فقار کی زندگی تک اس کے مذہبِ آبائی کے پیرو
اِکّے دُکّے مل جاتے تھے۔ لیکن اس کی وفات کے بعد جو بچے کھچے
نام لیوا باقی تھے انھوں نے دہلی سے ہجرت کی اور میر جعفر کے ننگِ ہند
بیٹے میرن کے پاس مرشد آباد جا پہنچے۔ میرن نے یہ مذہب اختیار کیا۔
قدمِ رسول کی تولیت ان کے سپرد کی اور پانچ صد روپیہ ماہانہ مقرر کر دیا۔
اس خاندان کی چند مستورات ۱۱۹۴ء تک مرشد آباد میں جدید بیگوک

کی منتظر تھیں جو افسوس کہ نمودار نہ ہوا اور میرن کے ساتھ اس فرقے کا خاتمہ ہوگیا۔ (سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۱۴۵)



(۱۶) عمارات

اس ایک سال کی حکومت میں مندرجہ ذیل عمارات محض رفاہِ عام کے لیے تعمیر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سراج الدولہ کس قدر رعایا پرور حاکم تھا اور اگر وہ چندے زندہ رہتا تو لوگوں کو کس قدر فیض پہنچاتا۔

(۱) زرد اور سفید مسجدیں۔

یہ مسجدیں دریا کے کنارے عجب پُر فضا مقامات پر بالمقابل واقع ہیں۔ ایک مسجد نواب شہید نے خود کھڑے ہو کر ایک رات دن میں تعمیر کرائی اور دوسری بعد میں تعمیر ہوئی۔

(۲) مدینہ۔

یہ اس امام باڑے کا نام ہے جس کی تعمیر میں نواب شہید نے خود بہ طور ایک مزدور کے کام کیا بلکہ مٹّی کی پہلی ٹوکری اٹھا کر سنگِ بنیاد رکھا۔ اس عمارت پر لاکھوں روپے صرف ہوئے مگر نواب مغفور نے صرفِ زر میں دریغ نہ کیا۔ جب عمارت مکمل ہوئی تو اسے جواہرات سے مزین کیا جو بعد میں میر قاسم نے اُتار کر فروخت کیے۔ میر جعفر کی اولاد سے کسی کی شادی تھی برات ادھر سے گزری آتش بازی کی کوئی مہتابی اس میں آگری اور امام باڑہ جل گیا ۱۸۴۷ء میں کمپنی کے

ایما پر اس کی مرمت کی گئی جس پر چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اس امام باڑے کے سامنے وہ توپ پڑی ہے جسے "سوز باجی والی" توپ کہتے ہیں جو اس زمانے میں ہندوستان کی سب سے بڑی توپ سمجھی جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ کسی نواب نے تفریحاً اسے چلایا تو کئی اشخاص اس کی آواز سن کر بے ہوش ہو گئے۔

(۳) منصور گنج۔

یہ محلات نواب شہید نے نواب علی وردی خاں کے عہد میں تعمیر کرائے جس کے گرد ایک مصنوعی جھیل ہیرا جھیل کے نام سے بنائی گئی اس گنج میں ایک محل تھا جسے امتیاز محل کہتے تھے۔ یہی وہ محل ہے جسے دیکھ کر کلائیو نے کہا تھا کہ اس میں یورپ کے تین بادشاہ سما سکتے ہیں۔

۴۔ بازار سراج الدولہ

یہاں پہلے سنڈاس تھا بو سے ناک نہ دی جاتی تھی۔ صحت عامہ پر اس کا مہلک اثر پڑتا تھا، اسے ایک خوب صورت بازار میں تبدیل کر دیا۔

(۱۷) شہروں کے نام

مغلیہ حکومت میں اکثر شہروں کے نام بدلے گئے مگر سوا الہ آباد اور کھڑکی اور کوئل کے پرانے نام پھر رواج پا گئے۔

(۱) کھڑکی ۔ اورنگ آباد

(۲) کلوریا - مرشدآباد
(۳) ڈھاکہ - جہاں گیرنگر
(۴) کلکتہ - علی نگر
(۵) بنارس - محمدآباد
(۶) کوئل - علی گڑھ
(۷) پراگ - الہ آباد
(۸) آگرہ - اکبرآباد
(۹) دہلی - شاہ جہاں آباد



(۱۸) موجودہ بنگالے کی نگاہ میں

آج کل نواب شہید کو بنگالی ہندو اور مسلمان کی نگاہ سے دیکھیے اور اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ کلکتے میں سنہ ۱۹۰۵ء کی تحریک سودیشی کے سلسلے میں حُبِ وطن کا جذبہ پیدا کرنے میں جو ڈرامے کیے گئے ان میں بنگالے کے زندۂ جاوید ڈراما نگار گریش چندر گھوش کا ڈراما سراج الدولہ ازبس کامیاب رہا اور اس نواب کو بہترین محبِ وطن حکمراں اور ہندو مسلم اتحاد کا حامی تسلیم کیا گیا اور بنکم چندر چیٹرجی کی ہرزہ سرائی پر پانی پھر گیا۔ یہ ڈراما سنہ ۱۹۱۰ء میں ضبط ہو گیا۔

(INDIAN STALE VAL 2 P. 52)



(۱۹) مرشد آباد کے ادیب

مرشد آباد میں مندرجہ ذیل اساتذہ نے علم و ادب کو ترقی دی:۔
شاہ امین الدین بخشی، اشرف علی فغان، شاہ قدرت اللہ قدرت، فقیر شاہ دردمند، میر باقر حزیں، میر الم خلف الرشید میر درد، جودت مرشد آبادی، خلیق دہلوی، حسرت عظیم آبادی۔

(۲۰) فیض دہلوی

نوٹا مانس فرماتے ہیں "فیض ایک حسین طوائف تھی جو ہندستانی جمال کی خصوصیات کا مجموعہ تھی، اس قدر نازک اندام تھی کہ اس کا وزن بائیس سیر تھا۔ اسے مُرشد آباد آنے کا خرچ ایک لاکھ روپیہ ادا کیا گیا۔ یہ سراج الدولہ کی محبوبہ تھی اگرچہ وہ خود کمال حسین و جمیل تھا مگر فیض نے سراج کے سالے سعید محمد خاں سے تعلق پیدا کر لیا۔ پتا لگا تو نواب نے کہا "تم فاحشہ ہو" فیض نے کہا "یہ تو میرا پیشہ ہے۔ یہ آپ کی ماں کے لیے گالی ہو گی میرے لیے نہیں"۔ اس پر نواب نے اسے ایک کمرے میں بند کر کے دروازے کو تیغا کرا دیا۔ تین مہینے کے بعد کھولا تو فیض کا پنجر پڑا تھا مگر بدبو بالکل نہ تھی۔ میں نے اس کی بہت سی تصویریں انگلستان روانہ کی ہیں"۔

حواشی لکھتے لکھتے ذرا آگے نکل جاتے ہیں تو یہ کہانی ذہن سے اُتر جاتی ہے اور یہ اہتمام لگانے کا فرض یاد آتا ہے اور یوں

چل پڑتے ہیں۔

"مہاراجا موہن لال نے اپنی بے مثل حسین بہن سراج الدولہ کے محل میں داخل کر دی، اس کا وزن بائیس سیر تھا۔ اس نے نواب کے سالے سے آشنائی کی۔ پتا لگا تو نواب نے کہا "تم فاحشہ ہو" اس نے کہا "ہمیشہ سے ہوں ماں کو کہتے تو گالی ہوتی۔ اسے کمرے میں بند کر کے ہلاک کیا گیا۔ (حواشی نوٹامانس)

مسٹر بنکم چندر چیٹرجی (رائے بہادر؟) اس زمانے کے مشہور ناول نگار ہیں۔ جب "ودیا سندر" قسم کے فحش ڈرامے بنگالی ادب پر چھائے تھے اور جہاں تک ان کے ناول "سن گریش" کا تعلق ہے، انھوں نے اپنے عہد کے رنگ سے کام لیتے ہوے اس ناول کو سنڈاس بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ وہ واحد ہندستانی ہیں جنھوں نے نوٹامانس کے ترجمے سیرالمتاخرین کی تعریف کے پُل باندھ دیے۔ کیوں؟

انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے جنھوں نے رائے بہادر بنایا۔ آپ اپنے استاد سے گز بھر آگے بڑھ کر یہ شاخ شانہ پیدا کرتے ہیں:-

"موہن لال کی بہن محلات میں جا کر مسلمان ہو گئی، اس کا نام لطیف النسا بیگم رکھا گیا بہ وجہ غربت کے موہن لال نے اسے محل میں برتن صاف کرنے پر ملازم رکھوایا تھا۔ وہاں اس کی آشنائی سراج الدولہ سے ہو گئی اور آخر ان کا بیاہ ہو گیا اور سراج الدولہ نے اسے ایک کمرے میں بند کر کے مار ڈالا" اب

ان جھوٹوں کے پاؤں کی لغزشیں دیکھیے۔ اگر اس بہتان میں ذرا بھی جان ہوتی اگر یہ بات زبان زد عوام ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ طبا طبائی اس واقعے کے بیان کرنے سے گریز کرتے۔ لیکن انھوں نے اس کا اشارہ تک نہیں کیا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض نوٹا مانس کے دماغ کی اختراع ہے۔

پھر نوٹا مانس کی قلابازی دیکھیے کہ ایک ہی بات فیضی اور پھر ہمشیرہ مہاراجا موہن لال سے منسوب کرتے ہیں۔ سچ ہے جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

چیٹرجی کی ایمان فروشی دیکھیے کہ طبا طبائی سے لے کر مؤلف مدار تک متفق ہیں کہ لطیف النسا بیگم میرزا ایرج خاں پسر نواب مصطفیٰ خاں وزیر اعظم اعظم شاہ کی بیٹی تھی اور اس کی شادی نواب علی وردی خاں کے ہاتھوں بڑی دھوم سے ہوئی (مؤلف مدار ص ۱۹۷)

یہ بھی مسلّم ہے کہ وہ اس کے مرشد آباد چھوڑنے کے وقت نواب شہید کے ہم راہ تھی اور شہادت سے تیس سال بعد فوت ہوئی اور منصور گنج میں نواب شہید کے پائنتی آسودہ ہے۔ میرے کہنے کی کیا ضرورت ہے صاف ظاہر ہے کہ چیٹرجی ایک بے باک کذاب ہے اور انگلستان میں جس طوائف کی تصویر کی مانگ تھی اس کا نام فیضی نہ تھا بلکہ روشن آبادی تھا۔

(۲۱) قاسم علی خاں

میر جعفر کا سالا تھا۔ سراج الدولہ نے اسے رنگ پور کا فوج دار

مقرر کیا تھا۔ نواب شہید کی رحلت کے بعد یہ بیگمات کی خدمت کرتا رہا دوسرے اس کے محل میں ایک کروڑ رُپیہ نقد موجود تھا اس لیے اسے قتل کیا۔ رُپیہ میران نے لیا اور اس کی دو لڑکیوں کی عصمت دری کی۔ (نوٹا مانس)

(۲۲) مسند

مسند بہت سی چیزوں کا نام ہی۔ ایک چھ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا قالین بچھاتے ہیں، اس کے اوپر ایک انچ موٹی گدی بچھاتے ہیں اس کے اوپر کمخواب ڈالتے ہیں، پسِ پشت ایک بہت بڑا گاؤ تکیہ ہوتا ہی اور دونوں جانب چھوٹے تکیے رکھتے ہیں۔ گدی نشین کے سامنے ایک تلوار رکھتے ہیں، بائیں جانب خنجر یا کٹاری ہوتی ہی اور اس کے قریب ریشمین رومال میں لپٹا ہوا ایک چاقو ہوتا ہی جو خطوں کے لفافے کھولنے کے کام آتا ہی۔ ایک طرف ایک پان دان میں گلوریاں رکھی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہو تو اسے مسند کہتے ہیں۔ (نوٹا مانس)

(۲۳) نقّارہ

ماہی مراتب کی طرح نقّارہ بھی ایک نشان اعزازی ہی جو بڑے بڑے امرا کو دیا جاتا ہی۔ یہ کوئی واحد نقّارہ نہیں ہوتا بلکہ ایک

آرکیسٹرا ہوتا ہے جس میں تین لوہے کے نقارے، تین ڈھول، تین تاشے، تین کرناہ دو جھانج، تین ارناہ شامل ہوتے ہیں۔ یہ سب ساز بہ یک وقت قلعے کے دروازے، نوبت خانہ محل کے دروازے پر یا تری پولیا پر بجائے جاتے ہیں۔ تری پولیا اس عمارت کو کہتے ہیں جو اسی غرض کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ موسیقی جوش انگیز اور خوش گوار ہوتی ہے۔ (نوٹا مانس)

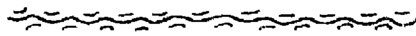
(۴۳) خواب آور تدبیریں

امرا کو سلانے کے لیے مٹھی، چپی، دبانے، پاؤں سہلانے اور کہانیاں سنانے سے کام لیا جاتا ہے۔ چپی میں پاؤں سے لے کر کندھوں تک سب اعضا کو دبایا جاتا ہے۔ چپی کرنے والے کی انگلیاں لمبی اور جلد رنگ دار حنا بند ہوتی ہے۔ دبانے میں تمام اعضا کو ہتھیلی سے پیٹا جاتا ہے۔ بڑے گھرانوں میں یہ دونوں کام دو شخص بجالاتے ہیں۔ داستان گو کہانیاں سناتا ہے محل سرا میں یہ فرائض عورتیں ادا کرتی ہیں۔ یہ عورتیں حسین، حاضر جواب اور زبان داں ہوتی ہیں اور معقول مشاہرے پاتی ہیں۔ ان کا لباس پُر تکلف ہوتا ہے۔ میں نے ایسی بہت سی کہانیاں جمع کی تھیں لیکن ضائع ہوگئیں۔

(نوٹا مانس)

(۲۵) خواجہ واجد

ایک کشمیری مہاجر تھا، دیکھتے دیکھتے بڑا بارسوخ سوداگر بن گیا۔ بالکل نوابانہ زندگی تھی۔ اس کے پاس سترہ ہاتھی، پچاس گھوڑے، ایک سو پچیس عورتیں، پندرہ چوب دار اور دوسو دیگر ملازم تھے۔ ان کے علاوہ اس کے پاس پانچ جہاز اور دو ہزار کشتیاں تھیں اس کے محل کا خرچ دو ہزار رُپے روزانہ تھا۔ ایک دفعہ نواب علی وردی کے دربار میں آیا تو پندرہ لاکھ رُپے نذر پیش کی (دیکھیے اس وقت کے بنگال کی دولت وثروت) (نوٹا بانس)



(۲۶) سینوڑا

مُرشد آباد میں روشن گنج کے پاس اس مکان کے کھنڈر ہیں جسے نسینوڑا گھر کہتے ہیں۔ یہ سرکاری کشتیوں کا دفتر تھا اور ایک قسم کی بندرگاہ تھی۔ یہاں سے کشتیاں لنگر اٹھاتی اور ڈالتی تھیں۔ ہر قسم کی ہزاروں کشتیاں ہوتی تھیں جن کے نام رام سندر، شام سندر، بھولی والی، بجرا، چپی، پرندہ، گھوڑ دوڑ، ہاتھی چہرہ وغیرہ تھے۔ چپی اور پرندہ بہت تیز رَو تھے۔ ملاحوں کے بازوؤں پر نقرئی بازوبند اور ان کے ساتھ گھونگرو بندھے ہوتے تھے، ملاح گت کے مطابق چپو چلاکر موسیقی پیدا کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شعلہ رقاصہ رقص کر رہی ہو۔ ان کشتیوں کے سلسلے میں ایک میلا لگتا ہر

جیسے بیڑے کا میلا کہتے ہیں۔ یہ سراج الدولہ نے ہندو مسلم اتحاد کو مستحکم کرنے کے لیے ایجاد کیا تھا اور اس میں ہندو مسلم سب حصّہ لیتے تھے۔ اس میلے کو خواجہ خضر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کشتیوں میں طرح طرح کے کھانے تیار ہوتے ہیں، آپس میں حصّے بخرے تقسیم ہوتے ہیں۔ ناچ گانا ہوتا ہے۔ رات کو چراغاں ایک کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ تخت رواں دریا میں ادھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ یہ میلہ اب بھی سال میں ایک دفعہ بھادوں کے مہینے کی پہلی جمعرات کو ہوتا ہے اور لوگوں کو سراج الدولہ کی یاد دلاتا ہے۔ مگر وہ بات کہاں۔

(موزمدار صفحہ ۲۸۳)

(۴۷) نظامِ حکومت

سلطنتِ مُغلیہ میں جو نظامِ حکومت قائم تھا، بنگالے میں بھی اس کی پیروی ہوتی رہی۔ اس نظام کے رُو سے سراج الدولہ کے زمانے تک مغلیہ سلطنت کی جغرافیائی اور سیاسی تقسیم حسب ذیل تھی۔

سلطنت اٹھارہ حصوں میں تقسیم تھی۔ ہر حصّے کو صوبہ کہتے تھے۔ یہ صوبے الہ آباد، آگرہ، اودھ، اجمیر، احمد آباد، بہار، بنگالہ، لاہور، ملتان، مالوہ، برار، خاندیش، احمد نگر، کشمیر، سندھ اور دکن، کہلاتے تھے۔ ہر ایک صوبے کے اضلاع "سرکار" کہلاتے تھے جو پرگنوں میں بٹ جاتے تھے۔ پرگنے کا دوسرا نام محال تھا اور اس کا حاکم محال دار کہلاتا تھا (آج کل ہم سرکار کو ضلع اور پرگنے کو تحصیل کا مترادف

سمجھ سکتے ہیں) وہ اراضی جو براہ راست بادشاہ کی ذاتی ملکیت ہوتی تھی، خالصہ کہلاتی تھی جسے چکلوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ چکلے کا مہتمم چکلہ دار کہلاتا تھا اس اراضی کا نام جو امرا کو حقِ خدمت کے طور پر دی جاتی تھی، جاگیر تھا اور جو علما یا صوفیا کو پرورش کے لیے دی جاتی، وقف کہتے تھے۔ یہ جاگیریں اکثر ایک سے دوسرے ہاتھ میں آتی جاتی رہتی تھیں اراضی کا ایک اور قابض زمین دار تھا جسے ایک چھوٹا سا راجا یا نواب سمجھ لیجیے جو کسی سند یا فرمان کے ذریعے موروثی مالک تسلیم کیا جاتا تھا۔ زمین داروں کو صرف دربار میں حاضر رہنا پڑتا اور جانشینی کے لیے حکم حاصل کرنا ہوتا تھا اور گاہے گاہے نذرانہ دینا لازم ہوتا تھا مگر انھیں اپنا سکہ جاری کرنے کی اجازت نہ تھی۔ سرکار کا حاکم فوج دار کہلاتا جو اس حصے کا انتظام عمل گزار، قاضی اور کوتوال کی مدد سے کرتا تھا اور امن قائم رکھتا تھا۔

صوبے کا حاکم صوبے دار (یا صوبہ) کہلاتا تھا جسے آئندہ ناظم اور نظام بھی کہنے لگے۔ چناں چہ دکن کا صوبے دار نظام اور بنگال کا ناظم کہلانے لگا۔ صوبے دار کے بعد صوبے کا بڑا افسر دیوان ہوتا تھا ناظم اور دیوان حکومت کے کام باہم تقسیم کر لیتے تھے۔ ان کے بعد سپہ سالار کا عہدہ تھا جو حفظِ امن اور انسداد جرائم کا ذمہ دار تھا۔ دیوان کا اہم فرض مالیے کی وصولی کی نگہداشت تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے سپرد تصفیہ مقدمات اور صیغہ صدر کی نگرانی تھی دیوان اور سپہ سالار کے متعدد مددگار ہوتے تھے جن میں سے ایک بخشی مختلف فرائض ادا کرتا تھا اور فوج کا اہتمام اس کے ہاتھ

ہوتا تھا۔ دوسرا مددگار صدر تھا جو مذہبی امور، خیرات اور عطیات کا نگراں تھا۔ تیسرا قاضی جو ضلع کے اہم مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا۔ چوتھا کوتوال جو پولیس اور شہری فرائض بجالاتا تھا۔ پانچواں میر البحر جو محصول چونگی، کرایہ کشتی، سینوڑا کی حفاظت کا بندوبست کرتا تھا۔ چھٹا واقعہ نویس جو ہر واقعے کو ضبط تحریر میں لاتا۔ بسا اوقات نوجوان شہزادوں یا امرا کے لڑکوں کو بہ غرضِ تربیت صوبے دار مقرر کیا جاتا تھا۔ اور اُن کے ساتھ ایک اتالیق لگایا جاتا تھا جو دراصل صوبے دار ہوتا تھا۔ بعض دفعہ صوبے دار کے ساتھ ایک مجلسِ شوریٰ مقرر کی جاتی تھی۔ بادشاہ کے حکم سے دیوان وزیر اعظم کے حکم سے صدر اور بخشی بادشاہی فرمان سے مقرر ہوتے تھے۔ صوبے دار کے لیے کسی خاص عمر یا میعاد کا تعین نہ ہوتا تھا۔ بہ وقت تعیناتی صوبے دار کو ایک تحریری دستور العمل دیا جاتا تھا جس میں اس کے اختیارات کی تصریح ہوتی تھی۔ انصاف وعدل بھی اس کے فرائض میں داخل تھا مگر وہ کسی کو سزائے موت نہ دے سکتا تھا۔ زراعت اور صنعت کو ترقی دینا، مذہبی آزادی کو قائم رکھنا، فوج کو ہر وقت تیار رکھنا اس کے لیے لازم تھا۔ اسے تاکید کی جاتی تھی کہ وہ بے اعتدالی اور بدعنوانی سے بچ کر چلے۔ ماتحتوں پر اسے پورا اختیار تھا اور زمین دار اس کے حکم کے پابند تھے۔ اس کے علاوہ دیوان کے دیگر فرائض بھی تھے۔ مالیے کے تعین اور تحصیل کے باور اخزانے کی نگہ داشت بھی اُس کے ذمے تھی۔ وہی کسانوں میں تقاوی تقسیم کرتا تھا اکثر اوقات اسے محاسب کے فرائض ادا کرنے پڑتے تھے۔ جملہ صیغوں کے اخراجات

وہی ادا کرتا تھا۔ اس کا دیوان خانہ (دفتر) اور محافظ خانہ بہت بڑے ہوتے تھے اور ان میں سیکڑوں منشی اور متصدی کام کرتے تھے۔ دیوان اور صوبے دار ایک دوسرے کے فرائض میں دخل دینے کے مجاز نہ تھے مگر ایک دوسرے کی کارکردگی سے آگاہ رہتے تھے۔

صدر، میر عدل اور قاضی کے فرائض بالعموم ایک ہی شخص کے تفویض ہوتے تھے۔ وقائع نویس بخشی کے ماتحت ہوتے تھے اس محکمے میں صوبے دار سے لے کر محال دار تک کے اعمال کی رپورٹ درج ہوتی تھی جو براہ راست بادشاہ کے حضور میں گزارش کی جاتی تھی۔ خفیہ اطلاعات کا کام وقائع نویس سے الگ تھا۔ یہ کام ایک اور عہدے دار جسے سوانح نویس، خفیہ نویس یا پرچہ نویس کہتے تھے سرانجام دیتا تھا۔ وہ مُلک کے جملہ چھوٹے موٹے حالات شاہی کانوں تک پہنچا دیتے تھے۔ اس محکمے کی اہمیت اور دہشت کا یہ عالم تھا کہ صوبے دار اور دیوان بھی ان سے کانپتے تھے۔ اعلا عہدوں کے لیے جنگی قابلیت لازمی تھی۔ باقی سب کچھ بادشاہ کی پسند پر منحصر تھا۔

پرگنے میں شق دار، عامل اور قانون گو تین بڑے افسر ہوتے تھے جن کے ماتحت فوطے دار (خزانچی)، منشی، پٹواری اور چپراسی ہوتے تھے۔ شق دار کے فرائض وہی تھے جو سرکار میں فوج دار اور کوتوال کے تھے۔ ہر پرگنے میں ایک قاضی بھی ہوا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ بندرگاہ، سرحد، قلعہ اور تھانے تھے جن کا انتظام متصدیوں کے سپرد ہوتا تھا۔ مگر سرحد اور قلعہ فوج دار کے ماتحت رہتا تھا چکلوں میں بھی فوج دار، امین اور کروڑی انتظام کرتے تھے۔ شہروں

ہیں سب سے زیادہ اہم اور گوناگوں فرائض کوتوال کے تھے اور حیرت ہوتی ہو کہ ایک شخص اس بار عظیم کو کس طرح سنبھالتا تھا۔ اس کے فرائض کی مختصر فہرست یہ ہو:۔

(۱) شہر کی حفاظت جس کے لیے اسے محافظ رکھنے پڑتے تھے۔

(۲) منڈی کے بھاؤ کی نگرانی۔ ہر چیز کا نرخ مقرر کرنا۔

(۳) لاوارث مال کا مناسب تصفیہ۔

(۴) لوگوں کے اخلاق کی نگرانی اور جرائم کا انسداد۔

(۵) بُرائیوں کو روکنا مثلاً ستی نہ ہونے دینا۔

(۶) قبرستان، خانقاہ اور ذبح خانوں کا انتظام۔

(۷) کوتوال ہر وقت فریادی کو ملے۔

(۸) اسے معلوم ہو کہ کون شخص شہر سے باہر گیا ہو اور کون اندر آیا ہو۔

(۹) شہر کے گلی کوچے صاف ستھرے رہیں۔

(۱۰) دُکان دار گاہکوں کو دھوکا نہ دیں۔

(۱۱) جہاں تک ہو سکے شراب خوری، قماربازی اور زناکاری کا سدباب کرے۔ کوتوال کو اختیار تھا کہ ان فرائض کی بجاآوری کے لیے جس قدر ملازموں کی ضرورت ہو نوکر رکھ لے۔

MUOHUL POLITY BY DR: SARAN



(۲۸) میراں کی اولاد

میراں ایک چھ سالہ بچہ چھوڑ مرا تھا لیکن وہ محروم الارث کیا گیا اور نوابی اس کے سوتیلے بھائی نجم الدولہ کی اولاد میں چلی گئی اور اب تک ہے۔ میرن کی اولاد تعیر گم نامی میں ہے۔ (موزمدار صفحہ ۲۹۵)

(۲۹) پلاسی

دریائے بھاگیرتی کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ یہاں سے مرشد آباد کے جنوب کی طرف ۳۵ میل پر ہے۔ آموں کا باغ جہاں انگریزوں نے قیام کیا تھا آٹھ سو گز لمبا اور تین سو گز چوڑا تھا جس کے گرد ایک خندق اور کچی چار دیواری تھی۔ کچھ عرصہ ہوا کہ اس کے باقی ماندہ درخت گر گئے ان کی لکڑی کے چمچے وغیرہ تبرک کے طور پر بڑی قیمت پر خریدے گئے۔ اس جھنڈ کے پیچھے نواب کا شکارخانہ تھا جس کے گرد پکی چار دیواری تھی۔ میدانِ جنگ کا بہت سا حصہ دریا برد ہو چکا ہے۔ یہاں ایک یادگار ہے جس پر حسب ذیل کتبہ کندہ ہے:-

حکومتِ بنگال "پلاسی" نے ۱۸۸۳ء میں تعمیر کیا

سراج الدولہ کی فوج دلب رام اور میر جعفر کی کمان میں پلاسی میں مقیم تھی۔ کلائیو اور کلکتہ کونسل نے اسے نشانِ عداوت خیال کیا۔ کلائیو کی استدعا پر نواب نے فوج یہاں سے ہٹالی۔ ۱۲ جون ۱۷۵۷ء

کو کلائیو نے چندر نگر سے کوچ کیا اور نواب کے آدمیوں کو جو اس کے کیمپ میں تھے لکھ دیا کہ نواب کو اطلاع دے دو کہ وہ مرشد آباد پر حملہ کر رہا ہے۔ اسی دن واٹس قاسم بازار سے نکل کر مع اپنے ماتحتوں کے بہ خیریت کلائیو کے کیمپ میں پہنچ گیا۔ سراج الدولہ کو خبر ہوئی تو اس نے اپنی فوج کو پلاسی جانے کا حکم دیا۔ ۱۲ جون کو نواب کی فوج پلاسی میں پہنچ گئی۔ ۱۶ جون کو کلائیو نے پاٹلی سے دو سو فرنگی اور پانسو تلنگوں (ہندستانی سپاہیوں) کی ایک جماعت میجر آئر کوٹ کی کمان میں روانہ کی کہ وہ کٹوا کے قلعے پر قبضہ کر لے جہاں نواب نے غلّہ اور سامانِ حرب کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ کلائیو شام کو مع اپنی فوج کے وہاں پہنچ گیا۔ اب اسے خیال آیا کہ نواب کی بے پناہ فوج کا مقابلہ کرنا قرینِ عقل نہ ہوگا اس نے ایک جنگی کونسل طلب کی اور اس کے سامنے یہ سوال رکھا گیا کہ آیا انگریزی فوج قاسم بازار پہنچ جائے اور بہر صورت نواب پر حملہ کر دے۔ کوٹ نے فوری حملے کا مشورہ دیا کلائیو اس کے خلاف تھا، مجلس کی اکثریت لڑائی کرنے کے خلاف تھی۔ کلائیو علاحدہ بیٹھ کر غور کرنے لگا۔ تھکن کے مارے وہ سو گیا ایک گھنٹے بعد جاگا تو لڑائی پر آمادہ تھا۔ فوج کو فوراً دریا عبور کرنے حکم دیا گیا اس کی فوج میں نو سو پچاس فرنگی پیادے ایک سو فرنگی گولہ انداز پچاس فرنگی ملّاح اور دو ہزار سے زیادہ ہندستانی سپاہی تھے۔ توپ خانے میں چھ چھوٹی اور دو بڑی توپیں تھیں۔ صبح ہوئی تو فوج نے ان کشتیوں میں دریا عبور کرنا شروع کیا جو وہ چندر نگر سے اپنے ہمراہ لائے تھے۔ دس گھنٹے میں

وہ بلاکسی مزاحمت کے دریا عبور کر گئے۔ اس جگہ سے پلاسی پندرہ میل جانب شمال تھی چھو گھنٹے میں وہ پلاسی پہنچ گئے۔ ۲۲ر جون ۱۷۵۷ء کی قابل یادگار صبح کو انھوں نے آم کے جھنڈ میں قیام کیا۔ یہاں سے نواب کا کیمپ ایک میل پر تھا جہاں سے اس کے کیمپ کے جنگی سازوں کے بجنے کی آواز آرہی تھی۔ نواب کی فوج میں ۳۵ ہزار پیادے پندرہ سو سوار سان فریز کے تحت پچاس فرانسیسی تھے اور وہ خندق کے پار پڑا جمائے تھے۔ صبح ہوئی تو نواب کی فوج میر مدن، موہن لال، دلورام، یار لطف خاں اور میر جعفر کی قیادت میں صف بند ہوئی۔

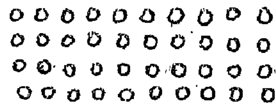
کلایو نواب کے شکار خانے سے اس کی فوج کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا جس پر انھوں نے گزشتہ شب قبضہ کرلیا تھا۔ لڑائی شروع ہوگئی اور تین گھنٹے تک بلاکسی اثر کے جاری رہی جھنڈ کی کچی دیوار انگریزوں کے بہت کام آئی۔ اب ایک غیر متوقع حادثہ ہوا جس نے نواب کے غیر محفوظ سامان حرب کو تباہ کردیا۔ بارش پورے ایک گھنٹے تک ہوتی رہی جس کا کوئی اثر انگریزوں کی باروُد پر نہ پڑا کہ وہ ڈھانپا ہوا تھا۔ مگر نواب کی باروُد ناقابل استعمال ہوگئی۔ جب لڑائی پھر شروع ہوئی تو نواب کا جرنیل میر مدن زخمی ہوگیا اور تھوڑی دیر کے بعد چل بسا۔ نواب دل برداشتہ ہوگیا اور دو ہزار سواروں کے ہمراہ اونٹنی پر سوار ہوکر مرشد آباد چلا گیا اور اپنے جرنیلوں کو لڑائی جاری رکھنے کا حکم دے گیا۔

نواب کے جانے کے بعد اس کے جرنیلوں نے آتش فشانی
بند کر دی مگر فریز فرانسیسی نے اپنا کام جاری رکھا لیکن جب
اس کے ہم راہی الگ ہو گئے تو وہ بھی چلا گیا۔ ۲۳ جون کو
۵ بجے شام فتح مکمل ہو گئی۔ اپنی فوج کی شکست کی خبر نواب کو
مرشد آباد میں ملی اور وہ ان فرانسیسیوں کے ساتھ شامل ہونے
کے لیے چل پڑا جو اس کی امداد کے لیے پٹنہ سے آ رہے تھے۔
(مجمودار ص ۲۴۴)



نقشہ جنگِ پلاسی

نواب کا خندقی کیمپ



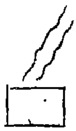
خندق

موہن لال — میر مدن — فرانسیسی







دریائے بھاگیرتھی

آم کا جھنڈ

موضع پلاسی

جنگ پلاسی کا روزنامچہ

۲۳ جون ۱۷۵۷ء:-

۱ بجے صبح - انگریز پلاسی پہنچے -

۶ بجے " - نواب کی فوجیں خندقوں سے باہر نکلیں -

۸ " " - نواب کے توپ خانے نے پہلا گولہ پھینکا

۸½ " " - انگریزی فوج پس پا ہو کر آم کے جھنڈ میں چلی گئی اور ان کے دس انگریز سپاہی اور بیس تلنگے مارے گئے -

۱۱ " " - گولہ باری دن بھر جاری رکھنے کے بارے میں کلایو نے مشورہ کیا اور رات کو نواب کی فوج پر حملہ آور ہوا -

۱۲ بجے دوپہر - بڑی بھاری بارش نے نواب کا بارود خراب کر دیا - مگر انگریزوں کے بارود پر موم جامہ پڑا تھا اس لیے بچ گیا - نواب کو اطلاع ملی کہ میر مدن کو مہلک زخم لگا ہے -

۱ بجے شام - نواب نے میر جعفر کو بلایا اور اسے لڑائی میں حصّہ لینے کے لیے کہا - اور اپنی پگڑی اس کے پاؤں پر ڈال کر کہا کہ اس پگڑی کی لاج رکھ لو -

۱½ بجے شام - دلب رام نے نواب کو دارالخلافہ کو چلے جانے کا مشورہ دیا -

۲ بجے شام - نواب نے فوج کو خندقوں میں چلے جانے کا حکم دیا -

۲½ بجے شام - نواب کے توپ خانے نے گولہ باری بند کی مگر سن فرے فریزر (SNIFRAY FRUZER) فرانسیسی اپنے مورچے پر تالاب کے نزدیک ڈٹا رہا -

میجر کلپاٹرک (KILPATRIEK) بغیر کلائیو کی اجازت کے تالاب کی طرف بڑھا۔ دو توپیں اس کے ساتھ تھیں۔
کلائیو جو شکار خانے میں تھک کر سو گیا تھا اسے خبر ملی تو وہ دوڑ کر گیا اور کلپاٹرک کو سرزنش کی۔ اسے واپس بھیجا گیا کہ تمام فوج کو حملہ کرنے کا حکم دے۔
میر جعفر کی محبانہ افواج کو غلطی سے دشمن کی فوج سمجھا گیا اور کلائیو نے کچھ پلٹن اس کے مقابلے پر مامور کی، حالاں کہ وہ انگریزی فوج سے مل جانے کو آرہے تھے۔

میر مدن کی وفات، اس کے دیگر جرنیلوں کی سستی اور انگریزی فوج کے کیمپ پر حملہ آور ہونے کے خیال نے اسے پژمردہ کر دیا اور وہ ایک تیز رفتار سانڈنی پر سوار ہو کر دو ہزار سواروں کے ساتھ دارالخلافہ کو چلا گیا جس سے اس کی فوج میں ہراسانی اور پریشانی پھیل گئی اور فوج منتشر ہو کر بھاگ گئی۔
۵ بجے شام ۔ انگریز نواب کے سابقہ کیمپ میں داخل ہوئے۔ عین اس وقت جب نواب میر جعفر کے ہمراہ فورٹ ولیم میں داخل ہوا تھا۔
۶ بجے شام ۔ کلائیو نے میجر کوٹ کو ہراول بھیجا کہ دیکھے کہیں نواب کی فوج پھر جمع تو نہیں ہو رہی۔ اور میر جعفر کو پیغام بھیجا کہ وہ کل صبح اسے داد پور میں ملے۔
۸ بجے شام ۔ انگریزی فوج داد پور پہنچی۔
۱۲ بجے شب ۔ سراج الدولہ مرشد آباد پہنچا۔

۲۴ جون ۱۷۵۷ء

۵ بجے صبح ۔ کلائیو نے سک رافٹن (SCRAFTIN) اور عمر بیگ کو

دیا کہ وہ میر جعفر کو لے آئیں۔

جب میر جعفر پہنچا تو کلائیو نے بطور صوبے دار بنگالہ، بہار اور اڑیسہ اسے سلامی دی۔

۷ بجے شام۔ میر جعفر مرشد آباد پہنچا۔

۱۰ بجے شام۔ سراج الدولہ دارالخلافہ سے چلا گیا۔

۱۲ بجے شب۔ میر جعفر کو سراج الدولہ کی ہجرت کی خبر ملی اور اسے گرفتار کرنے کے لیے آدمی دوڑ آئے۔

۲۵ جون:۔

۱۱ بجے صبح۔ مہاراجا موہن لال اور دیگر امرا گرفتار ہوئے۔

۱۲ بجے صبح۔ انگریزی فوج مادا پور میں وارد ہوئی۔

۳ بجے شام۔ واٹس (WATTS) اور والش (WALSH) کو کلائیو نے بھیجا کہ میر جعفر اور ولب رام سے ملیں۔

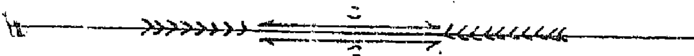
۲۶ جون:۔ واٹس اور والش جگت سیٹھ کے مکان پر میر جعفر اور ولب رام سے ملے۔

۲۷ جون:۔ کلائیو نے قاسم بازار میں قیام کیا کیوں کہ جگت سیٹھ نے بہ ذریعہ رنجیت رائے اسے اطلاع دی تھی کہ مرشد آباد میں سازش ہو رہی ہے کہ جونہی وہ دارالخلافہ میں پہنچے اسے قتل کر دیا جائے۔

۲۹ جون:۔

۸ بجے صبح۔ کلائیو دو سو انگریز اور تین سو سپاہیوں کے ساتھ مرشد آباد میں داخل ہوا۔ کلائیو نے میر جعفر کو مسندِ مرشد آباد پر بٹھایا۔

۲ جولائی:۔ سراج الدولہ گرفتار ہوا۔ (موزملار ص ۲۴۴)



ہماری زبان

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے؛
چندہ سالانہ ایک رُپیہ فی پرچہ ایک آنہ

اُردو

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے

اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔ تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اُردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں، اُن پر تبصرہ اس رسالے کی ایک خصوصیت ہے۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات رُپے۔ سکۂ انگریزی (آٹھ رُپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک رُپیہ بارہ آنے (دو رُپے سکۂ عثمانیہ)

رسالۂ سائنس

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

(ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے)
اس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول کیا جائے۔ دُنیا میں سائنس کے متعلق جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں یا بحثیں یا ایجادیں ہو رہی ہیں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہلِ وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں، قیمت سالانہ صرف پانچ رُپے سکۂ انگریزی (چھ رُپے سکۂ عثمانیہ)
خط و کتابت کا پتا: معتمد مجلس ادارت رسالۂ سائنس۔ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی

